اُردو شاعری میں

افغانوں کی گلکاریاں

پروفیسر خان محمد عاطف

معصومہ اینڈ کمپنی

اردو شاعری میں افغانوں کی گل کاریاں

HaSnain Sialvi

اردو شاعری
میں
افغانوں کی گلکاریاں

مصنّف

پروفیسر خان محمد عاطف

معصومہ اینڈ کمپنی، دہلی

نام کتاب : اردو شاعری میں افغانوں کی گل کاریاں

مصنف وناشر : پروفیسر خان محمد عاطف (ملیح آبادی)

تعداد : 500

غلاف : سلطان چودھری

طابع وناشر : معصومہ اینڈ کمپنی

1590، روڈگران چوک، لال کنواں، دہلی۔۶، فون: 9711534371

Urdu Shairi main Afghanon ki Gulkariyan

by

Prof. Khan Mohammad Atif

First Edition :2010

Price: Rs.600/-

Library Edition: Rs. 750/-

Printers & Publishers

Masooma & Company

1590, Rodgran Chowk, Lal Kuan, Delhi-110006
Cell: 9711534571

Distributors

M.R. Publications

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

Communication Address:

3871, 4th Floor, Kalan Mahal , Daryaganj, New Delhi-110002

Showroom

1645, Patuadi House, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 9810784549, 9211532140
E-mail abdus26@hotmail.com

انتساب

غیور ملّت افغان

کے نام

جس کے علمی وادبی شاہکار

عربی، فارسی، اردو اور پشتو میں

اپنی آبؔ وتاب کے ساتھ

تشنگانِ علم کی پیاس

بجھاتے رہتے

ہیں

نام : پروفیسر خان محمد عاطف

پیدائش : ۱۹۴۲ء

تعلیم : ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی (فارسی)

۱۹۷۴ میں شعبۂ فارسی میں تقرر

لکچرار، ریڈر، اور پروفیسر

۱۹۷۷ء میں بہرائچ سے ممبر یو پی اسمبلی

کتابیں : ۱۔ تعارف زبان فارسی تازہ (جدید)

۲۔ تاریخ زبان وادبیات فارسی

۳۔ فارسی شاعری میں طنز ومزاح

۴۔ پٹھان شاعرات کا تذکرہ

۵۔ مختصر تاریخ ادبیات فارسی

(ترجمہ انگریزی لیوی)

مضامین : فارسی ادبیات، اردو شعر وادب، اور مذہبی وسیاسی موضوعات پر سو سے زیادہ۔

زیر نظر کتاب : اردو شاعری میں افغانوں کی گل کاریاں

زیر طباعت : مکتبہائے ادبی یعنی فارسی کے ادبی اسکول

نظام الملک آصف جاہ بانی سلطنت نظام

حیات اور شاعری

اور اب : قائد خاکسار تحریک الہندی

HaSnain Sialvi

فہرست

تذکرہ شعرائے اردو "گل رعنا"

یادگار شعراء ۲۱۴

تذکرہ فرخ بخش ۲۴۳

خم کدۂ سخن ۲۴۵

شمیم سخن ۲۸۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

HaSnain Sialvi

پیش لفظ

ادبیات سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم شاعر کی زندگی، رسم و رواج اور اُس دور کے حالات سے باخبر ہوں۔ شاعری جو ادبیات کی ایک اہم و ممتاز صنف ہے اس کے لیے اُن مسائل پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے، اِس لیے کہ دُنیائے شاعری کی ہر بات نرالی ہوتی ہے۔ اُردو دُنیا کا اندازِ گفتگو الگ، شاعروں کی زندگی، اُن کی زبان، اُن کا لہجہ اور ان کے فکر و خیال کی دُنیا اور ان کے طریقے جدا، مشاغل عجیب، لیکن ان سب کے باوجود قاری کو اُن کے فکر و خیال سے خود کو مانوس کرنا پڑتا ہے۔ اُن کے فکری عجائب خانہ کی جب ہم سیر کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ واقعی یہ کسی اور ہی دنیا کے لوگ ہیں۔ ان کی باریک بینی فطرت کے بے شمار سربستہ رازوں کو ایسے اُجاگر کرتی ہے کہ دنیائے سائنس کے آلات بھی مات کھا جاتے ہیں، سرجری کے ماہرین اور امراضِ قلب میں تخصص رکھنے والے دانتوں میں اُنگلیاں داب لیتے ہیں، اُن کے ایک ایک لفظ سے انسانوں کی زندگی بدل جاتی ہے، اطوار بدل جاتے ہیں، لیکن اس کے لیے شاعر کو ڈوبنا پڑتا ہے، فطرت سے قریب ہونا پڑتا ہے۔

ایسے ہی شاعر زندگی میں تبدیلی لاتے ہیں، معاشرہ کو سنوارتے ہیں اور قاری یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دِل میں ہے۔ ایسے شاعروں کے کلام میں فطری جذبات کا اظہار ہوتا ہے جو دل پر اثر انداز ہوتے ہیں، لطیف احساسات میں ایک عجیب چاشنی ہوتی ہے، الفاظ میں جوش کا ہیجان انگیز طوفان ہوتا ہے۔ اس کی باتیں، اُس کے الفاظ، اُس کے اثرات سب سے نُمایاں اور الگ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نشہ نہیں کہ انسان کے ہوش وحواس گم ہو جائیں بلکہ یہ وہ خوشگوار ترنم ہوتا ہے جس سے لطف اندوزی کے ساتھ ہی دیدہ وری بھی نصیب ہوتی ہے۔

شاعر کے رمز و کنایہ، ابرو کے اشارہ اور الفاظ کے تراره سے ہم اس کی دلی کیفیت کو جان لیتے ہیں اور ایک اجنبی کی بات کو ایسے سمجھ لیتے ہیں جیسے وہ خود ہمارے اپنے دل کی بات ہو جو زبان غیر سے ادا ہوئی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہم اس سے مانوس ہوتے ہیں اور اس طرح ہمارے دل میں اس کے لیے ایک خاص جگہ پیدا ہو جاتی ہے اور جب یہ جذبہ ہمارے دل میں پیدا ہو جائے تو گویا ہم نے سخن فہمی و سخن شناسی کا حق ادا کر دیا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ایشیا میں شاہانِ کج کلاہ نے شاعروں اور ادیبوں کی بڑی قدردانی کی ہے لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ گزشتہ چار سو سال سے برِصغیر میں ایک مخصوص قوم کو جس نے اپنے خون سے اسلام کی آبیاری کی تھی، جس نے پورے برِصغیر اور غیر منقسم ہندوستان کو تاریخ میں پہلی بار متحد کر کے ایک وحدت میں پرو کر ایک شاندار ملک بنایا تھا اور طاقت وقوت کا سر چشمہ اہلِ اسلام کے ہاتھوں میں سونپا تھا، بابر کے ہاتھوں اس شوکت اسلامی کا خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان میں بعد

میں قائم ہونے والی مغل حکومت دوسری راہوں پر چلی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانوں نے جو اسلامی ماحول بنایا تھا وہ دھیرے دھیرے فنونِ لطیفہ اور ناچ ورنگ کی طرف چلا گیا، اقتدار کی جگہوں سے افغانوں اور مسلمانوں کی بے دخلی کے نتیجہ میں جاہلانہ تہذیب وافکار کا حکومت کے ایوانوں میں چلن بڑھتا چلا گیا جس کا سب سے زیادہ اثر افغانوں پر پڑا۔ اس لیے کہ مغلوں نے حکومت اُن ہی سے حاصل کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایشیا کی قدر شناسی کی جگہ پر ان کے ساتھ ظلم کا دور دورہ شروع ہوگیا، تنگدلی ان کی طرف سے بڑھتی چلی گئی، جبکہ اس قوم کے اخلاق وعادات، اس کے اعلیٰ کمالات، دُنیائے شعروادب میں تخیل کے اعجازات کی بے شمار روشن مثالیں موجود ہیں۔ اُن کے مذاقِ سلیم، آزادیٔ فکراور سادگیِ الفاظ نے شاعری کوایک روحِ تازہ عطا کی ہے۔ انگریزوں کے آنے کے بعد نئی حکمراں قوم بھی جب پٹھانوں کو جھکا نہیں پائی تو اُس نے اور زیادہ ظلم وجبر کا برتاؤ کیا، اس لیے کہ مغلوں سے بہر حال ایک دینی رشتہ تو تھا ہی، یہاں راہ میں کوئی دیوار حائل نہیں تھی لہٰذا اس نو وارد قوم نے پٹھانوں کو جاہل، اُجڈ، گنوار اور خونخوار بنا کر پیش کر دیا اور انگریز کے جانے کے بعد ہند میں مومن پہ آئی ہیں بلائیں بے شمار۔

علوئے ہمت، عزّتِ نفس، پاکبازی اور غیرت اسلامی جمع ہوں تو ایک پختون کا پیکر ابھرتا ہے، ان ہی چار عناصر سے اس پوری قوم کا مزاج بنا ہے۔ ان چاروں میں کون سا جوہر نمایاں ہے، اسے ہم اس کے خمیر سے الگ نہیں کر سکتے، زمانہ سازی اور ہوائے زمانہ اسے کبھی راس نہ آئی، ناقدر شناس دنیا میں یہ قوم ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھی گئی مگر سکندرِ اعظم سے لے کر روسی توسیع پسندی تک ہمیشہ یہ قوم سب کی راہ رو کے کھڑی رہی اور آج اس ایٹمی دور میں بھی اس قوم نے ثابت کر دیا کہ اس کی غیرتِ اسلامی، علوئے ہمت، عزّتِ نفس اور پاکبازی میں کمی نہیں آئی اور دُنیا کو بتا دیا کہ اسلام کے شیدائی کسی دوسرے کی غلامی قبول نہیں کرتے۔

ما طائرِ قدسیم سراسیمہ دریں دھر
کیفیت ایں آب وہوا را نشناسیم

اس گروہ کے کچھ لوگ طلبِ دنیا کے شکار ہو کر دوسروں کی خدمت گزاری بھی کرنے لگتے ہیں مگر اس کی بھی کچھ حدیں ہیں اس لیے موجودہ افغانستان میں داؤد سے نجیب اللہ تک کتنوں پر کیا گزر گئی۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

دنیا کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک جابر قوم کسی قوم پر چڑھ آئے اور اس قوم کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ملک سے نکل جائے اور آزادیٔ قوم و وطن کی راہ میں جہاد چھیڑ دے، یہ فخر بھی اس جدید دنیا میں صرف افغانوں ہی کو حاصل ہے یہی اس قوم کی اُفتادِ طبع ہے۔ آج کی دنیا جبکہ لابیوں کے نام پر غلامی میں چلی گئی ہے، فکری غلامی کی یہ ایک جدید اصطلاح ہے تو اس میں صرف افغان ہی ہیں جو اپنی عزتِ نفس کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں اور اپنی اخلاقی قدروں پر مضبوطی سے قائم ہیں، بہر حال یہ قوم غیور بھی ہے، خوددار بھی اور خود بیں و خداشناس بھی مگر مغرور نہیں۔

فنِ شاعری کی مقبول ترین صنف غزل ہے، یہاں ہم افغانوں یا پٹھانوں کی ادبی حیثیت سے گفتگو کرتے ہوئے اُن کی شاعرانہ خصوصیات کا ہی ذکر کریں گے۔ شاعری کی اصل وسعتِ تخئیل اور طرزِ ادا ہے، فطری شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمیں ملٹن کے اس قول پر دھیان دینا ہوگا۔ ''شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اصلیت پر مبنی ہو، پُر جوش ہو مگر سادہ ہو''۔

اردو میں پٹھانوں نے غزل کی زبان میں سادگی و پرکاری کے ساتھ خصوصیاتِ غزل کو کس طرح برتا اور شاعری کی روح اصلیت کو بھی برقرار رکھا۔ یہ بحث اُس وقت اور مشکل ہو جاتی ہے جب کسی فردِ واحد پر نہ ہو کر پوری قوم کی شاعرانہ خصوصیات کو بیان کرنا مقصود ہو۔ اس لیے کہ

کسی ایک شخص کی شاعرانہ خصوصیات بیان کر دینا آسان ہے نہ کہ پوری قوم کے شاعرانہ مزاج میں ہم آہنگی خود ایک معجزہ اور شاعری جزو است پیغمبری کے صادقانہ قول سے کم نہیں۔

فلسفیانہ، عشقیہ اور اخلاقی مضامین کو ایسے ہموار ڈھنگ سے بیان کرنا کہ ہر مضمون میں شاعری کی اصلیت بدرجہ اتم موجود ہو، زمانہ کی روش سے جدا شاعرانہ روش ہو، بات کا انداز نرالا ہو، تقلیدی راہوں سے ہٹ کر اپنی الگ راہ ہو اور ہر شعر قومی مزاج کی عکاسی کرتا ہو، اپنے فطری خیالات اور جذبۂ صادق کو شعر کے روپ میں ڈھال دیا گیا ہو، عزتِ نفس ہر ہر لفظ میں نمایاں ہو۔

گر وقت ذبح نالہ کیا میں نے کیا ہوا　　　پیارے کسی کا ہاتھ، کسی کی زباں چلے

ان شاعروں کے کلام کی ایک خصوصیت اور ہے جو یہ ہے کہ زیادہ تر ان کے کلام کا محور داخلی ہے یعنی آپ بیتی کے گرد ہی ان کی شاعری گھومتی نظر آئے گی اور ہر دل کی آواز بن کر قاری کے دلوں کو مسخر کر لے گی۔ جیسے۔

ہمارا دِل تھا ہم مالک تھے چاہا دے دیا جس کو　　　ہمیں جو منع کرتے ہیں بھلا وہ کون ہوتے ہیں

ان شاعروں کے خیالات خالص اپنے ہیں، مستعار نہیں، اسی لیے ان کے کلام میں استحکام بھی ہے۔

کہاں میں اور کہاں ترک محبت　　　نصیحت کی بھی ناصح نے تو کیا کی

ہمیں اس قوم کے شاعروں کے یہاں مجموعی طور پر اُن کے قومی مزاج کا عکس ملے گا۔ یہ وہ نہیں ہیں جو سنے سنائے اور گھسے پٹے مضامین کو صرف نظم کر دیں اور ان میں شعر کی چاشنی اور خیال کی ندرت نہ ہو۔ ندرت کے ساتھ ہی ایک بانکپن بھی ان کی شاعری کا وصفِ خاص ہے۔

ملک الموت سے کہدو کہ چلو رخصت ہو　　　جاں بہ لب ہجر میں جس کے تھا وہ اب آتے ہیں

حضرت موسیٰ کے ہی واقعہ کو لے لیں اور اس شاعر کی رائے کو دیکھیں۔

ایک ہی جلوے سے بیخود ہوئے غش میں آ کر　　　　تم نے اے حضرت موسیٰ ابھی دیکھا کیا ہے

یا منصور کا قصہ اور اس پر بے شمار اشعار مگر یہ دوسرا ہی انداز ہے۔

یاں لفظ انا الحق میں انا باعث شر ہے　　　　اس سے یہ جھلکتا ہے خودی پیش نظر ہے

یہ مختلف شاعروں کے اشعار اپنے اندازِ بیان، طرزِ ادا، اصلیت وسادگی کے اعتبار سے ایک ہی دِل کی حرکت کا کرشمہ معلوم ہوتے ہیں، ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں دکھائی دیتے ہیں، غزل کا خلوص، ستھرے خیالات اور فطری جذبات کی عکاسی شاعرانہ انداز میں اسی قوم کے یہاں ملے گی۔

یہ قوم حالات کے ساتھ نہیں چلتی بلکہ حالات کو اپنے موافق بنانے کی جدوجہد ہر میدان میں کرتی رہتی ہے۔ تقلیدِ غیر اور پابندیٔ رُسوم اس کی فکرِ آزاد میں کوئی جگہ نہیں رکھتی بلکہ وہ خود ذوقِ سلیم کی مالک ووارث ہے، لہٰذا دوسروں کی پیروی کا طوق اس کی گردن میں ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ وہ خداداد ملکہ ہے جو پابند تقلید وسلاسل نہیں۔ اس قوم کے شاعروں نے کسی دور میں یہ نہیں سوچا کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اس طرح کے مضامین کا رواج ہے یا نہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے کلام کو اصلیت اور واقفیت کی کسوٹی پر پرکھا ہے صداقت کے دائرہ میں اسے جانچا ہے اسی لیے مضمون آفرینی اور سادگیِ زبان وبیان ان کے کلام کا جوہرِ خاص ہے جس نے جوش وجذبۂ صادق کی راہ سے اس پر مزید جلا کی ہے۔ اس کا تعلق بھی ہمیشہ حقیقت نگاری سے رہا ہے، اس لیے کہ ہر وہ جوش وجذبہ جو اِن حدود کو پار کر جائے وہ بے اثر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قوم کے ہر شاعر کے یہاں تخیل کی بلندی، احساسات کی تیزی اور شاعرانہ جذبات کی فراوانی ملے گی۔

قرآں پہ ہاتھ رکھ دیا مسجد میں بیٹھ کر　　　　اس پر بھی بدگمان ہو، حیرت کی بات ہے

اِک صلاحِ غیر پر لاکھوں ستم	پوچھنا تھا اور بھی دو چار سے
توبہ کرتاہوں بڑے بول سے تھوکوں نہ کبھی	دخترِ رز کرے مردار جو داماد مجھے
زاہد شعورِ حُسن سے بیگانہ ہی رہا	حسنِ نظر نہیں ہے تو حسنِ عمل کہاں

نازک خیالی اور مضمون آفرینی کو ان شاعروں نے اپنی غزلوں کا خاص موضوع بنایا ہے۔اُن کی شاعری کا یہ سرمایہ تقریباً تین سو سال پر محیط ہے۔ان تین سو برسوں میں صوبہ سرحد سے لے کر ہندوستان کے طول وعرض میں پٹھانوں نے اردو ادبیات کی خدمت گزاری میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

غزل کی دنیا کو خاص طور پر انھوں نے اپنی نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے بڑی وسعت عطا کی ہے،ان سے پہلے غزل کی دنیا بس ہجر ووصال اور حسن وعشق کی وادیوں میں بھٹک رہی تھی جبکہ پٹھانوں نے اس میں حسن وعشق پردہ دار کے ساتھ ہی اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین کو عشق کی آنچ میں تپا کر پیش کیا ہے۔

ہم نہ غیروں سے ملیں تجھ کو بھی ہم ملنے نہ دیں	اب تو ہم تیرے ہوئے اور تو ہمارا ہو گیا
زینۂ بام یار ہے واصل	کیوں نہ منصور کو ہو دار عزیز
نہ کیونکر لے کے بھاگے قیس اپنا جامۂ ہستی	کفِ پا سے مرے صد چاک ہے داماں بیاباں کا

جوش اور سادگیٔ بیان پٹھانوں کی شاعری کا خاص وصف رہا ہے،جن کی بنیاد اصلیت ہے۔شاعری میں یہ سادگی اور جوش اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اصلی خیالات اور جذبۂ صادق موجود ہو۔دوسری صورت جوش وسادگی کی یہ ہے کہ مضمون کو شاعرانہ انداز اور لطیف پیرائے میں پیش کیا گیا ہو،گویا اصلیت اور جوش وسادگی لازم وملزوم ہیں،جب مضمون اصلیت پر مبنی ہو گا تو خود بخود اُس میں جوش وسادگی پیدا ہو جائے گی۔یہی وہ جوہر ہے جو کلام کو تاثیر اور بے ساختگی عطا

کرتا ہے لیکن اس کا اندازہ وہی طبائع کر سکتے ہیں جو خود صاحبِ ذوق ہوں اور شاعری کے اصل جوہر سے واقف ہوں۔

آمدِ یار سے خوش ہے دلِ ناتجربہ کار
نہیں واقف کہ قیامت دمِ رخصت ہوگی

میں کسی پھول کو چھولوں تو بنے سوکھ کے خار
تم جو کانٹے بھی اُٹھالو تو گلستاں ہو جائے

کچھ نہ اے رقیب تو اس کی مصاحبی پہ ناز
کچھ دنوں بزمِ یار میں ہم کو بھی اعتبار تھا

کم سنی میں بھی ستم کی شرارت ہے ان کی
شمع پر دوڑ کے پروانوں کے پر رکھتے ہیں

جو طفلی ہی سے اپنے حسن پر اِترائے جاتے ہیں
نشاں ان میں ابھی سے دلبری کے پائے جاتے ہیں

اور کچھ دیکھتے ہیں اہلِ نظر
حسن پر اکتفا نہیں کرتے

جب کہا دل تم پہ دیوانہ ہوا میں کیا کروں
یوں لگے کہنے مری جانے بلا میں کیا کروں

مجھے وہ دے رہے تھے گالیاں بے وجہ محفل میں
جو پوچھا بات کیا، جھنجھلا کے بولے بات کیا ہوتی

شعر کی خوبی یہ ہے کہ مضمون اور الفاظ شاعر کے دل و دماغ کے ترجمان ہوں اور قاری کے دل و دماغ پر وہی اثرات مرتب ہوں جن کے تحت شاعر نے شعر کہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو بات کہی گئی ہے وہ مافوق الفطرت نہ ہو بلکہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی اور قرینِ قیاس ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ شعر کا مضمون اصلیت پر مبنی ہو اور طرزِ ادا میں سادگی الفاظ میں چستی اور بندش میں بے ساختگی و روانی ہو اور شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ ایک برقی رو کی طرح قاری کے دل و دماغ میں اُتر کر اس کے جذباتِ خفتہ کو بیدار کر دے۔ تخیل اور طرزِ ادا کی سادگی شعر کی جان ہوا کرتی ہے اور یہ جملہ خوبیاں مجموعی طور پر پٹھان شاعروں کے کلام میں موجود ہیں۔ ان شاعروں کی سادگی، حسن اور طرزِ ادا کی پاکی ہر لفظ سے ظاہر ہے۔ اُن کی غزل گوئی میں سادگی و شیرینی کا عنصر دراصل ان کے مزاج کی سادگی و شگفتگی کا مظہر ہے۔ پٹھانوں کی غیرت کو نہ

للکاریں تو اُن سے زیادہ شگفتہ مزاج اور شیریں دہن وزم گفتار دوسرا کوئی نہ ملے گا، ان کے خیالات پاکیٔ دل اور ان کی نظر شرم آمیزی کا اعلیٰ نمونہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل بھی عریاں نہیں غلاف پوش ہے، ان غلافوں کی تہوں کو ہٹائیں تو ان کے اشعار کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے۔ ان کا کلام دوسرے شاعروں سے کچھ الگ ملے گا، ان کے سرو آہنگ کی بات ہی اور ہے جن میں جھرنوں کا ترنم، پہاڑوں کی پختگی اور صحراؤں کی وسعتِ پُر بہار قاری کے دِل ودماغ کو ایک خاص لذّت عطا کرتی ہے۔

الٰہی نازکی بڑھ جائے اتنی — کہ ان کو ناز کرنا بھی گراں ہو
ناتوانی سی ناتوانی ہے — سانس دو دوپہر نہیں آتی
آئینہ پانی پانی ہو جس سے — تیرے چہرے کی وہ صفائی ہے
صیّاد مرغِ دل مرا نازک ہے اس قدر — زنجیر بوئے گل میں گرفتار ہو گیا
ہر دل کو مثل قصۂ یوسف عزیز ہو — موزوں کروں غزل میں اگر ماجرائے دل
مجھ سے کہتے ہیں وہ کہ تو کیا ہے — کوئی پوچھے یہ گفتگو کیا ہے
آب خنجر سے تر ہوا نہ گلو — سر بہت تشنہ کام نے مارا
ہیں سب ہوائیں گلشنِ عالم کی سرسری — جو بندھ گئی ہوا وہ نسیمِ بہار ہے
بتوں کی نذر کردی جان میں نے — خیانت کی امانت میں خدا کی
مجرم ہے جو بیتاب سزا کیوں نہیں دیتے — لو ہم نے تمہاری بھی یہ تقصیر نکالی

ان شاعروں کی غزل گوئی اصلیت اور خلوصِ دِل پر مبنی ہے جس نے ان کے کلام میں حُسن تخیّل اور سادگیٔ زبان وبیان پیدا کردی ہے، انھوں نے زمانہ کی روش سے ہٹ کر اپنی الگ راہ نکالی۔

مجھے دیکھو کہ میں اپنی پرستش آپ کرتا ہوں　　　　کیا ہے اک نیا ایجاد طرزِ زندگی میں نے

ہمارے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ گزشتہ کئی سو برسوں سے ہم پٹھانوں کو ان کے دشمنوں کی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں لیکن اب آزاد فضا میں، دوستانہ ماحول میں، اپنی آزاد فکر و نظر سے اِس قوم کے محاسنِ شعری و ذاتی کو دیکھنے کا عادی بنائیں تا کہ اُن کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو دھونے میں کامیاب ہو سکیں، غیروں کی نظروں سے دیکھنا ترک کر کے اِسلامی فکر و نظر کے دائرہ میں رہ کر ان کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیں۔

اصل میں ادبیات کو بھی ہم غیروں کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اور یورپ کے قائم کردہ ادبی اصول و ضابطوں کے تحت اپنے سرمایۂ علمی و ادبی کو جانچتے رہے ہیں جبکہ بہت پہلے اہلِ اسلام اور صوفیائے کرام نے ادبیات کی تقسیم کر دی تھی مگر ہم سیاسی محاذ پر غیروں سے ہار گئے تو اقتصادی اور ادبی محاذ پر بھی شکست تسلیم کر کے ان ہی فاتح قوموں کے جاہلانہ فکر و نظر کے غلام بن گئے۔ جبکہ ادبیات کی یہ تقسیم کتنی واضح اور حقیقت پر مبنی ہے۔ ذرا اسے بھی غور سے دیکھیں۔

اہلِ ادب کے تین گروہ ہیں:

۱۔ اہلِ دُنیا۔ ان کا ادب یہ ہے کہ فصاحت و بلاغت، علم اور اسرارِ معانی کو حاصل کریں۔ جس میں یہ خوبیاں نہ ہوں وہ صاحبانِ ادب میں نہیں، یہ کم بینی و نادانی ہے کہ ادب اسی کو جانتے ہیں۔

۲۔ یہ گروہ اہلِ شریعت کا ہے۔ علوم کی تحصیل، ریاضتِ نفس، اعمال و جوارح کا لحاظ، طبیعت کی پاکیزگی، حدودِ الٰہی کی نگہداشت، ترکِ شہوات، شبہات سے کنارہ کشی، حسنات و خیرات کی طرف میلان، یہی اہلِ شریعت کا ادب ہے۔

۳۔ تیسرا گروہ اہلِ خصوص کا ہے۔ اُن کا ادب دل کی نگہداشت ہے کہ دل کی پاسبانی کرتے ہیں اور ان اسرار کی نگہبانی جو اللہ کی طرف سے اُن کے دلوں پر منکشف ہوتے ہیں، یہ کام سب سے مشکل ہے، وہ نفاق سے دُور ہیں اور ظاہر و باطن میں یکسانیت کی کوشش کرتے ہیں۔ [1]

لیکن ہم اپنی دنیا سے نکل کر غیروں کی بستی میں جا بسے اور غیر مانوس ادب کی تاریکی سے اپنی شمع فروزاں کو بجھا بیٹھے۔

مجموعی طور پر پٹھان شاعروں کے یہاں ہمیں ایک ستھرا مذاق ملتا ہے، اُن کا معشوق اتنا عریاں نہیں۔ فارسی شاعری کی راہ سے معشوق کی جنس مرد بن گئی حالانکہ فارسی میں فعل سے جنس کا پتہ نہیں چلتا، اِسلامی تہذیب میں مرد اور غیر عورت سے قصہ ٔ عشق کو بیان کرنا بُرا سمجھا جاتا ہے، پٹھانوں کی اصل شاعری پشتو میں ہے، اُن کا معشوق پردہ دار ہے، عریاں نہیں اور اُردو میں ان کے عشقیہ مضامین اصلیت پر مبنی ہیں، ان کی شاعری میں ہوس کاریوں کو زیادہ دخل نہیں ہے، مبتذل خیالات اور پست جذبات سے اُن کی شاعری بہت دُور رہی ہے۔ اُنھوں نے غزل کو پاکیزہ راہوں پر لے جا کر اردو شاعری کی عظیم ترین خدمات انجام دی ہیں۔

اُنھوں نے عام طور پر ایسے اشاروں اور کنایوں میں بات کی ہے جن کا سرچشمہ پاکیزہ خیالات ہیں۔ وہ دنیائے حسن و عشق کی مجبوریوں اور پابندیوں سے بھی واقف ہیں۔

ہائے مجبوریاں محبت کی — اشک امنڈے مگر بہا نہ سکے

زلف ہے اژدرِ موسیٰ، ید بیضا، کفِ پا — سر سے تم پاؤں تک اعجازِ پیمبر نکلے

وہ زندگی نہیں کہ نہ ہو جس میں سوز و ساز — دل زندگی کا راز ہے، آنسو ہے دل کا راز

---

[1] فوائد السعداء۔ حالات حضرت شاہ مینا لکھنوی

زندگی نے کہا خدا حافظ پاؤں رکھا جو کوئے قاتل میں

شمع مرکر بھی گل ہی کھاتی ہے اچھے اچھے ہیں ہر بہانے سے

دل ہوگیا خوں تو جگر ہوگیا پانی جاری اِن آنکھوں سے ہوئے لعل وگہر دونوں

ان شاعروں نے ہمیشہ غزل کے انداز میں حکمت و دانائی کی ہی باتیں کی ہیں اور پند ونصائح کے دامن کو نہیں چھوڑا ۔

مساوی ہو نگاہِ لطفِ شہ اپنی رعیت پر برابر مہر تاباں کے ہو ہر ذرّہ بیاباں کا

لوگوں کی ہوس کاریوں کی وجہ سے دنیائے عشق کی بے اثری کا ذکر بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔

سوز و گداز، آہ و بکا، نالہ درد و یاس سب کچھ ہیں فیضِ عشق سے لیکن اثر نہیں

ان شاعروں نے کبھی سطحی اور معمولی مضامین کو بیان کرنے میں وقت برباد نہیں کیا بلکہ ہمیشہ گہرائی میں غوطہ زن ہوکر گوہر آبدار نکالنے کا کام کرتے رہے اسی لیے ان کی شاعری میں نکتہ سنجی اور ذوقِ عرفانی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

عبث ابرو پہ بل ہے، قتل سے انکار ہے کس کو تہ تیغ اس لیے پہلے ہی میں نے سر جھکایا ہے

صیاد مرغِ دل مرا نازک ہے اس قدر زنجیر بوئے گل میں گرفتار ہو گیا

نوگرفتار ہوں کچھ رسم مجھے یاد نہیں اس لیے لب پہ مرے نالہ وفریاد نہیں

آتے ہی شب وصل کے کیا سوگئی تقدیر دیتے ہیں اذاں شام سے مرغانِ سحر آج

ان شاعروں کی افتادِ طبع میں عشقیہ مضامین کے ساتھ اخلاقی قدروں اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں جاتا اور سرورِ عشق میں ان کے یہاں بدمستی نہیں بلکہ دانائی اور ہوشمندی کے جوہر نمایاں رہتے ہیں۔ ان شاعروں نے ہجر ووصال کی دنیا سے اُردو شاعری کو نکال کر تنوع اور وسعت فکر ونظر پیدا کر کے اردو شاعری کے دامن کو ہمہ گیر بنانے کا کام بڑے حسن وخوبی سے

انجام دے کر عزتِ نفس، علوئے ہمت، اخلاقی اقدار اور پاکبازی کی خصوصیت کو نمایاں کیا ہے۔

ہمت ہے تو کر پیدا فردوسِ حیات اپنا | بخشی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا
کعبہ میں، گاہ دیر میں اور میکدہ میں گاہ | دردر لیے پھرے ہے کسی در کی احتیاج
سخت جاں عشاق ہیں، نازک کلائی آپ کی | ذبح کرنے کو ہمارے تیز خنجر چاہیے

شاعر کی دُنیا الگ ہوتی ہے جب وہ فطرت کو بے نقاب کرتا ہے تو اس کے نظاروں سے احساساتِ لطیف حرکت میں آجاتے ہیں، سائنسدانوں اور فلسفیوں کی طرح شاعر طے شدہ راہوں پہ نہیں چلتا، فلسفی کو کچھ نہیں ملتا جبکہ شاعر تہ سے موتی نکال کر رکھ دیتا ہے اور یہ سب کچھ وہ قوتِ تخیل کی بنیاد پر کرتا ہے، یہ شاعر ہی ہے جو فلسفہ کے بے روح ڈھانچہ میں زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔

کلی نے پھول بننے کی خوشی میں کر دیا | اس چمن کو خوبصورت، اپنے دل کو چاک چاک
محبت نام ہے اور ہر دل مکیں ہے | محبت سے کوئی خالی نہیں ہے
جو سمجھو ذات مطلق فی الحقیقت | محبت ہے، محبت ہے، محبت
محبت بوئے گل، گل ہے محبت | محبت جزو اور کل ہے محبت
محبت سے ہر ایک ہو مست و مدہوش | محبت ہی کرے از خود فراموش
محبت چشم کو دے اشکباری | محبت دل کو سونپے بے قراری
محبت ہی سے ہو بیتاب بلبل | محبت ہی سے ہو ٹکڑے دل گل
ہوا سر دار پر منصور کے ہونے سے یوں ظاہر | کہ بعد از مرگ بھی عاشق کی سرداری نہیں جاتی
جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا | بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا
سلسلۂ عشق میں جو گبرو مسلماں دیکھے | زلف کی طرح سبھی ہم نے پریشاں دیکھے

نگہ کے نیشتر سے کیا رگِ جاں صاف کھولی　　یہ نازک کام تھا پیارے اسے فصاد کیا جانے

بہت سے دوسرے شاعروں نے بھی فلسفیانہ مضامین اور عشق ومحبت کی مختلف داستانوں کو بیان کیا ہے مگر کسی فلسفیانہ مسئلہ کو نظم کر دینا اور بات ہے اور کسی خشک مسئلہ کو لطیف بنا کر پیش کرنا جو حقیقی شاعر کا کام رہا ہے، عشق ومحبت جیسے پیچیدہ مسئلہ کو بڑی روانی وسادگی سے پیش کر دینا دوسری بات ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے۔

اُردو شاعری میں عشقِ حقیقی ومجازی کا مسئلہ خود نہایت پیچیدہ ہے، جسے نواب محبت خاں محبتؔ نے کس خوبی سے حل کیا ہے اور عشقِ حقیقی ومجازی کے درمیان ایک امتیازی خط کھینچ کر بتایا ہے کہ عشقِ مجازی کی آگ دراصل وہ آگ ہے جس کے مریض کا کوئی علاج نہیں اور وہ ناقابل برداشت ہے۔

یہ عشق کی آتش وہ قیامت ہے کہ جس میں　　صابر تو خدا کی قسم ایوّب نہ ہوتا

یا ملیح آباد کے ایک شاعر کا مزاحیہ انداز میں یہ کہنا۔

اپنے ہی عشق کی آگ میں جو وہ جل کے مرگیا　　ایسے مریضِ عشق کا کریا کرم نہ چاہیے

ان شاعروں نے شاعرانہ انداز میں منطق وفلسفہ کے مسائل کو بڑی سادگی سے بیان کیا ہے جو اُن ہی کا حصہ ہے۔

ہے نظر ہر چشم میں اور چشم نے دیکھی نہیں　　یار سے ہیں بے خبر، ہے یار ہر آغوش میں

ان شاعروں کا کلام جہاں اندھی تقلید سے عاری ہے وہیں تعصب وتنگ نظری بھی اُن کے یہاں نہ ملے گی۔ اس لیے کہ تعصب علوئے ہمّت اور بلند حوصلہ کے خلاف ہے۔ اندھی تقلید، تنگ نظری اور فطرت سے دوری وتنگ خیالی کو جنم دیتی ہے اور یہ تمام چیزیں پٹھانوں سے دور بھاگتی ہیں، اصل یہ ہے کہ ان شاعروں نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق ہی اشعار کہے ہیں اس

لیے ان کی شاعری میں حسین جذبات اور بلاغت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے یہاں خیالات جتنے پرجوش ہیں، صبر وتحمل بھی اتنا ہی بے مثال ہے۔

کیا ہی ذوق افزا شفاعت ہے تمھاری واہ واہ — قرض لیتی ہے گنہ پرہیزگاری واہ واہ

مجرموں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے رحمت کی گھٹا — طالع برگشتہ تیری سازگاری واہ واہ

رضائے خستہ جوشِ بحرِ عصیاں سے نہ گھبرانا — کبھی تو ہاتھ آجائے گا دامن اُن کی رحمت کا

کہتی تھی یہ بُراق کو اس کی سبک روی — یوں جائیے کہ گردِ سفر کو خبر نہ ہو

خدا ہی دے صبر جان پر غم دکھاؤں کیونکر تجھے وہ عالم
جب ان کو جھرمٹ میں لے کر قدسی جناں کا دولھا بنا رہے تھے
بُراق کے نقشِ سم کے صدقہ وہ گل کھلائے کہ سارے رستے
مہکتے گلبن، لہکتے گلشن ہرے بھرے لہلہا رہے تھے
نماز اقصیٰ میں تھا یہی سر عیاں ہو معنیٔ اوّل آخر
کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر جو سلطنت آگے کر گئے تھے

ان شاعروں کی قوتِ تخیل بلند اور فطری جذبات سے قریب رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ان کا کلام تازہ اور نوع بہ نوع مضامین سے مالا مال رہا ہے، اس میں حیرت ناک بات یہ ہے کہ پورے گروہ کی افتادِ طبع تقریباً ہر دور میں یکساں رہی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پٹھانوں کا اپنا قومی مزاج ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے شاعروں کے یہاں یہ خصوصیات موجود نہیں ہیں لیکن یہ ان کی انفرادی خصوصیت ہے جبکہ یہ دیگر میں اجتماعی خصوصیت ہے جو ہر جگہ پر یکساں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آزاد اور باریک بیں نگاہیں نئے نئے حقائق کو ظاہر کرتی ہیں جن تک دوسرے شاعروں کی نگاہیں پہنچتی نہیں یا وہ انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں،

لیکن یہ شاعر ان داخلی محسوسات کو نہایت صفائی اور بے ساختگی سے بیان کر جاتے ہیں۔ ان میں قلبی واردات بھی ہے، اخلاق و فلسفہ اور عشق و محبت بھی، مگر سب پر اصلیت اور صداقت کا جذبہ غالب ہے۔

وہ کمالِ حسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دُور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

کہتے ہو کوئی صدر کہیں بھی نہیں موجود
کیا اس کے یہ معنی ہیں کوئی صدر کہیں ہے

الہام کا ہر وقت یہ ابطال خروشاں
احقاق نوا کاریٔ جبریل امیں ہے

کیا شدتِ انکار میں پوشیدہ ہے اقرار
کیا جذبۂ تشکیک کے پردہ میں یقیں ہے

گم ہوں تجلیات میں یوں کائنات کی
جوئے اجل بھی موج ہے آبِ حیات کی

دبنے نہ دے گمان سے ہرگز یقین کو
اُٹھ قوت و حیات سے بھر دے زمین کو

کب صبح و شام راہ سے پھٹتا نہیں ہوں میں
پرَ مرکز جمال سے ہٹتا نہیں ہوں میں

ہر شام زخمِ دشنہ ہے، ہر صبح نوکِ خار
پھر بھی نیاز و ناز کا جاری ہے کاروبار

اگر ہم ماضی کو فراموش کر دیں تو مستقبل ہمیں ٹھوکر مار دے گا، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم ماضی کی خوابیدہ دُنیا سے بیدار ہوتے ہی بھاگنے لگیں، نہیں! بلکہ ہم کو اس خواب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرنا چاہیے جو ہمیں ماضی سے ورثہ میں ملا ہے۔ اس ورثہ پر بحث سے کچھ نہ ہوگا۔ جیسے کسی تلوار کی خصوصیات بیان کرنے سے تمہاری بہادری کا امتحان نہیں ہو سکتا وہ تو میدان جنگ ہی میں اپنے جوہر دکھانے سے ہوگا۔ اسی جوہر کا امتحان ہماری اپنی زبان میں استعمال الفاظ کے لیے ہوگا۔ برمحل اور موزوں الفاظ کا استعمال ہی عقل و دانش کو نمایاں کرتا ہے اس لیے اصل مسئلہ انتخاب الفاظ کا ہے، برمحل اور موزوں اور صحیح الفاظ کا عام طور پر بچہ دو برس میں بولنا سیکھ لیتا ہے اور وہ بے ربط الفاظ جوڑتا ہے تو کچھ دن بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن عمر کے ساتھ

اس کا ربط لازمی ہے، پھر یہ سیکھ لیتا ہے کہ کب بولا جائے اور کب چپ رہا جائے، یہ بڑھاپے اور اس کے درمیانی عمر کی بات ہے۔ پس وہ الفاظ قیمتی ہیں جو ادا نہیں ہوئے۔ پہاڑوں پر کہاوت ہے کہ کسی معقول وجہ کے بغیر تلوار کو نیام کے باہر مت لاؤ، لیکن اگر وہ باہر آ جائے تو دشمن کا سر قلم کیے بغیر واپس بھی نہ جائے، ہمارے الفاظ بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں اور یہی وجہ ہے کہ افغان یا پٹھان شاعروں نے بہت سوچ سمجھ کر الفاظ کو ادا کیا ہے۔

شاعری مرنے والی چیز نہیں ہے۔ اگر وہ فطرت، اپنے ماحول اور سماجی پس منظر سے ہم آہنگ ہے تو یہی شاعری بقا کی ضامن ہے اس لیے کہ فطرت بدلتی نہیں، ماحول بدلتا نہیں، صرف اصطلاحات بدل جاتی ہیں، معشوق کا مزاج نہیں بدلتا، اس کی شوخیاں نہیں بدلتیں، اس کی نزاکت نہیں بدلتی، یہ اور بات ہے کہ کسی شاعر یا کسی گروہ کے شاعروں کو بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر پسِ پشت ڈال دیا جائے۔

حالانکہ ان شاعروں نے کبھی ادب میں اپنی جگہ بنانے کے لیے شاندار اور دلفریب الفاظ کا استعمال بغیر صلاحیت کے نہیں کیا، ان شاعروں کا وقار علوئے ہمّت اور جذبۂ استقلال اس کو گوارہ نہیں کرتا کہ اپنی تخیل کی مفلسی کو ملمع سازی کے ذریعہ دلفریب بنانے کا کام کریں۔ اگر دماغ خالی ہے تو کج کلاہی کام نہ دے گی۔ جس طرح آپ لکڑی کی تلوار سے ایک چوہا بھی نہیں مار سکتے، ہاں بہتے پانی کی دھار کاٹ سکتے ہیں، کوئی شاعر یا فنکار اپنے قاری کو فریب نہیں دے سکتا، اعلیٰ فکر، بلندیٔ خیال اور فطری جذبات کے لیے نپے تلے اور شیریں الفاظ بھی ضروری ہیں۔

سونے چاندی کی اہمیت میں اصل دخل ان ہاتھوں کو ہے جو اِن دھاتوں سے مختلف قسم کے زیور بناتے ہیں، زمین پر پڑی مٹی سے بنے ہوئے منقش برتن بھی فنکار کے ہاتھوں سے گرانقدر بن جاتے ہیں، اسی طرح شعر کیا ہے؟ وہی لفظ جو ہر زبان پر ہے۔ شاعر اِن کو ترتیب

سے رکھ دیتا ہے تو ہر سننے والا جھوم اُٹھتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ ان شاعروں نے کسی ادبی نظریہ کو قبول کرنے کے بجائے اس بات کو زیادہ مناسب سمجھا کہ اشعار کیسے کہے جائیں، اسی لیے انھوں نے حقیقت نگاری پر زیادہ زور دیا، ان کی شاعری میں ہر پرندہ عقاب نہیں بن سکتا، روایتی پرندہ ہما بھی شاذ و نادر ہی ملے گا، ہاں ان کا اپنا حقیقی پرندہ جو اِن کی اپنی صفات کا حامل ہے ضرور ملے گا، اسی لیے دنیائے ادبیات میں ان کی راہِ شعر یا اسلوب بالکل منفرد و جداگانہ ہے۔ ان کا شاہین ان کی اپنی روح کا پرندہ ہے۔ وہ کسی سے مستعار نہیں ہے۔ وہ کسی دوسرے کے ادبی گھوڑے پر سوار ہو کر سائیس کا کام نہیں کرتے، نہ ہی کسی عیار کی گلیم اوڑھ کر کسی کو دھوکا دیتے ہیں اور یہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے اپنی روایات کو بھلایا نہیں، ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے تغافل کے باوجود اس کی مدھم لَو جسے وہ افغانستان سے آتے وقت چھوڑ آئے تھے۔ اسی طرح انھوں نے پہاڑوں کی گود سے پھوٹنے والے اس چشمہ کو بھی فراموش نہیں کیا جس نے میدانوں میں پہنچتے پہنچتے ایک دریا کی شکل اختیار کی اور یہ دریا کسی سمندر میں گم نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنے ملّی اور ادبی تشخص کو برقرار رکھا اور کہا ؎

ارے قاتل میں اسماعیل خاں ہوں — نہ منہ موڑوں گا وقتِ ذبح ہرگز

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی دُنیا محدود ہوئی ہے بلکہ یہ وسیع ہوئی ہے اور اس میں عالمگیر حقائق کا بیان بڑی ہوشیاری و چابکدستی اور صادقانہ انداز میں کیا گیا ہے، انھوں نے انسانی زندگی کے فطری تقاضوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، جس کے بغیر کوئی ادب زندہ ادب نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب کا تعلق ادیب کی قوم، ضمیر اور اس کی زبان سے ویسا ہی ہے جیسا کہ ندی کا اپنے اوّلین پہاڑی چشمہ سے جس نے اسے راہ میں پہاڑوں کے جگر کاٹ کر میدانوں تک پہنچنے کا حوصلہ عطا کیا اور اس لائق بنایا کہ وہ ہر ماحول میں اپنے

اوّلین رشتہ کو فراموش نہ کرے اور انسانوں کی فلاح و بہبود میں سرگرم رہے، اسی لیے زندہ ادب کا مطلب یہ ہوا کہ نئے زمانہ کی میٹھی دوا کی گولیوں کے ساتھ اپنے علاقہ کی جڑی بوٹیوں کی حقیقت کو فراموش نہ کیا جائے۔

افغان شاعروں نے اپنے وطن سے دور اجنبی ماحول میں بھی اپنے علاوہ۔کے گیتوں اور قومی مزاج سے اپنی شاعری کو غیر شعوری طور پر ہم آہنگ رکھنے کا کام اس طرح کیا کہ قومی مزاج کو یاد رکھتے ہوئے استقبال کرنے والے علاقوں کی خصوصیات کو بھی اپنے کلام میں جذب کر لیا، اسی لیے تین سو برس کی اس طویل مدّت پر پھیلے ہوئے ان کے ادبی کارنامے اپنے اور بے شمار انسانی دلوں کی دھڑکنوں کو سمیٹے ہوئے ہیں جن کے نمائندہ الفاظ یہ ہیں۔ یتیم، نالے، گُل، چمن، بُلبُل، کم بخت، خونِ دل، فصلِ گل، گرفتار، اشک گلگوں، مات، ہم چشمی، دِل جلا، قفس، مرغِ چمن، ظلم وستم، اغیار، سخت جانی، قاتلِ عالم، متاعِ صبر، خوں بہا، بوئے وفا، بحرِ غم، اہلِ ماتم، گریۂ شبنم، آہ، پتھر پھوڑنا، غارت گر، عریائی بدن، صیاد، دام، مرغِ دل، بال و پر، رنجور، دیدارِ چمن، غیرتِ یوسف، چاک گریباں، جہانِ خلیل، تیر مژہ، خاروسنگ، دیدۂ احباب، دیدۂ پُر آب، چشمِ گُہر بار، چشمِ خونبار، لیلِ تنور، شب سمور، در پئے قتل، سینۂ سوزاں، تیر و کماں، شیخی، آئینۂ فولاد، ظالم مظلوم نما، بندہ حرص و غلام آز، یار، چشم وغیرہ

یہی وہ الفاظ ہیں جو نشانِ راہ کا کام بھی کرتے ہیں اور اپنے اصل چشمہ سے سیراب کرتے ہوئے اس چراغ کو بھی اوجھل نہیں ہونے دیتے جو اُن کا صدیوں سے منتظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی منزل کو فراموش نہیں کرتے اور راہ میں اِدھر اُدھر بھٹکتے نہیں ہیں بلکہ اس کی حرارت سے ہمیشہ تازہ دم رہ کر ادب کی خدمت گذاری کرتے رہتے ہیں۔ اپنے اظہارِ خیال کے لیے انہوں نے برصغیر میں اردو زبان کو ذریعہ بنایا اور بڑی وفاداری سے اس نئی زبان کو ترقی

دے کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچایا اور ہندی، دیوناگری اور برج بھاشا میں بھگتی کی صنف کو فروغ دیا جس کا صفِ اوّل کا شاعر رس کھان (رس خان) ہے۔

اگر پٹھانوں کی شاعری کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہی پھول کی مختلف پنکھڑیاں ہیں جن کا رنگ وخوشبو الگ الگ ہے، لیکن ان کی اصل ایک ہے۔ان کے پاس اپنی مادری زبان اردو ہے۔ پشتو زبان اُن سے چھوٹ گئی، لیکن یہ تبدیلی ایسی ہی ہے جیسے درخت اپنے پتوں کو بدلتے ہیں۔ اصل فکر اور شکوہ الفاظ وہی ہیں جن کا خمیر پشتو سے بنا ہے۔زندگی کا عرفان وہی ہے، خاکے اور کردار وہی ہیں، گیتوں کا ترنم اور شاعری کی سادگی وہی ہے، تاریخ وہی، صرف جغرافیہ بدلا ہے، عدل ومساوات اور محبت کا شعور بھی وہی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ ان شاعروں نے اپنی اصل کو فراموش نہیں کیا، اپنی تاریخ کو نہیں بھولے، انھوں نے شیر کو گھاس اور گدھے کو گوشت کھلانے کا حماقت آمیز طریقہ کبھی اختیار نہیں کیا، زندگی کی حقیقتوں کو قریب سے دیکھا اور سماجی مساوات کے اپنے بنیادی کردار کو فراموش نہیں کیا اسی لیے خود کو سربلند جانتے ہوئے بھی دوسروں کی تذلیل کا طریقہ اپنے شعروادب میں کبھی نہیں برتا، اپنی فکر کی مضبوط دیواروں پر شعروادب کے گل بوٹے کھلائے جو غیر شعوری طور پر قاری کے دلوں میں اتر کر نغمۂ سرمدی بن گئے، انھوں نے کبھی ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا جو حقیقت پسندی سے دور ہو۔

شاعری کوئی گلدستہ نہیں کہ بنا بنایا رکھا ہو۔شاعری دراصل خودرو پھولوں کی طرح ہوتی ہے جہاں ہر پھول اپنا جداگانہ رنگ وخوشبو رکھتا ہے اور وہ ایک فطری شاعر سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کا انتخاب کرلے۔فکر وخیال ہواؤں کی رو پر چلتے اور آسمانوں سے باتیں کرتے ہیں۔یہی آسمانوں کی سیر موضوعات کو جنم دیتی ہے۔ان شاعروں کا موضوع فطرت کی سادگی جذبات کی تازگی اور احساسات کی روانی ہے۔اصلیت اور صداقت کو یہ پسند کرتے ہیں اور یہی

اُن کا موضوع ہے۔ انھوں نے اپنے آسمانوں، اپنے فکر و خیال کے وطن کو کبھی چھوڑا نہیں، اپنے شاہین نما موضوعات کے لیے وہ آسمانوں کی بلندیوں پر رہے، حقیر پرندوں کے ساتھ پڑ کر انھوں نے اپنی خصوصیات کو پامال نہیں کیا بلکہ اپنی فکر کی بلبل کو ہزار داستان سنانے کے لیے آزاد ہی رکھا کہ وہ ہر پھول سے کھیلے اور اس کی خوشبو و رنگت کو اپنے اشعار کا موضوع بنائے۔ یہ چاہے کہیں رہیں ہمیشہ اپنا ہی راگ الاپتے ہیں، اپنی ہی داستان سنانے اور اپنی افتادِ طبع کے مطابق ہی آزادانہ موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ وقتی اور ذاتی فائدہ کے لیے اپنی فکر و نظر کا سودا نہیں کرتے، ہر موضوع پر اوچھے ہاتھ مارنا بھی ان کی فطرت میں نہیں، ان کا اپنا موضوع، اپنا گھر ہے اسی کے اندر وہ مختلف بیل بوٹے کھلاتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر کئی لوگ دعویٰ کریں مگر اس کا مالک تو وہی ہوگا جو اس کا حق ادا کر دے، جس کو اس موضوع پر پوری قدرت حاصل ہو اور وہ اس کی گرفت میں بھی ہو، یہی وجہ ہے کہ پٹھان شاعروں کی علوئے ہمت اپنے موضوعات کو شاہین کی طرح چٹیل میدانوں اور بلند پہاڑوں کی سیر کراتی پھرتی ہے۔ موضوع کے لیے کھلی آنکھ، کھلے کان اور حساس دل کی ضرورت پڑتی ہے، جس کے لیے وسعتِ فکر بھی ضروری ہے۔ قلم اُٹھانے سے پہلے شدتِ احساس لازمی ہے، داخلی احساس جس پر پٹھان شاعری کی پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے اس کی ہنسی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں کو دیکھ کر ایسا کر رہا ہے بلکہ وہ دوسروں کو ہنسانے کے لیے ہنستا ہے، اسی طرح جب لیے اپنے کرب کو بیان کرتا ہے تو ہر دل اسے اپنا کرب سمجھ کر بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اپنی ذات کو جاننا، اپنے کو پہچاننا، اپنے ماضی سے محبت اور عرفان ضروری ہے، جس کے بغیر ن ضہ ع ہاتھ نہیں آسکتا اور جب یہ ہاتھ آجائے تو پھر اسے آسانی سے چھوڑا نہیں جاتا۔ برسوں تلاش و جستجو کے بعد کوئی لمحہ ایسا آسکتا ہے جب دل کی مراد بر آئے اور اپنے موضوع پر بھرپور گرفت ہو

جائے اور جب موضوع پر مضبوط گرفت حاصل ہو جائے تو شاعر کا کلام کسی کا عکس نہیں ہوتا بلکہ وہ شعلہ بن جاتا ہے، روشنی کا مینار، یہ روشنی اسی ٹمٹماتے چراغ کی بھی ہو سکتی ہے اور آفتاب کی بھی۔

کچھ پرندے ایسے ہیں جو موسم اور حالات کے ساتھ اپنے آشیانے تبدیل کر دیتے ہیں لیکن شاہین ہر موسم میں اپنے پہاڑوں کا ہی وفادار رہتا ہے، چڑیاں چلتی ہوا کے مخالف سمت میں اڑتی ہیں اور مچھلیاں دھارے کے اوپر تیرتی ہیں، ایک سچا شاعر اپنے دل اور ضمیر کی آواز پر الفاظ کو ترتیب دیتا ہے، چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی، اس مقولہ کی وہ پیروی نہیں کرتا، اس لیے کہ موضوع اور دل کی آواز میں رشتہ کے بغیر جنم لینے والا شعر پھسپھسا ہوگا اور قاری کے لیے اس کی حیثیت گوز شتر سے زیادہ نہ ہوگی۔

افغانوں نے شعر وادب کی دُنیا میں بھی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ یہ خدمت گذاری اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ انھوں نے اپنی پرواز عقابی رکھی ہے۔ انھوں نے صرف عقاب پر نظر ہی نہیں رکھی بلکہ اسے ادب میں برتا بھی ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ دوسروں نے ان سے زیادہ پُر جوش نظمیں لکھی ہوں اور انھیں شہرت بھی ملی ہو لیکن میں بہت سے ایسے لوگوں کو پہچانتا ہوں جو ولولہ انگیز کتابیں لکھتے ہیں، مجاہدین کی سیرت پر قلم اُٹھاتے ہیں لیکن بذاتِ خود نہایت پست ہمت اور بزدل ہیں، اس مزاج کے مالک لوگ شاید یہ سوچتے ہیں کہ بڑے آدمیوں پر کچھ لکھ دینے سے وہ خود بڑے بن جائیں گے جبکہ وہ اس راز سے واقف نہیں کہ بڑا بننے کے لیے سادگی کی ضرورت ہے۔ ''الفقر وفخری'' اس وقت وقعت رکھتا ہے جب ؎

تیرے قدم پہ جبہ سا روم وعجم کی نخوتیں	تیرے حضور سجدہ ریز چین وعرب کی خودسری
تیرے کرم نے ڈال دی طرحِ خلوص و بندگی	تیرے غضب نے بند کی رسم ورہِ ستمگری
تیرے سخن سے دب گئے لاف وگزاف کفر کے	تیرے نفس سے بجھ گئی آتشِ سحرِ سامری

عظیم انسان بننے کے لیے زبردست سادگی اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، چھوٹے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بڑی چیزیں دیکھ کر بڑا بننا چاہتا ہے جبکہ بڑا آدمی اپنے اردگرد بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی چیزوں یہاں تک کہ ان کی جزئیات تک پر نظر رکھتا ہے، وہیں بڑی چیزوں کو بھی نظرانداز نہیں کرتا۔ یہ طوفان سے قطرہ نہیں لیتا، بلکہ قطرہ سے طوفان برپا کرتا ہے۔

یہ موضوع محبت بھی ہے اور ایک عہد میں منت وسماجت بھی ہے اور دُعا بھی۔ دُعا جتنی بار کی جائے اس کی اہمیت بڑھتی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ میرا بندہ جب میرے سامنے تیسری بار گڑگڑاتا ہے تو مجھے خود شرمندگی ہوتی ہے اور میں دُعا قبول کرتا ہوں۔ محبت میں وصل کے بعد وہ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے، عہد بھی توڑ دیا جاتا ہے، منت وسماجت ذلت ورُسوائی کا سبب بنتی ہے جبکہ دعا روحانی زندگی کو طاقت دیتی ہے۔ پس دُعا کی طرح موضوع بھی دل کی آواز ہو تو اس کی قدر و قیمت بڑھتی ہے ورنہ کم ہو جاتی ہے۔ یہ موضوع اپنے مزاج کی عکاسی ہے۔

افغانوں نے برصغیر میں صدیوں رہ کر بھی اپنے اصل سے مزاج کا رشتہ نہیں توڑا، آج بھی وہ یہ بات نہیں بھولے کہ ان کے اجداد افغانستان کے کن علاقوں سے آئے، کئی صدیاں گذر جانے کے بعد اپنی ساری طاقت وتوانائی اور بہترین صلاحیتوں کو ہندوستان کی ترقی میں لگانے کے باوجود اُن کے سینوں میں اپنے سابق وطن کی یاد باقی رہی جس کے نتیجہ میں افغان مزاج کی عکاسی ان کے شعروادب کے ساتھ صحافت میں بھی ملے گی اور سیاست وحکمرانی میں بھی یہ مزاج کارفرما ہوگا۔

افغانستان کی تاریخ سکندرِ اعظم سے لے کر روسی یورش تک خون سے لکھی گئی ہے۔[1] وہ انگریز حملہ آور ہوں یا کوئی اور، سب کو تلواروں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ افغانستان میں کسی دشمن کا

---

[1] مقدمہ لکھے جانے کے وقت تک امریکی یلغار شروع نہیں ہوئی تھی۔

داخلہ تو آسان ہے مگر واپسی مشکل ہو جاتی ہے۔ دشمن نہ ہو تو اُن کا قلم پیار و محبت کے گیت گاتا ہے مگر دشمن وطن میں آجائے تو افغان محبوبہ اپنے عاشق یا منگیتر سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اے میرے محبوب دشمن وطن پر چڑھ آئے ہیں، تُو جا اور دشمن سے جنگ کر۔ اگر تو اس راہ میں کام آ گیا تو تجھے میری یہ زلفیں بہت پسند ہیں نا! اپنی زلفوں کے تاروں سے تیرا کفن بُنوں گی۔

پشتو کے مشہور شاعر خوشحال خاں خٹک کا یہ شعر۔ یہ پلکیں آنکھوں کے لیے سکھ اور ٹھنڈک کا سبب ہیں لیکن اگر اندر کو مڑ جائیں تو دکھ کا سبب بن جاتی ہیں، یہی حال اولاد کا ہے اگر اولاد سعادت مند ہے تو آنکھوں کی ٹھنڈک ورنہ بے چینی اور رسوائی کا سبب بنتی ہے۔ یہ شعر اُس نے اُس وقت کہا تھا جب اُس کا بیٹا اپنے باپ سے غداری کر کے اورنگ زیب کے ساتھ چلا گیا تھا۔ پھر دوسرے شعر میں یہ وصیت کی تھی کہ اگر کوئی اُس پر قابو پا جائے تو اُس کے جسم کے دو ٹکڑے کرے ایک میری قبر کے پائینتی ڈال دے، دوسرے کو پورے پٹھان دیس میں گھمائے تاکہ لوگ دیکھیں کہ غداری کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔

میرے بہت سے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا پٹھانوں کا تعلق بھی دماغ اور علم سے رہا ہے اور جب میں انھیں پٹھانوں کے علم و ادب، اُن کی شاعری اور سیاسی سوجھ بوجھ کے واقعات سناتا ہوں، بہلول لودی، سکندری لودی اور شیر شاہ کا ذکر کرتا ہوں، خان جہاں لودی کے بارے میں بتاتا ہ ، حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی غیرتِ ایمانی اور علم دوستی کا ذکر کرتا ہوں تو وہ ہینگ او ن کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں، جب میں انھیں بتاتا ہوں کہ کابل کے ایک سردہ فروش سے میں نے پوچھا کہ بھئی یہ صابن کھا جانے کا کیا قصہ ہے تو اس نے کہا ہمارا دشمن ہمیں یہ کہہ کر بدنام کرتا ہے کہ پٹھان صابن نہیں پیسہ کھاتا ہے لیکن جب اس نے بتانا شروع کیا کہ پیسے کا کون شوقین نہیں ہے مگر ہم نے اپنی عزت اور قوم کو بیچ کر پیسہ نہیں لیا اور جس نے ایسا کیا وہ پٹھان

دیس میں لعنتی ہوگیا، پختون قومیت سے خارج ہوگیا، ہم انگریز کے زمانہ میں آزاد علاقوں میں گرم موسم میں آگ نکلتی ہوئی چٹانوں پر پڑا رہتا تھا، کسی چشمہ کی بغل میں دشمن کے انتظار میں۔ انگریز کا ایک فوجی دستہ آیا اور اس نے اپنے اسلحہ اتار کر چشمہ میں پانی پینا چاہا، اس وقت ہماری بندوق سے گولی نکلا، اسے ہوشیار کرنے کے لیے ہم نے کہا کہ تم پانی پی سکتا ہے لیکن اتنا پیسہ اتنے منٹ کے لیے رکھ دے۔ ہم دشمن سے اس طرح پیسہ وصول کرتا تھا۔ رہی دوسری بات تو ہم نے سو برس میں ہندوستان والوں کو اصلی ہینگ نہیں دیا۔ ہم صابن کھائے گا، ہم بیوقوف ہے یا وہ۔؟ ان باتوں کو سن کر وہ ہنستے ہیں۔ پھر آج تو پٹھانوں نے اپنی سیاست کا بھی لوہا دُنیا سے منوالیا ہے۔

پٹھانوں کی شاعری کے ساتھ میں نے ان کے مزاج کا ذکر کیا، یہ مزاج ہے انسان دوستی کا، لوگوں سے ہمدردی و مساوات کا اور ان موضوعات کو شاعری میں بھی انھوں نے برتا ہے۔

نہ اے سپہر کبھی توڑنا دلِ دشمن
مرے جگر کے لئے درد ہے پرائی چوٹ

حالِ دل اس لیے اس شوخ سے کہتا نہیں میں
کہ ستم سے نہ کہیں اپنے پشیماں ہو جائے

غضب ہے آپ ہی چھیڑو، خفا ہو آپ ہی اُلٹے
تمہاری بات بھی جو ہے زمانہ سے نرالی ہے

کوئی حد ہے بھلا اس احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دُشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

ہدفِ مرگ وہ ہوا میں جیوں
اے اجل مجھ کو بھی لگا اِک تیر

حوصلہ صبر کا بھی تم کو دکھاتے اِک روز
کیا کریں بس میں ہمارے دلِ بیتاب نہیں

عبث ہے خوفِ شکایت بس آ کے مل جاؤ
رہے ہیں یاد ستم ہائے بے شمار کسے

وصل میں اِک نہ اِک بلا آئی
جب رکاوٹ گئی، حیا آئی

شبِ وصال کٹی دل کو جرأتیں کرتے
زباں ہلی نہ مری عرضِ مدّعا کیلئے

فکر فراق کے صدموں سے لالہ زار رہا　　　　یہاں خزاں میں سدا موسمِ بہار رہا

ہوا سردارِ منصور کے ہونے سے یوں ظاہر　　　　کہ بعد از مرگ بھی عاشق کی سرداری نہیں جاتی

شاعری کی جان اصل میں شاعر کی طرزِ ادا ہے، کلام میں یہ خصوصیت جتنی اُجاگر ہوگی وہ اس کے استقلال اور تخئیل اصلی کو نمایاں کرے گی۔ اس کے جذبات وخیالات فطرت سے قریب ہوں گے، الفاظ اور جذبات کو ایک ممتاز مقام ملے گا، یہ عوام کی بولی نہیں بولتا بلکہ عوام کو اپنی طرزِ ادا، بلند تخئیل، انتخابِ الفاظ اور اپنے اغراض ومقاصد کا تابع بنالیتا ہے۔ خیالات جتنے صاف اور واضح ہوں گے بات سننے والے پر اُس کا اتنا ہی اثر ہوگا، لیکن یہاں فرد کی بات نہیں ہے، پورے ایک گروہ کا اندازِ تکلم تقریباً ایک ہی جیسا ہے۔ یہ اہمیت اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب روکھے اور پٹے ہوئے مضامین کو قوتِ تخئیل اور طرزِ ادا سے جاذبِ نظر بنادیا جائے اور اس کے الفاظ کی گرمی اور برقی رو میں معجزاتی کیفیت پیدا ہو کر قاری کے دل کو مسخر کرلے۔ پٹھان شاعروں نے روکھے پھیکے مضامین کو لیا، مگر ان میں زندگی کی حرارت پیدا کردی اور اس طرح انھوں نے شاعری کے دامن کو ہمہ گیر وسعت بخشی ہے، ان کی غزلوں میں اصل جذبات کی ترجمانی ہے، جوش اور بیساختگی ہے، آج ہم انقلاب زندہ باد کے جس نعرہ سے حکومت کے ایوانوں کو دہلا رہے ہیں ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی حکیم مومن خاں مومنؔ نے اس لفظِ انقلاب کو ایک شعر میں ان ہی معنوں میں استعمال کیا تھا۔

اے حشر جلد کر تہ و بالا زمین کو　　　　یوں کچھ نہ ہو اُمید تو ہے انقلاب میں

افغانستان پٹھانوں کی کمزوری ہے، مہمان نوازی اُن کی جوانمردی ہے۔ میں نے خود ہرات میں ایک افغان کو روتے دیکھا، جب ایک امریکن نے اس کے گھونسہ ماردیا، اس طرح امریکن کا اسے مارنا اور پھر اس کا رونا مجھے اچھا نہیں لگا، میں سمجھتا تھا کہ وہ بھی پلٹ کر حملہ کرے گا،

میں نے اس سے کہا۔ ’’چرا اگر یہ می کنی‘‘ (تم رو کیوں رہے ہو؟) تو اُس نے کہا کہ یہ مہمان ہے، اسے مار نہیں سکتے، مہمان کا یہ احترام بڑی جوانمردی کی علامت ہے، لیکن اگر کوئی دوست بن کر اُن کی قومی غیرت کو پامال کرنے لگے تو اس کا وہی حشر ہوگا جو سکندرِ اعظم، انگریز اور روس کا ہوا۔ افغانستان ان کی عزت ہے اور ادھر اگر کوئی نگاہِ بد سے دیکھے گا تو پھر اس کی خیر نہیں، اسی لیے وہ اپنے ماضی سے نہیں کٹتے، قدیم روایات، قدیم نغمات اُن کی چار بیت یا لوک کتھائیں سب اُن کی میراث ہیں، شمشیر کی جھنکار، شاہین کی یلغار، وفادار دوشیزائیں، نیک دل مائیں اور نوجوانوں کے بہتے ہوئے خون کی روانی ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔

پھر یہ مسئلہ اُبھرا کہ اصل صنف کیا ہو، تو افغانوں نے اپنے علاقہ میں نغمات چار بیت صنف کو بڑی خوبصورتی سے اختیار کیا، ان کی دو زبانیں ہیں دری (فارسی) اور پشتو۔ پشتو میں ٹپے یا لنڈئ کو اختیار کیا لیکن اُردو میں اپنے جذبات کا ذریعہ غزل کو بنایا اور دل کی بات کو بے ساختگی سے ادا کر دیا، دل کے اپنے طریقے ہیں اور یہ جدا جدا ہوتے ہیں، بعض لوگوں کو ان کی روش الگ لگتی ہے اور لگنا بھی چاہیے، اس لیے کہ وہ ہر دیوار میں لگنے والا الگ پتھر دکھائی دیتے ہیں، اپنی فکر و جذبات و احساسات کے اعتبار سے!

دُنیا میں کوئی چیز نہیں جو فطری شاعری کی جگہ لے سکے، یہ پرندوں کی چہکار، دلوں کی دھڑکنیں، چشموں کی روانی سب بے کیف ہو جائیں اگر ان سے شاعرانہ جذبات کو الگ کر لیا جائے اور یہ ساری کیفیات مادیت کا بے معنی ڈھیر بن جائیں۔

رحم دلی، نزاکت، حسن و محبت، دردمندی، نفرت و اُلفت، جرأتمندی و افتخار اپنی جگہ پر مستقل ایک صفت ہیں، لیکن ان کی ساری بہار شاعری سے ہے، ان الفاظ سے شاعری کی صفت کو الگ کر لیا جائے تو یہ بے کیف ہو جائیں گے، اس کے ساتھ ہی شاعری کی ساری آن بان بھی

ان ہی سے ہے۔ان ہی سے شاعری روح پر اثر انداز ہوتی ہے، روح میں پیدا ہونے والی یہ لہریں کمپیوٹر سے زیادہ لطیف اور حساس ہیں جو پہلے شاعر کے وجود پر طاری ہوتی ہیں پھر انھیں وہ دوسروں کی طرف منتقل کر دیتا ہے مگر یہ سب کچھ اپنے پہاڑوں سے لگاؤ کی وجہ سے ہے۔ ان کا یقین ہے کہ پہاڑ ان کے لیے بہترین پناہ گاہ ہیں اور ماں کی گود کی طرح ہیں اسی لیے اپنی ماں کی گود میں رہ کر وہ ہمیشہ دشمن کے حوصلوں کو پست کر دیتے ہیں، اُن کی شاعری میں بھی ماں کی ممتا، دشمن کے خلاف یلغار اور پہاڑوں کی بلندی پائی جاتی ہے۔اِس میں غصہ بھی ہے، دیوانگی بھی، محبت بھی، غم کے آنسو بھی، قہقہے بھی۔ اس لیے کہ ان کے سینہ پر کبھی گہرا زخم، کبھی خون کا فوارہ، کبھی زلفِ محبوب، کبھی شکوے، کبھی موجیں مارتا ہوا طوفانِ محبت، کبھی لبِ لعلیں، کبھی شاہین کی اڑانیں، کبھی طوفانِ برق و باراں، کبھی برف باری، کبھی اولوں کی بارش، کبھی دف و ساز اور کبھی شمشیر و خنجر اور جنگ و پیکار رہی۔

بات کوئی نئی نہیں ہوتی، اصل میں انداز نیا ہوتا ہے جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور جب کوئی سنی سنائی بات نئے انداز میں پیش کی جاتی ہے تو دل پھڑک اٹھتا ہے، اس کو ادب میں اسلوب یا طرزِ ادا بھی کہتے ہیں، شاعر کسی دفتر کا بابو نہیں جو بس مختلف چیزوں کا حساب و کتاب درج کرتا رہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ وہ کیا اور کیسے لکھتا ہے؟ کسی شعر کا حسین الفاظ میں ادا کر دینا ہی ہنر نہیں ہے اس کے ساتھ نیاپن بھی ہونا چاہیے، اس کے لیے خود آگاہی اور اپنا طرز و اسلوب پیدا کرنا ضروری ہے۔

افغانوں میں اپنی شناخت کا مسئلہ سب سے اہم ہے، وہ اپنے گلّوں میں دوسری آنے والی بھیڑوں کو فوراً پہچان لیتے ہیں مگر وہ چوروں کی طرح ان کی سینگیں کاٹنے یا رنگ بدلنے کا کام نہیں کرتے، وہ تو اپنی ہی بھیڑوں پر قناعت کرتے ہیں، اس طرح وہ اپنے انداز اور طریقِ

زندگی کو بھی نہیں بدلتے، اسی لیے افغان اپنی زندگی میں جیسے ہیں ویسے ہی دکھائی دیتے ہیں، گھر کے اندر اور گھر کے باہر ان کی دوہری شخصیت نہیں، بالکل اسی طرح ان کی ادبی زندگی اور اسلوب بھی سادگی کا اعلیٰ نمونہ ہے، جیسے ان کا شاہین پرندوں کی دُنیا کا درویش۔ اپنی جفاکشی اور سخت زندگی کے بل پر ایک افغان بچہ بیس سال کی عمر تک شاہین صفت شہپروں کا مالک بن جاتا ہے، وہ ہواؤں میں اڑتا ضرور ہے مگر ہوا کی رَو پر نہیں چلتا۔ اپنی ادبی زندگی میں بھی افغانوں کے یہاں عوام کے جذبات وخیالات اشعار کے سانچے میں ڈھل ضرور گئے ہیں مگر ایسے ہیں کہ ان کی اپنی راہ الگ ہے۔ اسی لیے ان کی اپنی شاہراہ ہے جیسے فضاؤں میں شاہین کی اپنی الگ راہ ہے یا ایک ہندوستانی پرندہ ہریل، اوّل تو زمین پر وہ اُترتا نہیں اور اگر اُترتا ہے تو پنجے میں لکڑی دبا کر، زمین پر پیر نہیں رکھتا اور اگر آپ اسے شکار کریں اور زمین پر گرے تو بھی پیر اس کے اوپر رہتے ہیں، ہمیشہ اُلٹا گرتا ہے یعنی وہ زمین پر پیر مرنے کے بعد بھی نہیں ڈالتا۔ ٹھیک اسی طرح افغان یا پٹھان شاعروں نے اپنی اَدبی زندگی میں تکلّفات سے الگ رہ کر بے ساختگی اور سادگی کا اظہار کیا ہے جیسے گھر میں بات کی جاتی ہے، آزاد اور بے تکلّف۔ یعنی یہ کہ ان کی شاعری کا انداز رسمی نہیں ہے، پابندِ سلاسل بھی نہیں۔

اس قوم کی خوبی یہ ہے کہ دُنیا میں کہیں یہ رہے پہچان لی جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر جگہ وہ پٹھان ہی دکھائی دینا چاہتی ہے۔ برصغیر میں ایک ہزار برس سے یہ اپنے کو پٹھان کہلائے جانے پر فخر کرتی ہے۔ پٹھان اپنی ٹوپی نہیں بدلتے، اپنا مزاج نہیں بدلتے۔ یہ اپنے مزاج، اپنے طریقے، طرزِ زندگی، اندازِ گفتگو اور طرزِ ادا سے ہر جگہ پہچان لیے جاتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں ان کے اپنے کردار کے ساتھ ہی پوری قوم کا کردار جھلکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود کچھ نہیں، نہ ان کی انا، نہ خودی، بلکہ یہ پوری قوم کی میراث ہے جسے صدیوں سے وہ اپنے سینہ

سے لگائے ہوئے ہیں، اس لیے ان کی شاعری بناوٹی نہیں، بلکہ اصلیت اور فطری انسانی جذبات سے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے علاقہ سے دور رہ کر بھی انھوں نے نئے مکانوں میں اپنے اسٹائل کو نہیں تبدیل کیا لہٰذا ان کا اسلوب اور طرزِ ادا ہر جگہ نمایاں رہا ہے۔

یہ شعری سرمایہ تین سو سال کی مدّت پر محیط ہے، اس لیے اس مکان میں نئی کھڑکیاں اور نئے سائبان تو دکھائی دیں گے، وقت کے ساتھ زبان اور تراکیب کی تبدیلیاں بھی ملیں گی مگر اپنی بنیاد کے ساتھ ہر عصر کی روح ان کی شاعری میں کارفرما رہی ہے۔ بہرحال پٹھانوں کی شاعری میں ان کی اپنی جھلک نظر آئے گی، ان کا اپنا وجود دکھائی دے گا اور ان کا رنگ دوسروں سے مختلف نظر آئے گا، اپنے پورے تشخص کے ساتھ۔

آج سے پونے تین سو سال پہلے صوبہ سرحد کے ایک صوفی شاعر کا رنگ اردو میں دیکھیں جو اصل میں پشتو کا گرانقدر شاعر ہے۔ اُس عہد کی اردو شاعری میں اس کا منفرد مقام ہے۔

بوصل تو مارا کجا ہات ہے
کہ وصل تو خیلے بڑی بات ہے
بہ کوئے تو گفتم کہ مسکن کنم
ولے کے مرا ایں دراجات ہے
خمِ زلفِ تو گوشۂ ابر داں
دلم را عجائب مقامات ہے
مکن پیش من وصف خورشید و ماہ
کہ از حسنتِ ایں کم علامات ہے
ہمے دادی دشنام وگالی مرا
بسویم ہمیں از تو سوغات ہے

نگاہت نہ امروز خونم بریخت
کہ دائم ترا ہچوں عادات ہے
زآغوش رحمان مروبا رقیب
کہ ایں سفلہ بد خوئی و بد ذات ہے

اسی طرح برہان خاں جس کی پیدائش ۱۷۲۱ء ہے، آخور ضلع کوہاٹ کا رہنے والا تھا۔ شاہجہاں آباد (دہلی) میں اُردوئے معلّٰی کا ماہر تھا۔ برہان خاں نے یہ مہارت اپنے صوبہ سرحد ہی میں حاصل کی اور ایک پٹھان سپاہی کو گرانقدر مشاہرہ پر اسی لیے رکھا گیا ہوگا کہ وہ اردو کا ماہر تھا اور دہلی کو ایسے ماہر زبان اردو کی ضرورت تھی جو دہلی کے اس بچہ کو گل کتری سکھا سکے۔ (دیوان آفریدی بحوالہ ''اٹک کے اس پار'' فارغ بخاری)

قاسم علی خاں آفریدی کا دیوان ۱۸۲۰ء کا ہے۔ اس کے اشعار میں سلاست وروانی ہے۔

طفلگی جاتی رہی، رخصت جوانی ہوگئی — موسمِ پیری میں اے کمبخت نیک اطوار ہو
ازل سے تا ابتک آفریدی ساتھ ہے اس کے — میانِ دوستاں صاحب سلامت ہوتو ایسی ہو

....

اس شوخ کے جب گھر سے اقدام نکلتے ہیں — تب قتل کے عاشق کے اعلام نکلتے ہیں
وہ آپ دکھانے کو سورج مجھے آتا ہے — جب اپنی نحوست کے ایام نکلتے ہیں
وحدت کا تماشا ہی کثرت کے مظاہر ہیں — آغاز سے ہر شے کے انجام نکلتے ہیں

....

کسی سے میں تیری وصلت کی التجا نہ کروں — مروں پر شک، پہ اظہار مدعا نہ کروں
ہوا ہوں سادہ رُخوں سے میں اس قدر بیزار — کہ آئینہ پہ بھی میں چشم اپنی وا نہ کروں

قاسم علی خاں آفریدی جو فرخ آباد میں کچھ دن رہا، اس کی بربادی پر اپنے پشتو کلام میں کہتا ہے۔ (اس کا پشتو دیوان رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔)

ترجمہ:

اب یہاں (فرخ آباد) انگریز کا طبل اور بگل بجتا ہے

افسوس نصاریٰ فرخ آباد کے حاکم ہو گئے اور پٹھانوں کے ہاتھ سے حکومت نکل گئی

اب انگریز فرخ آباد میں کرسی عدالت پر بیٹھا ہے

اب اہلِ ہند غیرت اور حمیت کی باتیں کیا کریں گے

قاسم علی خاں آفریدی نے دکن میں کچھ وقت گذارا ہے اسی لیے اُس کی زبان پر دکنی کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے۔ آفریدی کے دیوان میں دکنی زبان کے نمونے بڑی تعداد میں مل جائیں گے۔

قاسم علی خاں آفریدی کے عہد کا ایک اور شاعر ہے جس کا تعلق سرحد سے ہے۔ مولوی محمد عثمان قیس بن حافظ غلام محمد شاہ ابن شرف الدین خاں باجوری تلمیذ غیاث الدین عزت مصنف غیاث اللغات فارسی، ہندی اور عربی کا بنید عالم تینوں زبانوں کا شاعر، قصائد بدر السجاد اور گلگونہ اکبر کی شرح بھی اردو میں لکھی۔ ۱۸۲۸ء میں زخمی ہو کر ۶۷ برس کی عمر میں جامِ شہادت نوش کیا۔ قطعہ تاریخ حبیب احمد سوزاں نے کہا ''آواز در فتاد کہ عثماں شہید شد''

نمونہ کلام ۔

کچھ ایسے مرتبہ والا مرا وہ شاہ ذی جاہ ہے

کہ ادنیٰ چاکر اس کا باج گیر حاکم تبت

ملک کرتے ہیں ذکر اس کا، فلک کرتا ہے فکر اس کا

قضا اس کی طلب جو ہے قدر حاضر پئے منزلت

....

رُخ پر نور سے گیسو نہ ہٹے آج تلک

مجھ سیہ بخت کی قسمت میں سحر ہو نہ سکی

معز اللہ خاں مہمند اورنگ زیب کے عہد کا شاعر ہے۔ شاہجہاں کے عہد میں اس کے بزرگوں کو "ارباب" کا خطاب ملا تھا، پشتو اور فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتا تھا جسے وہ ہندوستانی کہتا تھا۔ اُردو میں افغان تخلص اختیار کیا ہے۔ اُردو میں اس کا کلام زیادہ نہیں ہے۔ سات غزلیں اور ایک مخمس ہے[1]۔ نمونۂ کلام اُردو۔

آج پیتم مرا خماری ہے | قتل ہونے کی کس کی باری ہے
میں جدا جل سوں[2] یوں نہ ہووے گا | جیسے مجھ بن تو بے قراری ہے
لال پنیہ[3] پیائے باندھا آج | یہ میرے قتل کی تیاری ہے

....

مجھ کو نہ زاہد سے صلح، نہ برہمن سے عناد
میں غلام اس کا ہوں جا پاک ہووے اعتقاد
جس کے دیوان میں دو مصرع بھواں کے فرد کے تھے
اب تو چار ابرو میں پایا ہے رباعی کا سواد
خاک پڑتی سر اوپر ہے سرکشوں کے عیب میں
گر یقیں کس کو نہیں تو دیکھ لیوے گرد باد
دیکھ کر تجھ، حسن کوں قاضی بھی مفتی بھی دیوے دل
عاشق کی شرع میں کیا پیش جاوے اعتقاد
انکھیاں کے دیکھیے "افغان" بیچارہ دل گیا
عشق کی نگری میں چھوٹے چور، جا پکڑے ہیں ساد

---

[1] پشتو ادب کا تعارف۔ عبدالرؤف خاں نوشہری
[2] مچھلی
[3] ڈاکو یا چور منہ چھپانے کے لئے جو کپڑا ڈالتے ہیں یا جلاد

شاعر کا تعلق زمان و مکان کی قیود سے ہمیشہ آزاد رہتا ہے۔ اس کا خلوص، احساس اور ادراک عالمگیر رفعتوں کو چھوتا ہوا ہر دور میں تر و تازہ دکھائی دیتا ہے۔ تلوار کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں، آج اس ایٹمی دور میں بھی اس کی حیثیت مسلم ہے اور ہر فوجی پریڈ میں وہی آگے رہتی ہے لیکن مقام شعر و شاعری بھی اتنا ہی لافانی ہے۔ پٹھان شاعروں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ میدانِ کارزار کے بھی مجاہد تھے۔ انھوں نے شجاعت و مردانگی کے جوہر بھی دکھائے اور اپنے قلم سے گل بوٹے بھی کھلائے اور آج اُن کی مردانگی کے جوہر بھی اُن کے قلم ہی کی بدولت زندہ و تابندہ ہیں۔ ان کا اپنا اسلوب ہے، اپنی طرزِ ادا ہے جس نے اُن کے کارناموں کو محفوظ رکھا ہے، لیکن ان سب کے لیے اصل حیثیت صلاحیت کو حاصل ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ غم یا محبت سے شاعری میں جان آتی ہے، کتنے ہی محبت کرنے والے ناکامی محبت اور محبوب کی بے وفائی کا مزہ چکھنے والے ملیں گے جو ایک مصرع موزوں نہیں کر سکتے اور کتنی ہی غم زدہ مائیں ہیں جو ایک مصرع موزوں نہیں کر سکتیں، شاعری اور انشاء پردازی ایک الگ جوہر ہے جو سب کو نہیں ملتا، کچھ لوگ شراب پیتے ہوں گے، مگر وہ شعری صلاحیت نہیں رکھتے۔ شراب سے شاعر نہیں بنتے۔

ملیح آباد کے گاؤں خالصپور میں ہمارے ایک عزیز تھے جو لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ ان کے اجداد کا تعلق افغانستان کے علزئی قبیلہ سے تھا، محمد یوسف خاں ہندوستان آنے والے قبیلہ کے سردار تھے جن کی حکومت ایران و قندھار پر تھی، باہمی جنگ کی وجہ سے پھوٹ کا شکار ہو گئے، اس خانہ جنگی سے بنی عمام یعنی شاہ محمود شاہ اشرف اور شاہ حسین بن میرویس عرف حاجی میر خاں تاجدار قندھار آپسی جدال و قتال میں لگے ہوئے تھے، نادر جو ایک اولوالعزم راہزن تھا اُس نے اُس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اُن کے علاقے بھی چھین لیے، جس کے نتیجہ میں شاہزادہ محمد یوسف خاں اپنی مستورات، غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ ہندوستان چلے

آئے۔ جب نادر کے خلاف شورش ہوئی تو عبدالوہاب خاں نے اپنی تلوار سے نادر کے دو ٹکڑے کر دیئے پھر اپنے والد کی خدمت میں وہ بھی آگئے اور کہا ؎

بامراد آمدم بہ حضرت تو   سر ظالم بریدہ آمدہ ام

محمد یوسف خاں کے چوتھے فرزند عبدالرحمٰن خاں قندھاری کے (تاریخ اودھ و بکسر بہار) بڑے کارنامے ہیں اور شاید اُن کی تصویر قصر بکنگھم میں بھی آویزاں ہے۔ ان کے پوتے فضل خاں فضل خالصپوری میں شاعری کا خداداد ملکہ موجود تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ سے منتقل ہو کر خالصپور ہی میں قیام کیا۔ جب شاعری کا حملہ ہوا تو ایک منشی رکھا جو اُن کے اشعار لکھا کرتا تھا۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی، کہتے ہیں ؎

وہ دنیا تھی جہاں تم روک لیتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سننا پڑے گی داستاں میری

اسی طرح حضور پُر نور علیہ السلام کی تعریف (نعت میں) یوں کرتے ہیں ؎

نہ تھا جس میں ذرا کینہ وہ سینہ تھا محمدؐ کا
زرِ اسرار حق سے پُر دفینہ تھا محمدؐ کا
شب معراج بامِ لامکاں پر چڑھ گئے دم میں
جسے سب عرش کہتے ہیں وہ زینہ تھا محمدؐ کا
قسم اللہ کی تھا بس عجب خلقِ عظیم اُن کا
نصیحت نیک کرنے کا قرینہ تھا محمدؐ کا
گروہ صوفیاء کے اب تلک تھوڑا ہے سینوں میں
جو ہے علم لدُنی وہ خزینہ تھا محمدؐ کا

اسی طرح فضلؔ کی غزلوں میں صالح جذبات کا اظہار ملتا ہے اور یہ سب کچھ منحصر ہے ان کی صلاحیت پر۔

اِن آنکھوں نے دیکھے جواں کیسے کیسے — ہوئے اس جہاں سے رواں کیسے کیسے
لڑکپن سے اب تک ان آنکھوں کے آگے — ہوئے انقلابِ جہاں کیسے کیسے
ہے افسوس، افسوس فضلؔ اس جہاں سے — گئے خاک میں گلرخاں کیسے کیسے

....

تیری محفل میں اگر ہوگا رقیبوں کا گذر — دیکھنا چلتی ہے کیسی اے صنم تلوار آج
یوں گر آتشِ ہجراں سے وہ ہم کو جلائیں گے — تو ہم بھی جل کے پھر کریں گے معشوقِ دگر پیدا

فضلؔ کے یہاں دُنیا کی بے ثباتی یاس انگیز نہیں بلکہ سوالیہ نشان ہے اور وہ قوم سے سوال کرتا ہے کہ وہ طنطنے اور عظمتیں کیا ہوئیں؟ وقت کی قدر و قیمت کو یوں بیان کرتا ہے۔

کل جو تختِ سلطنت پر بیٹھ کر کرتے تھے حکم — آہ وہ زیرِ زمیں تنہا پڑے سوتے ہیں آج
زندگی میں جو کہ بے مشعل نہ چلتے تھے کبھی — اب نظر آتا نہیں اس کے سرِ مدفن چراغ
دیکھا تھا پیشتر جسے ہم نے بہار میں — بادِ خزاں بتا وہ گلستاں کہاں گیا

عمر رواں، رواں ہے ہر لحہ اس طرح
گھوڑا دواں ہو جیسے کسی شہسوار کا

انگریزی اقتدار کے ساتھ سازشوں کا جو دور دورہ تھا اُن سے یہ پٹھان شاعر ان پڑھ ہونے کے باوجود غافل نہ تھا۔

صیاد نے گلچیں کو ملایا ہے غرض سے — بلبل سے کہو چھوڑ دے گلزار کا اخلاص
اے بلبلو چمن میں ہے صیاد گھات میں — پیاسا تمہارے خون کا ہے باغباں تلک

خونِ ناحق کے اثر کا ذکر یوں کرتا ہے ۔

ہوگئی تو ایک دم میں گھل اور جل کر فنا
خونِ پروانہ کی تو نے دیکھ لی تاثیر شمع

اپنے ماضی کی یاد کو یوں سینہ سے لگاتا ہے ۔

صیّاد عندلیب کو بہلائے گر چہ لاکھ — بھولے نہ وہ قفس میں گلستاں کسی طرح

انگریزوں نے جو مظالم کیے تھے اُن کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

اسیر کر کے عنادل کو کس غضب سے فضل — بہارِ باغ کو کر دیتا ہے خزاں صیاد
نہ پوچھ تجھ سے جو پہنچا ہے بلبلوں کو ملال — بیاں کروں میں کہاں تک یہ داستاں صیّاد
لکھا قسمت میں تو اپنی یہاں صیّاد کا گھر ہے — بلا سے میری اے مالی بہار آئی گلستاں پر

لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو جائے اور ظلم و جبر کی حد نہ رہے تو ۔

کہے دیتا ہوں اب تم سے میں زنداں کے نگہبانو — جنوں زوروں پہ ہے اپنا ارادہ ہے بیاباں کا
توڑ ڈالے گا سلاسل کو بہار آنے تو دو — شورِ مستی ہوگا ظاہر میرے سے اب دیکھنا

غلامی میں وطن کی محبت کی جگہ مجنونانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔

دیکھا تھا پیشتر جسے ہم نے بہار میں — بادِ خزاں بتا وہ گلستاں کہاں گیا
کل جو تختِ سلطنت پر بیٹھ کر کرتے تھے حکم — آہ وہ زیرِ زمیں تنہا پڑے سوتے ہیں آج
زندگی میں جو کہ بے مشعل نہ چلتے تھے کبھی — اب نظر آتا نہیں اس کے سرِ مدفن چراغ
عبث ہو پوچھتے نام و نشاں میرے وطن کا تم — کہیں بھی یاد رہتا وحشیوں کو ہے نشاں گھر کا

غزل کی دُنیا میں پردہ کی بات کرتا ہے معشوق کی اداؤں کی بھی اور اس کے رُخ و ابرو کی بھی ۔

سیر کو باغ کی وہ پردہ نشیں آتا ہے — ابھی اے بلبلو ہو جاؤ چمن کے باہر

جو طفلی ہی سے اپنے حسن پر اترائے جاتے ہیں
نشاں ان میں ابھی سے دلبری کے پائے جاتے ہیں
ہمارے قتل کو بس گردشِ ابرو ہی کافی ہیں
سنان و خنجر و پیکاں یہ کیوں منگوائے جاتے ہیں

صاف ستھری زندگی اور دھوکہ دہی سے نفرت کا اظہار یوں کرتا ہے۔

نشانِ پیری کے ڈھانکنے کو خضاب ہم لے کے کیا کریں گے
یہ ایسا دھوکہ کا جھوٹا رنگِ شباب ہم لے کے کیا کریں گے
نہ ساقی و مُل، نہ باغ و بلبل، نہ سرو سنبل، نہ غنچہ و گل
فلک پہ تیرا بغیر باراں سحاب ہم لے کے کیا کریں گے

اس کے پیچھے صرف صلاحیت ہے۔ باصلاحیت انسان کو دھکیلنے یا کھینچنے کی ضرورت نہیں پڑتی، وہ خود نمودار ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ ایک بے صلاحیت انسان ساری دُنیا گھوم کر بھی جو نہیں دیکھ پاتا، باصلاحیت وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے دیکھ لیتا ہے۔ اگر صلاحیت کا تعلق تعلیم سے ہوتا تو فضل میں یہ خوبی کیسے پیدا ہوتی؟ کتنے ہی عالم و فاضل اور بے پناہ علم و مطالعہ رکھنے والے ایک مصرع بھی موزوں نہیں کر سکتے، بہر حال یہ علم، علم لدنی ہے۔ اس کا تعلق تعلیم و ریاضت اور ذہانت سے نہیں ہے اس لیے کہ کتنے ہی ذہین لوگ اس نعمت سے محروم ہیں۔

اگر کسی ذہین انسان میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے تو اس کے قلم سے شاہکار تخلیقات صفحۂ قرطاس پر نمودار ہو جاتی ہیں، لیکن اگر یہ نہ ہو تو ان کی دانشوری ایک مصرع اور سطر کی محتاج ہو جاتی ہے۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس کو امیر مینائی نے لکھا ہے کہ رامپور میں مشاعرے ہوا کرتے تھے، مرزا غالبؔ ان مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے،

نواب رامپور کے منہ لگے ایک تک بند شاعر عبدالرزاق خاں تھے۔ مشاعرہ کا آغاز ان ہی کے اشعار سے ہوتا تھا، اتفاق سے ایک بار عبدالرزاق نے ایک شعر پڑھ دیا تو غالبؔ نے اپنی غزل پھاڑ دی اور کہا بس مشاعرہ ختم ہو گیا، وہ شعر تھا۔

وہ جو پہلو سے درد کچھ ایسا اُٹھا　　　　تھام کے دل کو کئی بار بیٹھا اُٹھا

اس میں عبدالرزاق کی صلاحیت اور غالبؔ کی شاعرانہ شرافت دونوں کا دخل ہے ورنہ کون کس کو مانتا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جھونپڑوں میں جنم لینے والے اور عسرت و تنگدستی میں زندگی گذارنے والوں کے نغمات ہمیشہ دولت مندوں کے ایوانوں میں گونجتے ہیں۔ اس صلاحیت کے سربستہ راز کو کوئی نہیں جانتا، یہ ضمیر کی گہرائیوں سے، حوصلہ میں، ڈر اور خوف میں سامنے آتے ہیں، اس کا تعلق بدقسمتی سے ہے یا خوش قسمتی سے تعین کرنا مشکل ہے، ہر رگڑ سے شعلہ نکلتا ہے، پتھر ٹکراتے ہیں تو آگ نکلتی ہے مگر ہر پتھر میں یہ خوبی نہیں ہوتی۔ دُنیا میں جب جنگ ہوتی ہے تو آبادی تو نہیں بڑھتی مگر بہادروں کو ضرور جنم دیتی ہے۔ افغانستان خاص طور پر صدیوں سے اس کا جیتا جاگتا نمونہ ہے جس کا تعلق ان کی شجاعانہ صلاحیت سے ہے مگر صلاحیتِ شاعرانہ یا نثر نگاری آخر کہاں سے آتی ہے کوئی نہیں بتا سکتا! مگر یہ ایک پُراسرار اور بے بس کر دینے والی طاقت کا نام ہے۔

خود مجھ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ پٹھانوں پر قلم اُٹھانے کا رُجحان قومی عصبیت کو پیدا کرتا ہے، میں اُنھیں بتاتا ہوں کہ کسی قوم کے کارناموں پر پڑی دھول کو صاف کر کے اس کے جوہرِ نایاب کو ظاہر کرنا عصبیت نہیں، اس کا تعلق ایک خواب سے ہے جس میں ایک جنگی ماحول میں میں نے لوگوں کو پٹھان پٹھان پکارتے سنا تو یہ سوچنے لگا کہ کیا صرف ایک جنگجو اور لڑاکا قوم

اتنی مدت تک حکمراں رہ سکتی ہے اور کیا اعلیٰ اقدار اور فکر و عقیدہ کے بغیر کوئی قوم طویل مدت تک اپنے فکری دشمنوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس سوال نے مجھے پٹھانوں کی شعری و ادبی صلاحیت کو پرکھنے کی طرف مائل کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ اُن کا مرکز عمل زندگی کا میدان ہے اور مرکزی کردار انسان کی ذات ہے۔ انسانی زندگی کے دو بنیادی جذبات نفرت اور محبت، بزدلی اور بہادری، نیکی اور بدی، مفاد پرستی اور خلوص و قربانی ہیں۔ افغانوں کے یہاں ان ہی کے درمیان پیکار و کشمکش ہے، ان کی زندگی ایک مثلث کے گرد گھومتی ہے اور بامقصد وجود ہے حصولِ مقصد کے لیے خود کو فنا کر دینا ہی کامیابی کی دلیل اور وہ نصب العین ہے جس کے لیے وہ اپنے وجود اور کامیابی سے ہمکنار ہونے کے تمنائی رہتے ہیں اس لیے اس قوم کی ساری صلاحیتوں کا مرکز بھی ان ہی کے گرد گھومتا ہے، اسی لیے ان کے گیت اور نغمات اپنے ہوتے ہیں جس میں گرمیٔ عشق بھی ہوتی ہے، آتشِ سوزاں بھی، محبوب کے آنسو بھی، بہادروں کی للکار بھی اور اپنے وجود کے لیے جنگ و پیکار بھی۔

اس وجود کی بقا کے لیے زندگی کیسے جان آفریں کے سپرد کی جاتی ہے جسے دیکھنا ہو وہ پٹھان دیس کو دیکھے، افغانستان کے طول وارض کو دیکھے۔ اس کی تاریخ کا مطالعہ کر کے اور ان کے نغمات کا جائزہ لے تو پتہ چلے گا کہ یہ قوم کیسے مر کر جینا جانتی ہے۔ برصغیر میں خوشحال خان خٹک کی زندگی کا مطالعہ کریں، حوصلہ مند (گھوڑوں کے تاجر) بہلول لودی کو دیکھیں اور شیر شاہ سلطان الہند کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں کہ کس طرح اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بنیاد پر علم وادب اور تختِ سلطنت تک جا پہنچے۔

صلاحیت کے ساتھ ہی کاوش بھی بڑی چیز ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ دراصل اس محنت سے تعلق رکھتی ہے جسے ایک نوجوان اپنے خون پسینہ سے کما کر اپنے

مضبوط ہاتھوں پر ناز کر کے خوش ہوتا ہے اور وہ رقم اس کی اپنی ہوتی ہے۔ اگر شاعر نے اپنی پوری محنت اور صلاحیت کو بروئے کار لاکر کوئی شعر کہا ہے تو اس کی قدر و قیمت سامعین یا قارئین کے ساتھ ہی خود قلمکار کی نگاہوں میں بھی بڑھ جاتی ہے۔ اگر صرف صلاحیت کی بنیاد پر بغیر کاوش کے الفاظ موزوں کر دیئے تو بھی وہ اثر پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے گہرے جذبات، کاوش اور صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ گویا ایک سمندر ہے جس میں سیپیاں نکال کر ان کے سینوں کو چاک کر کے موتی تلاش کرنا ہے۔ اس کے لیے ہمت اور صبر و استقلال کی بے پناہ صلاحیت درکار ہوتی ہے۔

صلاحیت و کاوش اور محنت کے ساتھ خلوص اس کی روح ہے، جس کے بغیر شعر میں جان پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہ خلوص اپنے وجود، مقاصد اور دوسروں سے بھی ہوں گے اِس طرح جو تخلیق اُبھرے گی وہ عزم و حوصلہ سے بھی بھرپور ہوگی اور لوگوں کے لیے اس میں کشش و جاذبیت بھی دکھائی دے گی۔

اس ارض کا تحفۂ خلافت ہو قبول　　　فردوس میں اے گناہ کرنے والے

ان کا تصوّر خدا عجمی تصورات سے پاک ہے۔ انسان کبھی خدا نہیں ہوسکتا۔ کبھی اپنی خودی اور روحانیت کو بلند کر کے اس میں سما نہیں سکتا، آدمی انا الحق نہیں ہوسکتا۔ یہ عجمی اور برہمنی اندازِ فکر ہے۔ منکسر ہونا شان بندگی کی علامت ہے، لیکن انسانیت کے دائرہ سے نکل کر اگر الوہیت کا تصوّر اس میں سما جائے تو وہ شیطان بن جاتا ہے۔

دل ہوتا ہے رو برو گاہے گاہے　　　رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے

....

اس ڈر سے کہیں خودی نہ بن جائے خدا　　　کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

روح کو بیدار کرتی ہے بیاباں کی ہوا　　　دُور ہوتی ہے خودی سینہ میں آتا ہے خدا

رونے میں جو لذت ہے تو آہوں میں مزا ہے
اے روح خودی چھوڑ کہ نزدیک خدا ہے

دیتا ہے کسے شیخ جہنم کی وعید
ہے سینۂ شرک میں قلبِ توحید

اللہ ری بانیان ادیان کی آب
اُترا نہیں اب تک ان کا دریائے شباب

یہ ان کے ہی انفاس کی ہے سخت گرہ
ٹوٹے نہیں آج تک مذاہب کے حباب

غیرت اسلام کو اب جوش آنا چاہیے
خون افغانی کے کچھ جوہر دکھانا چاہیے

شاہوں کے سروں میں تاج گراں سے درد سا اکثر رہتا ہے
جو اہلِ صفا ہیں اُن کے دل میں نور کا چشمہ بہتا ہے

شاعر اور اَدیب کے لیے اصل چیز ہے سچائی، خلوص، صداقت اور جرأتِ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ امام کو عاقل ہونا چاہیے، کچھ کہتے ہیں جری ہونا چاہیے، مگر شاعر و ادیب میں یہ دونوں خوبیاں ہونی چاہئیں اور ان دونوں خوبیوں کا جوہر ہے صداقت۔ جھوٹ اور سچ میں مقابلہ کا انجام یہ ہے کہ جھوٹ خود اقبالی مجرم ہے، زمیں پر اسی کی حکمرانی ہے، اس کے پرستار زیادہ ہیں، زمیں پر سب نے جھوٹ کا استقبال کیا اور سچ کے لیے کہا: تمہاری وجہ سے سارے مصائب آتے ہیں، شاعر و ادیب قید ہوتے ہیں، کتنے ہی بہادر موت کی آغوش میں عزتِ نفس کی خاطر چلے جاتے ہیں مگر جب صداقت بولی کہ زمیں کی سیر ہو چکی پہاڑوں پر چلیں، افغان دیس کی سیر کریں اس لیے کہ پہاڑوں پر سورماؤں کے مسکن ہیں، ابدی صداقتیں ہیں، ادیبوں، شاعروں، حکماء اور پیغمبروں کے لازوال پیغامات ہیں، جہاں زمیں کی حقیر فکر اور کمزور و بودی دلیلیں نہیں چلتیں تو جھوٹ بولا: میرا مسکن تو زمین تک ہے جہاں گھوروں پر کوّے چونچیں مارتے ہیں، پہاڑوں پر تو شاہین کی دُنیا ہے۔ وہاں ذلیل خواہشوں والے انسان نہیں رہتے، وہ بہادروں کی جگہ ہے، وہ تلواروں کی دُنیا ہے، شراب و کباب کی نہیں، میں تو بزدلوں کی دُنیا کا ساتھی ہوں اور

میری دُنیا وسیع ہے۔ بلندیوں پر رہنے والے کتنے لوگ ہیں؟ بہت کم۔

صداقت نے کہا: شاعر ان ہی کی تعریف کرتے ہیں، بہادروں کی شان میں ان کے بہترین اشعار وجود میں آتے ہیں اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔
کسی حکمراں کے ظلم کے خلاف ایک شاعر نے کچھ اشعار کہے جسے پڑھ کر حکمراں تلملا اُٹھا۔ اس نے شاعر کی گرفتاری کا حکم دیا، مگر یہ پتہ نہ چلا کہ وہ کون شاعر تھا۔ چنانچہ تمام شاعروں کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ پھر وہ حاکم قید خانہ میں ان کے درمیان پہنچا اور اپنی شان میں قصائد کہنے کی فرمائش کی۔ زیادہ تر شاعروں نے اس کی تعریف میں اشعار کہے انھیں تو چھوڑ دیا گیا۔ صرف تین شاعروں نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ ان کے لیے آگ کے تین الاؤ جلائے گئے۔ دونوں الاؤ دیکھ کر حاکم کی شان میں گنگنانے لگے، انھیں بھی چھوڑ دیا گیا، تیسرے اور آخری کو باندھ کر آگ کے الاؤ کی طرف لے جانے کا حکم دیا تو اس نے وہی اشعار پڑھنا شروع کردیے جو سب کی گرفتاری کا سبب بنے تھے۔ حاکم نے وہ اشعار سنتے ہی سپاہیوں کو حکم دیا اِسے فوراً رہا کردو، میں اپنے بہادر، سچے اور جری شاعر کو موت کی سزا نہیں دے سکتا، یہی تو میرے ملک کا حقیقی شاعر ہے۔
حقیقی اور سچی شاعری کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ شاعر کے بعد بھی زندہ رہے گی، اس کا کلام اگر آگ کے شعلوں کی نذر کردیا جائے یا اس پر پابندی لگادی جائے تب بھی وہ زندہ رہے گا۔
ایسی ہی ایک نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' ہے جس میں شاعرِ انقلاب نے انگریزوں کو مخاطب کر کے کہا ہے۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا

ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر

جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟

دستکاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونی داستاں بھی یاد ہے؟

تیسرے فاقے پہ اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہِ ظفر کے سامنے؟

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ

کیا کہا انصاف ہے انساں کا فرضِ اوّلین
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟

سائنس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے؟

ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین!!

اس نظم کو انگریز حاکموں نے ضبط کر لیا تو یہ برلن ریڈیو سے نشر ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کسی امام نے شاعری پر پابندی لگا دی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تو انہوں نے جواب دیا تا کہ جھوٹے شاعر غائب ہو جائیں اور حقیقی شاعر ہی رہ جائیں اس لیے کہ ایک حقیقی شاعر اس حکم کی پابندی نہیں کر سکتا۔ اصل میں جب اسلام کے بعد جاہلانہ نظام کا غلبہ ہوا تو طوطا مینا کی کہانیاں شروع ہو گئیں، ورنہ استقامت اور عزیمت کے کارناموں سے اسلام کی تاریخ بھری ہوئی ہے، جس جھوٹی کہانی سے عزم و ثبات کو ظاہر کیا گیا ہے اگر تاریخی حقائق کی روشنی میں امام احمد بن حنبل کا واقعہ بیان کر دیا جاتا تو اس کا اثر ہی دوسرا ہوتا مگر ہم خود حقیقت سے گھبراتے ہیں اور کہانیوں سے دل بہلاتے ہیں۔

شاعر اور ادیب کو مضبوط ارادہ کا مالک ہونا چاہیے، اس کے ہاتھ بھی مضبوط ہوں، مضبوط دل و دماغ کا مالک ہو، تاکہ سچ اور جھوٹ، کھرے اور کھوٹے کی پرکھ کے ساتھ ہی اس پر مضبوطی سے قائم بھی رہ سکے۔ اس کے ساتھ کسی بھی بات پر یقین کے لیے ذہانت اور علم کی بھی ضرورت ہے، مشاہدات کو یقین کی دولت سے مالا مال کرنے والی ذہانت اور علم ہے۔

صلاحیت کا مقابلہ آگ جیسا ہے لیکن ذہانت اس آگ کو قابو میں رکھتی ہے، حسن بھی ایک آگ کی مانند ہے، یہ بھی ذہانت سے قابو میں رکھا جاتا ہے، اس لیے صلاحیت کے لیے ذہانت اور ذہانت کے لیے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ تینوں شاعر و ادیب کو راہِ راست پر چلا کر رفعتوں سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ اسے تلون مزاج اور سستی شہرت سے بچاتی ہیں، مدہوشی اور ہوشمندی میں توازن پیدا کرتی ہیں، صداقت کے ساتھ احساسِ لطیف سے ہمکنار کرتی ہیں اور اس طرح شاعر و ادیب دنیا میں رہنے کا ڈھنگ اور اسے برتنے کا سلیقہ سیکھ لیتے ہیں، وہ پھول کو پھول اور کانٹے کو کانٹا کہہ کر مردانگی کی خوشگوار زندگی گذارتا ہے اور بلندیوں پر چڑھنے سے پہلے ان کی فصیلوں کی اونچائی کو نہیں ناپتا۔

پٹھانوں کی شاعری میں بھی بلندیوں، اعلیٰ اخلاقی قدروں، آسمانوں کو چھونے والی کامرانیوں کا ذکر ہے، اس میں ایک صحت مند فکر، طرح دار الفاظ، مضبوط اور مستحکم زاویۂ نگاہ، یقین کی پختگی، اندیشوں پر اطمینان کی فتح، شاہین اور زاغ و زغن کی پرواز میں فرق کا شعور موجود ہے۔

یقین ڈوب گیا تو گماں سے کیا ہوگا — زمیں سے جو نہ ہوا آسماں سے کیا ہوگا
جو سورما ہو تو چنگیز خاں سے ٹکر لو — فقط مذمتِ چنگیز خاں سے کیا ہوگا
ان آنسوؤں میں ڈبوئے بغیر تاج یزید — فقط حسینؑ پہ آہ و فغاں سے کیا ہوگا
فضا کے دوش کو بارود کی ضرورت ہے — شمیم گیسوئے عنبر فشاں سے کیا ہوگا
سنو، سنو کہ یہ گردوں سے آ رہی ہے صدا — کہ ذوالفقار سے بولو زباں سے کیا ہوگا

میں نے کوشش کی ہے کہ صحت مند ادبیات کو سامنے لا کر معاشرہ کو ایک نئی زندگی پر غور کرنے کی دعوت دوں، ادبی زاویوں کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کے دائرہ میں پیش کر کے اس بے راہ روی کے ادبی ماحول کو صحت مند بنا سکوں، آج جہل کی آندھیوں میں ہمارے علمی اور ادبی تناور درخت کی جڑیں ہل گئی ہیں لیکن ابھی یہ درخت سوکھا نہیں ہے اس لیے اس کی جڑوں پر صلاحیت کی نم مٹی اور علم و ذہانت کی آبیاری کر کے نئی کونپلیں پھوٹنے کا سامان فراہم کر دیا جائے۔

اس میں ایک قوم کی حوصلہ مندی بھی ہے، انسان دوستی بھی، جذبات کی شدت بھی ہے، جھرنوں کی روانی بھی، دریاؤں کا سکون بھی، دلوں کا قرار بھی، عظمت رفتہ بھی، حال کی پرچھائیاں بھی اور مستقبل کے لیے راہیں بھی۔ نہ کسی کے خلاف انتقامی جذبہ، نہ نفرت کی آگ، صرف اپنی بات اپنی داستانِ حیات، اپنی داخلی زندگی جس پر ہر زندگی کا پرتو اہلِ ہوس سے دور حسن و عشق کا نکھار، اپنی عظمتوں کا راگ، دوستوں کے لیے نور، دشمنوں کے لیے نار، غرض یہ کہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ اس میں کیا گیا ہے۔

عین ممکن ہے کہ بعض جملے بے ربط ہوں، ایسا بھی ممکن ہے کہ ان کو بار بار دہرایا گیا ہو مگر یہ تکرار تاکیدی ہے پھر بھی میرا اپنا دماغ اور آدھا دماغ قارئین کا مل کر آئندہ تخلیق میں ان کوتاہیوں کو دور کر سکتے ہیں۔ نفرت اور غصہ سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے میں نے اس قوم کے شعری مزاج کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام نہیں لیا بلکہ کسرنفسی اور شرافتِ نفس کا ثبوت دیا ہے۔ یہ شاعری پوری ایک قوم کی آواز ہے جسے تعصب کے تحت دبا دیا گیا تھا، اس آواز کو جسے تین سو برس سے کاغذوں کے انبار اور کتب خانوں میں دفن کر دیا گیا تھا میں قارئین کے سامنے فیصلے کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

پچھلی تین صدیاں صرف افغانوں کی رہی ہیں، بارہویں، تیرہویں اور چودہویں صدیاں بھی برصغیر میں ان ہی کی تھیں، اِدھر کچھ دنوں سے جو لوگ ''پدرم سلطان بود'' کے خلاف نعرے

بلند کررہے تھے، افغانستان میں افغان مجاہدین کی قوت ایمانی نے ان کو تجدید ایمان پر مجبور کردیا ہے اور ایک بار پھر وہ پٹھان ہونے پر فخر محسوس کرنے لگے ہیں، بے شمار راز شاعر وادیب منکشف کرتے تھے مگر یہ مجاہدوں کا دور ہے جن میں شاعر بھی ہیں، ادیب بھی، عالم بھی، اور سپاہی بھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ پٹھانوں کی علمی وادبی عظمتوں پر پڑے پردوں کو اُٹھادوں۔ پہلے دولھا ہی اپنی دلہن کا منہ دیکھتا ہے اس کے بعد دوسرے لوگوں کا نمبر آتا ہے، اب دوسروں کے دیکھنے کا نمبر آرہا ہے اور اس طرح وہ ان کی شاعری میں حسنِ فطرت، روحِ انسانی کی عظمت اور باطل طاقتوں کے خلاف ان کی نبرد آزمائی کا نظارہ کرسکیں گے۔

میری گذارش ہے کہ ان خیالات کو صرف اس لیے غلط نہ کہیں کہ وہ آپ کے خیالات نہیں ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ بازار میں ہر چیز کا ایک بھاؤ ہوتا ہے مگر خلوص ومحبت اور جرأت کو کسی ترازو میں تولا نہیں جاسکتا۔

میں نسلاً افغان ہوں، میری رگوں میں علیزئی قبیلہ کے سلیمان خیل اور ہوتک کے خون کے ساتھ ہی مادری سلسلہ سے آفریدی خون بھی ہے۔ میں نے بچپن میں پٹھانوں کی عظمت کے گیت سنے ہیں، کچھ پشتو کی آوازیں بھی صغرسنی میں کانوں میں گونجی ہیں، مگر میری زبان اردو ہے۔ اس کے بعد بھی پشتو سے محبت کرتا ہوں، وہ میرے عظیم بزرگوں کی زبان ہے، میں نے ملک کروڑ کے اشعار کو ترجمہ کے ساتھ پڑھا ہے جو فارسی میں کیا گیا ہے، میں نے احمد شاہ ابدالی کا پشتو دیوان بھی دیکھا ہے اور اسے آنکھوں سے لگایا ہے، رحمٰن بابا کے ترنم آمیز پشتو اشعار کی بہترین شیرینی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ فخرِ افغانان خوشحال خان خٹک بھی اپنے اشعار کی کھنک دار آواز کے ساتھ میرے خون کو گرمارہا ہے۔ عربی اور اُردو نثر وصحافت میں شعلہ وشبنم بکھیرنے والے عبدالرزاق خان معروف مولانا ملیح آبادی اور اُردو شاعری کے کوہِ سلیمان جوشؔ ملیح آبادی تو میرے اپنے ہی ہیں۔ اس طرح آفریدیوں کے قرار اور علیزیوں کی بے قراری کا

پیکر خان محمد عاطف کی ذات میں نمایاں ہے۔

پٹھانوں کی قوم تعداد میں تو بہت بڑی نہیں لیکن برصغیر کی تاریخ میں سب سے بڑی یہی ہے۔ اسلام کی شان وعظمت قرآن کے توانا وتندرست گھوڑوں کی ٹاپوں کی گونج آج بھی افغان شہسواروں کے وسیلہ سے سنی جارہی ہے۔ دانائے راز علامہ اقبالؔ نے سب سے زیادہ تعریف اسی قوم کی اپنی شاعری میں کی ہے، یہ زبان ایک لازوال دولت ہے اور پشتو کے بعد اردو زبان میں پٹھانوں کی تاریخ، ان کی شاعری، ان کی تفسیر اور تراجم قرآن موجود ہیں اور ان سب سے پٹھانوں نے اُردو زبان کو مالا مال کیا ہے اور برصغیر میں یہ پٹھانوں کی ہی زبان ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ برصغیر میں پٹھانوں نے اپنی اصل سے رشتہ نہیں توڑا۔ اپنی قومی روایات اور رسم ورواج سے وہ جڑے رہے، صرف ان کی زبان بدل گئی مگر خیالات نہیں بدلے، وہ فکری طور پر اپنی قوم کے وفادار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ادب زندہ رہا، اجنبی زمینوں پر کاشت کرنے کے باوجود بیج کو تبدیل نہیں کیا اور اس طرح انہوں نے اپنی قوم کے اصل خیالات کو بڑی پرُکاری سے شعروادب میں برتنے کا کام کر کے اپنے بزرگوں کی روایات کو زندہ رکھا اور دُنیا کو بتایا کہ ؎

صور بھی اپنے قدم کو ڈگمگا سکتا نہیں
ہم پٹھانوں کو کوئی نیچا دکھا سکتا نہیں

پروفیسر خان محمد عاطف

سابق صدر شعبۂ فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

اس حصہ میں دیگر علوم
سے متعلق پٹھانوں کا ذکر ہے۔ ان
میں سے کچھ نے شاعری نہیں کی
لیکن دیگر فنون میں اہم مقام کے
مالک ہیں، اس لئے انہیں شامل
کر دیا گیا۔

روزنامچہ

عبدالقادر خان

سے

دیوان اکبر شاہ فرصت

مجمع الکرامات

۴؍فروری ۱۹۷۱ء

تذکرہ کاملانِ رام پور

حافظ احمد علی خان شوقؔ

مولوی احمد خاں

مولوی احمد خاں ولد محمد عبداللہ خاں ابن حاجی محمد سعید خان تیراہی فقہ میں بہت مشہور تھے۔ ''متفرقات احمد'' فتاویٰ عربی دو جلدوں میں لکھی۔ فارسی میں رسالۂ فرائض وقانون طب مفردات۔ کلیات اور معالجات بھی لکھی۔ رام پور میں وفات پائی۔

انور امام

امام الدین خاں ولد غلام جیلانی خان انور، امامؔ تخلص۔ کتاب مجمع الکرامات فارسی، اپنی تصنیف میں اپنا حال بیان کرتے ہیں۔ مولوی غلام جیلانی خاں قوم افغان میں یوسف زئی تھے۔ احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں منصب سہ ہزاری پایا۔ آخر عمر میں نواب فیض اللہ خاں صاحب بہادر کے مصاحب رہے۔ عہد جوانی میں نواب ٹونک محمد امیر خاں بہادر کے یہاں ملازمت بھی کی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر گوئی کی قدرت پیدا ہوگئی۔ سب سے پہلا شعر حسب حال تھا۔

نقش ناز تو بجز حسرت دل دیگر نیست
گرچہ تصویر رخت بر سرزانو پیدا ست

تھوڑے دنوں کے بعد عربی اور پشتو میں بھی دستگاہ ہوگئی، فرصت کم تھی، پھر بھی دو برس کی مدت میں دو جلدیں دیوان فارسی اور تین مثنویاں اردو فارسی میں لکھیں۔ طبیعت کی جولانی دیکھ کر ان پانچوں تصانیف کو جن میں بیس ہزار اشعار تھے، رڈی کی نذر کر دیا اور از سر نو دیوان مرتب کرنے لگے۔ اردو میں ابتدا سے انور تخلص تھا۔ وہی قائم رکھا، فارسی میں امام تخلص اختیار کیا۔

قطعہ تاریخ ختم کتاب یہ ہے ؎

سال ایں نسخہ راہمیں جستند — قمر و آفتاب تا مریخ
پس ز لوح و قلم فرد خواندند — فیض درگاہ قطب در تاریخ ۱۲۳۱ھ

ملا بدرالدین

قوم افغان (روزنامچہ عبدالقادر خاں) فقہ اور اصول میں مداخلت تھی، تمام علمائے افاغنہ میں حسن تقریر میں مشہور تھے۔ ان کا زمانہ نواب فیض اللہ خاں کا زمانہ ہے (۱۱۸۸ھ، ۱۲۰۸ھ)

پیر بیرام خاں خٹک

نواب فیض اللہ خاں صاحب کے عہد میں خٹک رام پور آئے۔ آدمی مخیّر تھے، نہایت مالدار تھے۔ باون مساجد اور ایک سو کنویں بنوائے۔

مولوی حسین شاہ خان

تخلص نامیؔ، ولد کلو خاں، قوم پٹھان، مدرسہ عالیہ رام پور میں فارسی کے استاد تھے۔

مولوی حسن علی خاں

تخلص حسنؔ، ولد سید محمد خاں، قوم پٹھان، نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ عربی فارسی خوب جانتے تھے۔ دو بیوہ بہنیں صاحب اولاد تھیں، ان کی وجہ سے شادی نہیں کی۔ درس و تدریس ذریعہ معاش تھا۔

حکیم حیدر علی خاں حیدرؔ

حکیم حیدر علی خاں ولد میاں عبید شاہ قوم افغان ابازی گدوں مولانا میاں امیر شاہ کے حقیقی بھتیجے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ امیر مینائی کو دکھاتے تھے مگر نعت لکھتے تھے۔ دو بیٹے سلطان علی خاں اور حکیم سبحان علی خاں چھوڑے، سلطان علی کا انتقال ہوگیا۔ سبحان علی خان کے بیٹے نزاکت علی خاں شاعر بھی ہیں۔

شاہ عبدالواحد

قوم پٹھان، دہلی سے بریلی آکر مقیم ہوئے، وہاں سے بلاس پور ریاست رام پور میں آبادی سے قریب جانب شمال بھکرہ ندی کے کنارے قیام فرمایا۔ عالم بھی تھے، درویش بھی۔ جلال اس قدر تھا کہ لوگوں کو قریب جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ سید ابوالحسن سدا بہار خلیفہ تھے۔ اپنے ہاتھ

سے کھیتی کر کے کھاتے تھے، جو لوگ نذر پیش کرتے دوسروں کو دیتے۔ ۱۲۰۶ھ میں انتقال ہوا۔

مولوی عبدالحق خاں

تخلص حقی وصفا۔ ولد محمد افضل خاں ولد محمد ظریف خاں۔ قدرزی وکمال زئی ۱۲۷۸ھ میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ منطق، حکمت اور اصول فقہ مولوی حکیم نظر علی امروہوی سے پڑھا۔ شعروشاعری کا ذوق تھا۔ فارسی میں حقی اور اردو میں صفا تخلص تھا۔ دو دیوان نعت اور چار دیوان کلام عاشقانہ اردو میں ایک فارسی میں جمع کر چکے تھے۔ ۱۳۳۳ھ میں انتقال ہو گیا۔

مولوی عبدالرحمٰن خاں

ولد مولوی حاجی عبداللہ خاں ولد مولوی حاجی محمد سعید خاں تیراہی۔ فاضلِ بے بدل تھے۔ مولوی عبدالقادری خاں اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ ہر مجمع میں مباحثہ کرتے اور نکتہ بعد الوقوع بہت کہتے تھے۔ اولیاء اللہ میں شمار تھا۔ شاہ عبدالعزیز آپ کو فضیلت پناہ فضیلت مآب عزیز القدر محبت دستگاہ لکھا کرتے تھے۔ ۱۲۲۴ھ میں انتقال ہوا۔

حکیم عبدالرحمٰن خان عرف چھٹن خاں

تخلص خرم وبلیغ ولد حکیم مولوی محمد یوسف خان ولد حکیم مولوی فیاض خاں ساکن بلاسپور (رام پور) علوم عربی، فارسی اپنے والد سے پڑھا۔ لقب آپ کا ممتحن اطبائے یونانی ریاست جونا گڑھ ہے۔ تصانیف میں کتاب فیضان شفا مطبوعہ اور ابلیس نامہ منظوم اردو قلمی ہے۔

ملاّ عبدالرحیم خاں

ولد مولوی حاجی محمد سعید خاں تیراہی۔ آپ کے شاگرد ہندستان، افغانستان اور بخارا تک تھے۔ مولوی محمد عیاض مؤلف کتاب دستور المنتھی، مولوی عبداللہ بھوپالی، مولوی محمد حیات پنجابی، حافظ شبراتی رام پوری۔ مولوی محمد علی۔ مولوی جلال الدین۔ مولوی حافظ غلام حسین مولوی محمد نظام الدین خان مئوانی، مولوی عبدالعلی خاں، حکیم محمد اعظم خاں مؤلف اکسیر اعظم، مفتی سعداللہ، مولوی عالم علی مرادآبادی۔

مولوی فیض الحسن سہارنپوری

مولوی فیض الحسن پنجابی، مولوی فیض الحسن بنگالی وغیرہ۔ سکندر علی کو آپ کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ مولوی عبدالقادر خاں غمگین اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں گویا کتب درس حفظ ہیں۔ فنون ریاضی بھی جانتے تھے، بڑے پایہ کے عالم تھے۔ ایک کتاب مجمع التصحیح بزبان فارسی، دوسری کتاب رسالہ غائیۃ البیان کی شرح فارسی میں تصنیف کی۔ ستر برس کی عمر ہوئی۔ ۱۲۳۴ھ میں رام پور میں انتقال کیا۔

مولوی حکیم تفضّل حسین خاں ترقی

قوم پٹھان۔ محلہ عصمت خان کی املی میں رہتے تھے۔ ان کے بیٹے حکیم حافظ عزیز محمد خاں ہیں۔

مولوی حکیم عبدالرزاق خاں

تخلص شائق۔ ولد مولوی حکیم غلام اکبر خاں عرف کلو خان رام پور محلہ کھاری کنواں۔

۱۲۳۱ھ میں انتقال ہوا۔ احاطہ شاہ درگاہی صاحب میں دفن ہیں۔ اولاد نہیں ہے۔

ملا عبدالرزاق

قوم پٹھان ۱۲۱۴ھ میں زندہ تھے۔ مولوی عبدالقادر خاں اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں۔ یہ بزرگ فقیہ تھے مگر میں نے اس حالت میں دیکھا کہ شیخ فانی تھے۔

مولوی حاجی محمد عبدالرزاق خاں

ولد حکیم فیاض خاں ولد مولوی عبداللہ خاں اخوند۔ ۱۳۲۷ھ میں جونا گڑھ میں انتقال ہوا۔ آپ کے بھائی حکیم محمد یعقوب کے یہاں ان کی تصانیف تھیں۔

ترجمہ اردو عقائد النسفی تسہیل التصریف بزبان اردو۔ کلید پارسی گردان پارسی۔ تنبیہ القلوب منظوم اردو۔ رسالہ حواس وعقل تجوید الحروف درفن قرأت طبع ہوچکی ہیں۔ خواص الادویہ منظوم فارسی طب غریب نوازی قرابادین رزاقی۔

عبدالعلی خاں

ولد مولوی حاجی محمد سعید تیراہی۔ ۱۲۱۳ھ میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ علوم وفنون عربی میاں مدن اپنے والد، مفتی زبیر، اور مولوی غفران سے حاصل کی۔ سنا ہے رام پور میں مفتی بھی ہوگئے تھے، شاعری کا ذوق تھا۔ علی تخلص کرتے تھے۔ ایک شعر اردو میں یہ ہے ؎

علی نادِ علی کو حرز جاں کر
جو کچھ تجھ کو خدا کا خوف و ڈر ہے

عربی نظم میں اپنے بیٹے مولوی عبدالغنی خاں کو یوں مخاطب کیا ہے۔

فاجهد بطاعته واقصد بمرضه　　　واتبع ما عن القران مفهوم
واستغفر دنیا وحر سائده ابدا　　　ولا تقنط فانت مهد مرحوم

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مولوی عبدالقادر خاں علیگ کا غالبؔ سے مذاق

حکیم عبداللہ خاں عرف نوشہ خاں

تخلص فصیح ولد حکیم مولوی محمد یوسف خان ولد حکیم مولوی فیاض خان ساکن بلاس پور۔

مولوی غلام حضرت خاں

تخلص حاذقؔ ولد غلام حسین خاں، ۱۸۷۵ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ دو سال چار ماہ کی عمر میں مکتب جانا ہوا۔ دو سال میں قرآن شریف ختم کیا اور کتب فارسی شروع کیں۔ دس سال میں کچھ کتابیں ختم کرلیں۔ بیس سال کی عمر میں تمام درسیات ختم کر کے مدرس ہوئے۔ تیس سال کی عمر میں سحر حلال بہتر (۷۲) صفحہ کا ایک رسالہ فارسی غیر منقوط لکھا۔ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ دوسری کتاب لمعات الصواعق المعروف بہ مسدس حاذق ۱۹۰۶ء میں طبع کرائی۔ محاربات ترک واطالیہ نظم میں مسدس لکھی، شمشیر ترک سر بلقان اس کا تاریخی نام ہے۔

غلام محمد خاں ماہر

ولد ناصر خاں ولد نجابت خاں سالار زئی۔ ذی علم ذہین اور شاعر تھے۔ ان کا دیوان مرتب ہے اور حکیم تفضّل حسین خاں کے پاس موجود ہے۔ کلام پاکیزہ ہے۔

حصولِ صحبتِ منعم سے جز ضرر کیا ہو | کہ چاک باعث گوہر شکم صدف کا ہو
نہ تندرست ہوں نازک نفس دوائی سے | شکست جائے نہ چینی کی مومیائی سے

حافظ محمد نذیر

ابن حافظ حاجی محمد صدیق بن حافظ محمد ہاشم بن محمد الخیر علوی ساکن رام پور۔ نہایت متقی اور صالح تھے۔ ۱۲۸۹ھ میں کعبۃ اللہ گئے اور وہاں دواء الشفا شرح قصیدۂ بردہ نامی لکھی۔ ان کے بیٹے مولوی محمد بشیر خاں نے ۱۳۰۲ھ میں نولکشور پریس سے چھپوائی۔

محمد نبی خاں معجز

ولد محمد سردار خاں ولد خدایار خاں رسالدار قوم پٹھان ۱۲۶۰ھ کی تیرہویں یا چودہویں جمادی الاوّل کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ آپ سے ایک فرزند الطاف علی خاں تھے جو ۱۳۳۱ھ میں وفات پا گئے۔ تین پوتے ہیں جن میں بڑے کا نام محمد جعفر علی خاں ہے۔ فارسی، عربی اور دینیات میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔ بھوپال میں ملازم ہیں۔ اُردو کلام تذکرہ آثار الشعراء مطبوعہ بھوپال میں موجود ہے۔ (تذکرہ شعرائے بھوپال ۱۳)

حکیم مظہر احسن خاں

تخلص احسنؔ ولد حکیم مجتبیٰ خاں ولد حکیم محمود خان، رام پور میں پیدا ہوئے۔ فارسی و عربی کی تکمیل مولوی عبدالمجید خاں سید علی حسین اور مولوی نورالنبی سے کی۔ خط نسخ میں حافظ فیاض سے، نستعلیق میں میر عوض علی صاحب سے، خط گلزار اور غبار اپنی ایجاد تھی۔ ہفت قلم تھے، عروض وقافیہ میں مولوی جمال شاہ خاں اور منشی مظفر علی خاں اسیر کے شاگرد تھے۔ شاعری میں پہلے غالب پھر اسیرؔ سے اصلاح لینے لگے۔ عروض سیفی فارسی کی شرح اردو میں نہایت بسط سے لکھی، طبیب حاذق تھے، پیلی بھیت میں قیام تھا۔ ۱۳۰۲ھ پیلی بھیت سے ''خورشید آفاق'' نامی اردو ہفتہ وار اخبار نکالا۔ تصانیف طبع ہونے کی نوبت نہ آئی۔ ۱۵؍مارچ ۱۸۵۱ء میں ۴۷ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ اولاد میں کوئی عالم نہیں ہوا۔

معظم خاں عرف فقیر جی

قوم پٹھان شاہ آباد دروازہ میں رہتے تھے، گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ ایک بار ہردوار سے گھوڑے لے کر دہلی گئے، وہاں سید غلام حسین صاحب عرف خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ سے بیعت ہوکر خلافت پائی۔ گھوڑوں کی تجارت ترک کردی۔ ٹٹو پر غلہ لاکر بیچنے لگے۔ اسے بھی چھوڑ دیا اور بھینیں پالیں، خریدار کے سامنے بھینس لگانے سے پہلے برتن کو آگ پر رکھ کر خشک کرلیتے، اسے بھی ترک کردیا۔ گھاس چھیل کر بیچنے لگے، لیکن ہمیشہ جانماز اور مٹی کا برتن ساتھ رہتا، ایک روز گھاس چھیلتے چھیلتے یہ صدا آئی کہ کب تک مجھے قتل کروگے۔ اسے بھی چھوڑ دیا۔ شہر کے باہر چلے جاتے، کسی ضعیف مرد یا عورت کو بوجھ لاتے ہوئے دیکھتے تو خود اپنے

سر پر رکھ کر اس کا بوجھ پہنچا دیتے، پتھری کا مرض تھا، مولف انوار العارفین سے کہتے تھے کہ جو ریزہ پتھری کا نکلتا ہے اس میں بھی لذت محسوس ہوتی ہے۔ ان سے یہ واقعہ بھی بیان کیا کہ میں نے میاں حسن شاہ محدث کو کچھ نصیحت کی تھی۔ خواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا تو ایسا نیک ہے کہ ہماری اولاد کو نصیحت کرتا ہے، آپ کے بہت سے مرید تھے۔ حافظ محمد عمر خاں، شاہ جی نظیر محمد خان اور میاں حسن شاہ محدث آپ کے خلیفہ تھے۔ ۲۵ رجمادی الاولی ۱۲۶۷ھ کو انتقال ہوا۔ بیرون شاہ آباد دروازہ متصل روشن باغ سڑک سے قریب چھوٹے سے احاطہ میں دفن ہیں۔

ناصر خاں

صاحب تذکرہ تکملۃ الشعر لکھتے ہیں کہ ناصر خاں پسر اکڑ خاں قوم بونیروال محمد عمر خاں اکوزئی کے بھانجے تھے۔ حسنِ صورت و سیرت دونوں پائی تھی، ذہن صائب اور فکر مناسب بھی، اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ باوجود نومشقی کے مضامین خوب نکالتے تھے۔ اکثر باہم بیٹھ کر غزلیں کہا کرتے تھے، عین جوانی میں دق ہوگئی اور انتقال کیا۔ برسوں کی گردش میں بھی ایسا آدمی نہیں پیدا ہوسکتا۔

محمد ناصر خاں حشمت

کنز العابدین مسائل فقیہ اردو منظوم کتاب ۱۳۳۵ھ میں لکھی۔ اس کا خطبۂ حمد و نعت عربی میں ہے اور نثر فارسی میں۔ اپنی کتاب کے ماخذ میں ۷۵ کتابوں کے نام لکھے۔ دیباچہ میں اپنا اور والد کا نام لکھا، کل ابواب اور فصول کی تفصیل لکھی ہے۔

ابتداء کتاب

حمد کہتا ہوں تری اے ذوالجلال | ذات تیری لم یزل ہے لا یزال

کل شئی ھالك الا توئ | لیس فیھا مالك الا توئ

کرد پیدا ایں جہان وآں جہاں | نیز کل مخلوق دریک کن فکاں

نیست برخلقت مگر دانائے تو | ہم زفعل وصنعتش بینائے تو

تو ہے دانا جملہ اخفاؤ جلی | جو کہ کرتے ہیں گے جنّ و آدمی

بھید سب خلقت کا ہے تجھ پر عیاں | من چہ گویم اے علیم دوجہاں

خاتمہ[1]

اختتام اس کا ہوا اہل نجات | روز شنبہ کے بشہر شب برات

دوازدہ چھبیس سن میں اہل دین | اور نام اس کا ہے کنز العابدین

جو کوئی اس کو پڑھے اور یا لکھے | وہ دعا حق میں مصنف کے کرے

شیخ من عبدالاحد ذو برکت ست | اسم من ناصر تخلص حشمت ست

مصطفےٰ آباد جائے مسکنم | از آبا و اجداد آن متوطنم

[1] یہ کتاب قلمی ۸۵۲ صفحہ کی کتب خانہ ریاست رام پور میں موجود ہے۔

تذکرہ شعرائے جے پور

مؤلفہ احترام الدین احمد شاغلؔ ۱۹۵۸ء

افضلؔ

ابوالوفا کنیت۔ عبدالمجید خاں نام، ڈاکٹر زاہد خاں کے صاحبزادے نسباً ناغڑ افغان۔ اصل وطن قرولی اسٹیٹ۔ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور میٹرک پاس ہیں۔ اردو اعلیٰ قابلیت کا امتحان بھی راجپوتانہ سے پاس کیا۔ بلحاظ معلومات مبلغ علم بہت بلند ہے جو آپ کی ذاتی کوشش، عمیق و وسیع مطالعہ اور طبعی طور پر ذوق علمی کا نتیجہ ہے۔ فارسیت طبیعت میں رچ گئی ہے۔ صحت الفاظ اور محاورات پر خاص طور پر نظر رکھتے ہیں۔ حافظہ نہایت قوی ہے۔ اساتذہ کے صدہا اشعار بطور نظیر از بر ہیں۔

خود دار و مستغنی المزاج اور راسخ العزم انسان ہیں، خلیق و متواضع اور مخلص بھی ہیں مگر غیور وحساس بھی۔ احباب کی جانب سے ذرا سی فروگزاشت یا کم التفاتی آپ کی نظر میں بڑا مسئلہ اور اہم سوال بن جاتی۔

تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں جیمس آباد کے مدرسہ میں مدرس رہے۔ شاعری کا ذوق ۱۹۱۸ء سے ہوا مگر اُردو میں کم کہا اور فارسی میں کچھ زیادہ۔ ایک بار آپ مرزا مائل کی مزاج پرسی کے لئے سانبھر گئے جہاں وہ علیل تھے۔ مرزا صاحب نے آپ کو دیکھتے ہی یہ مطلع کہا۔

ادھر کو جو آنا تمہارا ہوا　　　مری زندگی کا سہارا ہوا

اور فرمائش کی کہ میں بھی اس زمین میں غزل لکھتا ہوں آپ بھی ضرور لکھئے۔ ''تارا'' قافیہ مخصوص کیا گیا۔ دوسرے روز آپ نے غزل سنائی، مرزا صاحب نے بھی کہہ لی۔ آپ نے اس قافیہ کو یوں باندھا۔

وہ بلبل ہوں ٹپکا جو آنسو مرا　　　گلستاں کی آنکھوں کا تارا ہوا

مرزا صاحب کا شعر تھا۔

شرر بار نالہ جو میرا گیا　　　فلک پر وہ دمدار تارا گیا

مرزا صاحب نے فیصلہ کیا کہ آپ کا قافیہ بڑھ گیا۔

فارسی میں آپ کو دقت پسند ہے اور اردو میں سلاست۔ ایک شعر درج ہے۔

غزل گوئی کہاں جے پور میں اب ہم کچھ جو کہتے ہیں
وہ اپنا مرثیہ یا نوحۂ مائل سمجھتے ہیں

ایمان

ایمان تخلص اور محمد علی خاں نام تھا۔ شکار پور ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ جے پور کی افواج میں ملازم تھے۔ طبعاً خوش اخلاق، آزاد منش، یار باش اور رنگین طبع واقع ہوئے تھے۔ پُر گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ رنگینیٔ طبع اپنا رنگ دکھا جاتی تھی۔ دیوان تقریباً مکمل تھا مگر پتہ نہیں کہیں ہے بھی یا نہیں۔ صاحب خم خانہ جاوید نے دو شعر درج کیے ہیں۔

مٹا دو ہمارے نشانِ لحد کو — نہ چھوڑو زمیں پر نشانی ہماری

مٹادیں تجھے دل سے کیا داغِ ہجراں — وہ پوچھیں گے کیا کی نشانی ہماری

کوشش کرنے پر چند غزلیں ملی ہیں، ان ہی میں سے چند اشعار بطور نمونہ درج کیے جا رہے ہیں۔

نکالا ہے پتہ اولا مکاں والے ترے گھر کا — مرا دودِ فغاں چڑھتا ہوا زینہ ہے چکر کا

اپنی آنکھوں میں وہ جادو کا اثر رکھتے ہیں — دیکھتے ہیں جسے اپنا اسے کر رکھتے ہیں

بیخودی میں بھی ہے یہ پاس ادب مستوں کو — پاؤں سے پہلے ترے کوچے میں سر رکھتے ہیں

کس لئے دیتا ہے میخواروں کو طعنے زاہد — عیب بھی رکھتے ہیں جو لوگ ہنر رکھتے ہیں

کم سنی میں بھی ستم کی ہے شرارت ان کی — شمع پر دوڑ کے پروانوں کے پر رکھتے ہیں

یہ تو اے حضرتِ ایماں درِ میخانہ ہے — آپ سرِ سجدہ واللہ کدھر رکھتے ہیں

برقؔ، عبدالشکور خاں

تخلص برقؔ، نام عبدالشکور خاں تھا اور اجمیر کے باشندے تھے۔ والد کا نام امام علی خاں تھا۔ کچھ عرصہ اجمیر میں وکالت کی پھر ٹونک چلے گئے اور وہاں وکالت کرتے رہے۔ غالباً

۱۹۰۰ء میں جے پور آ کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ادبی صحبتوں میں شریک ہوتے رہے اور دادِ سخن دیتے رہے ۱۹۱۳ء میں اجمیر میں انتقال ہوا۔

پاسبانوں کی نگاہوں سے تو بچ جاتا ہوں خود ہیں وہ اپنے نگہباں یہ بڑی تو مشکل ہے
زباں دے گیا ہے کوئی جب سے ہم کو مزے لے رہے ہیں کسی کی زباں کے
نشاں ہے یہ مرقد کسی بے نشاں کا نشاں رہ گئے ہیں کسی بے نشاں کے
کیا ڈھونڈتے ہو تم مرے پہلو میں بار بار دل ہے مگر ستم زدۂ روزگار ہے

بسملؔ، منصور علی خاں

بسملؔ تخلص، منصور علی خاں نام، ولد عبدالرحمٰن خاں۔ آپ کے بزرگ بسلسلۂ تجارت اسپان افغانستان سے ہندستان تشریف لائے۔ کچھ عرصہ دہلی میں رہے پھر جودھپور چلے گئے۔ وہاں سے جے پور آ کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ والد پولیس جے پور میں تھانیدار تھے۔ بسملؔ کی ولادت جے پور ہی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اشتیاق حسین ناطق سے حاصل کی۔ پھر فارسی مولانا مبین سے پڑھی۔ ۱۹۰۰ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ محکمۂ پولیس میں ملازمت کی مگر تھانیداری نہ ملنے پر بددل ہو کر چھوڑ دی اور کسٹم میں داروغہ ہو گئے۔ ملازمت چھوڑ پنشن لے لی اور گوشہ نشیں ہو گئے۔ اب بجز ادبی مشاغل اور کسی کام سے سروکار نہیں۔

طبعاً خلیق و متواضع اور منکسر المزاج ہیں۔ آپ کو پرانے ادب، آداب اور رکھ رکھاؤ کا نمونہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ستر سال سے عمر تجاوز کر چکی ہے مگر کلام میں جوانی کی اُمنگیں باقی ہیں حضرت آگاہؔ سے سن شعور پر تلمذ حاصل کیا۔ آپ نے جے پور کے بہت سے قدیم اساتذۂ فن

خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا ہے۔ کہنہ مشقی، دقت پسندی اور پختگی کلام میں پائی جاتی ہے۔

خیال وحشت ہنگامہ کار کرنہ سکا　　جنوں کی نذر گریباں کا تار کر نہ سکا
اٹھائی آنکھ تو بجلی سی ایک کوند گئی　　نظر بھی میں سوئے ابر بہار کرنہ سکا
ترے شباب کی رعنائیاں خدا کی پناہ　　برابری چمن روزگار کر نہ سکا

....

بعد مردن سوزش غم رنگ لا کر ہی رہی　　خاک پروانہ سے اشک شمع ہم آغوش تھا
ہوش میں تو منزل الفت کسی نے طے نہ کی　　آخرش بے ہوش ہونا ہی مآلِ ہوش تھا
ہستی بسملؔ پہ گر کر تو بھی بسمل ہوگئی　　اے نگاہِ ناز کچھ اپنا بھی تجھ کو ہوش تھا
اُجڑ جانے پہ بھی گلشن میں بلبل کے نشیمن　　تصدق ہو رہی ہیں بجلیاں پروانہ وار اب بھی
جو پہلے ہی سے تھا وقفِ غم شام وسحر یارب　　اسے چکرا رہی ہے گردشِ لیل ونہار اب بھی
بجائے نامۂ اعمال ٹکڑے میں تو رکھ دوں گا　　تری رحمت کے آگے حشر میں دامانِ عصیاں کے

چمن سے بوئے گل لائی مگر اے وائے ناکامی
صبا ٹکرا کے الٹی پھر گئی دیوار زنداں سے

بیدلؔ، محمد نور خاں

بیدلؔ تخلص، محمد نور خاں نام، شمس آباد کے رہنے والے تھے، پھر اجمیر میں سکونت اختیار کر لی تھی، حکیم بہاء الدین خاں بہاؔ سے تلمذ تھا۔ جے پور میں مہینوں قیام رہتا تھا۔ آپ کے متعدد شاگرد مثل چھوٹے لال نظمی وزیر خاں وزیرؔ وغیرہ تھے۔ آپ کا کلام بہت اچھا تھا۔ ممکن ہے کہیں ہو مگر جے پور میں تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ ایک شعر اور ایک قطعہ تاریخ دستیاب ہوا

ہے۔آپ کا شمار یہاں اساتذہ میں کیا جاتا تھا۔

اندوہ والم میں مرتا ہوں مشکل سے بسر بھی کرتا ہوں
ہے ایسی بھی کیا یہ بے خبری فریاد سنو، امداد کرو

قطعہ تاریخ:

انور خوش خصال کا جبکہ کلام چھپ گیا ۔۔۔ دل کو ہر ایک شخص کو کیسی ہوئی مگر خوشی
طبع کا اسکے جو ہوا بیدلِ زار کو خیال ۔۔۔ ملہم غیب نے کہا لوح کتاب خرمی ۱۳۱۷ھ

پارسا، بندو خاں

پارسا تخلص، نام بندو خاں، مگر آپ کے استاد مولانا کوثر نے عبدالرحمن نام تجویز کیا۔ اور بہ تعمیل حکم آپ نے قبول کرلیا۔لہٰذا اب اسی نام سے جانے جاتے ہیں۔وطن جے پور ہے شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے بزرگ سپہ گری کا پیشہ کرتے تھے۔

شروع میں اصلاح کے لیے مولانا کوثر کے پاس گئے تو شعر کہنے سے منع کیا اور اصلاح سے انکار کردیا مگر ضد میں آٹھ سال تک مولانا کا ساتھ نہ چھوڑا، آخر مولانا نے توجہ فرمائی اور اصلاح شروع ہوئی تو اس شان سے کہ شاید اپنی غزل پر بھی اتنی توجہ نہ دی ہو۔ایک غزل کی اصلاح ہفتوں میں پوری ہوتی تھی۔منکسر مزاج، افلاس میں اپنی نظیر آپ، پیشہ صرف شعر گوئی۔

تارِ نفس تو ہے ابھی اے پنجۂ جنوں ۔۔۔ دامن نہیں تو کیا جو گریباں نہیں تو کیا
داغِ دل، داغِ جگر، داغِ تمنا لے کر ۔۔۔ ہم چلے انجمنِ یار سے کیا کیا لے کر
اب در و دیوارِ زنداں تھام لینا تم مجھے ۔۔۔ پھر جنوں کا جوش ہے، پھر آ گئی فصل بہار

ہے مجھ سا سوختہ ساماں کہاں زمانے میں　　لگا دی میں نے خود ہی آگ اپنے آشیانے میں

ابھی سے دشتِ جنوں مت الجھ گریباں سے　　ابھی تو دیر ہے فصل بہار آنے میں

نہیں معلوم کیا تکلیف ان کو ان سے پہنچی ہے
جو عقل وہوش کی صورت سے گھبراتے ہیں دیوانے

کر دیا تو نے خیال یار اس قابل مجھے
جس طرف جاتا ہوں آتی ہے نظر منزل مجھے

کبھی ستم بھی خوشی سے اٹھالئے ہم نے
کبھی کرم بھی تمہارے بہت گراں گزرے

جانباز، عبدالوحید خاں

جانباز تخلص، نام عبدالوحید خاں ہے۔ عوام میں کالے خاں مشہور ہیں۔ اصل وطن ٹونک ہے۔ عرصہ دراز سے جے پور میں ملازم ہیں۔ ۳۸ سال سے شعر کہتے ہیں۔ تلمذ کی بابت کہتے ہیں۔ ؎

مرا استاد ہے دیوانِ مومن

قطعات خوب کہتے ہیں۔

نمونہ کلام

نہ دیکھو چارہ ساز وزخم دل تم دور ہو جاؤ
یہ قاتل کی نشانی ہے اسے بسمل سمجھتے ہیں

خدا کی شان ہے مجھ سے وہ کہتے ہیں سرِ محفل
کہ ہم جانباز بس تجھ کو کسی قابل سمجھتے ہیں

جلالؔی

جلالؔی مولانا جلالی اور مولانا تسلیمؔ[۱] کے اجداد کارنول کے رہنے والے تھے۔ مولانا تسلیم بڑے عالم فاضل انسان تھے۔ دونوں میں بے پناہ خلوص وعقیدت تھی جس کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار جب مرزا کمال الدین سنجر ژند ایرانی سے مولانا جلالؔی کو ملاقات کرنا تھی تو مولانا تسلیم نے مرزا سنجر کو یہ قطعہ ارسال کیا۔

کمالِ صورت و معنیٰ جناب میرزا سنجر	مہ زادانِ قزوینی سرخاصانِ ایرانی
گزارش ناگزیر آمد نہ تنہا از ضمیر آمد	کہ از پیش امیر آمد قبولش باد ارزانی
جلیل القدر مولانا جلال الدین احمد خاں	امیں دولت نواب زین العابدین خانی
بحسب امر آقائے خود آن نواب والا فر	بخدمت ساعت ہشت آیدت امروز تادانی
منِ تسلیم ہم ہمپائے مولانا شوم حاضر	کہ از ابر دلت دارم ہوائے گوہر افشانی

مولانا جلالی کے بیٹے، مولانا امیر الدین خاں شوخ، پاکستان میں ہیں۔

اشعار زیادہ نہ مل سکے۔ دو قطعات تاریخ درج ذیل ہیں۔ پہلا نواب زین العابدین خاں کی بیگم کی قبر سے لیا گیا ہے، دوسرا ان کی مسجد سے اور ایک شعر ملا ہے۔

دختر یوسف علی خاں تاجدار رام پور	بانوئے نواب زین العابدین خانِ غمین
بیگمہ صاحب کے مثل او نہ بودہ در جہان	در کمال و در فضائل در مدائح بالیقین
با جلالؔی گفت تاریخش سروشِ سرمدی	دادا در رتبۂ بالا بفردوس بریں ۱۲۸۶ھ
ساخت مسجد چو عابد ذی جاہ	در عبادت جہاں شدہ راغب

سالِ تاریخِ او جلالی گفت　　　مسجدِ باغ بیگمہ صاحب
۱۲۸۸ھ

اے سیل گریہ رحم بحال منِ حزیں[1]　　　غم خانہ مرا درودیوار نازک است

جنونؔ، علی شیر خاں

جنون تخلص، علی شیر خاں، مہندر گڑھ ضلع نارنول کے رہنے والے تھے۔ جے پور کی فوج میں ملازمت کی اور پنشن لے کر یہیں کے ہو رہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے درویش مجاز و مرتاض تھے اور متعدد لوگ مرید تھے۔ محلہ بساطیان کے مکان میں معتکفانہ رہتے تھے۔ نماز جمعہ و عیدین کے علاوہ شاذ و نادر ہی گھر سے نکلتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں آپ کا وصال ہوا۔ شرکت جنازہ کے لئے مولانا سراج الدین احمد سراجؔ کنتوری بھی حاضر ہوئے۔ جنازہ روانہ ہونے سے چند منٹ پہلے حضرت جنون کے خلیفۂ مجاز مولوی ہدایت علی خاںؒ نے مولانا سراج سے تاریخ وصال کی استدعا کی تو انہوں نے یہ تاریخ کہی۔

جناب شاہ علی شیر خاں چو روئے نہفت　　　سیاہ روز جہاں شد بچشم اہل دل
بلوح قبر نوشتم سراج سال وفات　　　مزار پاک علی شیر خاں ارم منزل
۱۹۱۰ء

ایک مخمس کے تین بند کے سوا جو مولوی عابد علی مرحوم کی بیاض میں ۱۹۰۸ء سے درج ہیں اور کوئی کلام نہ ملا۔

مانا کہ ہاں زاہد ہو تم، میں رندِ آشام ہوں　　　اور نیک کہلائے ہو تم، دنیا میں میں بدنام ہوں

---

[1] حزیں

حاصل ہے تم کو مدعا بالفرض میں ناکام ہوں　　پھر کیا ہوا یوں بھی سہی تم پختہ ہو میں خام ہوں

عیسےٰ بدین خویشتن موسیٰ بدین خویشتن

داڑھی بڑھا کر آپ تو لے بیٹھے تسبیح ریا　　تا کہ خلقت یوں کہے ہیں شیخ صاحب پارسا

جب ہم نے یہ دیکھا کہ نفس اس بات سے راضی ہوا　　تو ہم قلندر بن گئے کر ڈالے چار ابرو صفا

عیسےٰ بدین خویشتن موسیٰ بدین خویشتن

عابد ہو یا زاہد کوئی یا رندِ ساغر نوش ہو　　سرمست از سر تا بپا جوں بادۂ سر جوش ہو

ہیں اپنے اپنے واسطے ہشیار ہو، مدہوش ہو　　تجھ کو کسی سے کیا غرض تو اے جنوں خاموش ہو

عیسےٰ بدین خویشتن، موسیٰ بدین خویشتن

خستہ، محمد سلیم خاں

خستہ تخلص، محمد سلیم خاں نام، حکیم محمد عظیم خاں کے بیٹے، اصل وطن دہلی تھا پھر جے پور ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ علم طب میں مہارت حاصل کرنے کے بعد مہاراجہ سوائی رام سنگھ والی جے پور کے طبیب خاص اور معتمد ممتاز مقرر ہوئے۔ پھر کچھ دنوں بعد وزیر ریاست اور کچھ عرصہ وزارت عظمیٰ کا کام بھی انجام دیا۔

طبیعت میں مزاح تھا چنانچہ ایک مرتبہ کسی اپنے ہم رتبہ رئیس سے ملنے گئے۔ وہ گھر میں موجود تھے مگر خادم سے کہلا دیا کہ نہیں ہیں۔ آپ واپس چلے آئے مگر یہ حال معلوم ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد وہی صاحب آپ سے ملنے آئے تو آپ نے خود جواب دیا کہ حکیم صاحب تو نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا۔ سبحان اللہ یہ کیا جواب ہے۔ آپ نے کہا۔ حضرت آپ کا نوکر بھی کہہ

دے نہیں ہیں تو ہم مان لیں اور ہم خود کہیں نہیں تو آپ نہ مانیں یہ کہاں کا انصاف ہے۔

جے پور میں سب سے پہلا اخبار ''نیر راجستھان'' آپ کی ادارت میں نکلا اور پہلا مطبع بھی آپ ہی نے قائم کیا۔ فن طب میں حسب ذیل تصانیف ہیں:

۱۔ تکشیف حکمت	بزبان فارسی	مطبوعہ نول کشور پریس
۲۔ کشاف العیون	فارسی علم طب ۱۳۰۴ھ	مطبوعہ نول کشور پریس
۳۔ تعلیم السلیم فی الباہ	فارسی علم طب	مطبوعہ
۴۔ تلخیص الصحت	فارسی علم طب	مطبوعہ
۵۔ فاقد المغالط	فارسی علم طب	غیر مطبوعہ
۶۔ سوال ومناظرہ	فارسی علم طب	غیر مطبوعہ

۱۵ راگست ۱۸۹۷ء کو ۵۶ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

شعر وسخن سے خاص دلچسپی تھی۔ اپنے یہاں اکثر مشاعرے بھی کرتے تھے۔ اساتذہ جے پور کہتے تھے کہ کہتے تو واجبی تھے مگر شعر سمجھتے بہت اچھا تھے۔

شعر گفتن گرچہ در سفتن بود — لیک فہمیدن بہ از گفتن بود

بہت کم کلام ملا ہے، جو کچھ ملا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم طرز پر عالمانہ انداز میں کہتے تھے۔

محشر میں دیکھئے لبِ معجز نما کا کام — کھلتا ہے بات بات پہ دفتر گناہ کا

بے جرمیوں پہ قتل مرا پر ضرور تھا — کیا کم ہے یہ تصور کہ میں بے قصور تھا

غیر سے اُلفت نہیں ضد ہی سہی — تم کو وعدہ بھی نہیں ہے یاد کیا

وفا نہیں تو نہیں موردِ جفا ہی سہی
ہزار شکر کہ میں داخلِ شمار رہا

کیوں نہیں کہتے تغافل سے نہیں فرصت مجھے
کیوں کہا تجھے نہیں مطلب مری تقریر کا

وصل کی اُمید کس اُمید پر جانِ حزیں
کیا بھروسہ آہ کا اور نالۂ شبگیر کا

کیا کہا میں نے کہ یوں نیچی نگاہیں ہو گئیں
کیا سنا تم نے کہ یہ عالم بنا تصویر کا

کیا برا ہے یہ کہ لب منتِ کش نالہ نہیں
کیوں سلیم خستہ دل شاکی نہیں تاثیر کا

خورشید، محمود علی خاں

خورشید تخلص، محمود علی خاں نام، ولد صاحبزادہ احمد علی خاں، حضرت رونق کے پوتے، شعر وسخن اور علم وادب سے خاص دلچسپی تھی۔ ٹونک میں ایک ادبی بزم ”بزم حسنِ اتحاد“ قائم کی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں عالمِ شباب میں انتقال ٹونک میں ہوا۔ کلام میں صفائی، روانی اور شوخی ہے۔

بیٹھے رہو پہلو میں خدا کے لئے دم بھر
تم جان ہو اور جان کا جانا نہیں اچھا

منہ میرا نہ کھلواؤ کہ ہو جاؤ گے رسوا
رہنے دو یونہی بات بڑھانا نہیں اچھا

ہو کے شب باش اکیلے نہیں جاتے دم صبح
وہ مرے ہوش بھی ہمراہ لئے جاتے ہیں

لے کے جان وجگر ودل وہ یہ بولے خورشید
ان کے بدلے تمہیں یاد اپنی دیئے جاتے ہیں

کروں ترک وفا ان کی جفا پر
مگر لاؤں میں ایسا دل کہاں سے

رضی، محمد اسماعیل خاں

رضی تخلص، محمد اسماعیل خاں نام، ولد فضل نبی خاں، یوسف زئی پٹھان، مولد جے پور، ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے۔ اردو فارسی اور کچھ عربی کی تعلیم مولوی فضل علی عرف مولوی جیون علی

سے جے پور میں حاصل کی۔ منشی فاضل پنجاب سے پاس کیا۔ کثرت مطالعہ اور ادبی و علمی ذوق نے معلومات میں اضافہ کیا اور اہل علم کی صحبت نے جلا دی۔ اگست ۱۹۱۹ء میں جے پور میں سر رشتہ تعلیم جے پور میں ملازمت کا سلسلہ شروع کیا ۴۷ء میں پاکستان چلے گئے۔ کوٹری جنکشن پر قیام ہے۔

آٹھ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۹۱۷ء میں مائل دہلوی سے تلمذ حاصل کیا۔ ذوق سخن نعمتِ خداداد ہے۔ قیس عامری بھی ایسا ہی دلدادہ لیلیٰ ہوگا جیسا یہ فرہاد شاعری۔ شیریں سخن کا وارفتہ اچھا شعر سنا اور سر دھننا شروع کیا۔ ادبی مسائل پر گفتگو کرنے میں نہایت بے باک، دوستوں میں یار شاطر مگر اغیار میں بار خاطر نہیں! طبیعت میں ظرافت بھی ہے اور حاضر جوابی بھی۔ آپ کو فنا فی الشعر کہنا بے جا نہیں، صاحبزادہ ولی احمد خاں قدسیؔ اور مولوی امیر الدین خاں شوخؔ خلوص کے ادبی نشترِ مزاح سے ذرا رگ ظرافت کو چھیڑ دیتے ہیں تو پھر رضیؔ کی سیفِ زباں اور جوہر دکھاتی ہے کہ مجروحین آہ و بکا کے بجائے قہقہوں پر مجبور ہوتے ہیں۔

جے پور میں ان کی عدم موجودگی خصوصیت سے محسوس کی جاتی ہے۔ حضرت میکشؔ اکبرآبادی کہتے ہیں۔

گئے رضیؔ سے سخن فہم سوئے پاکستان سنائے میکشِ محزوں کسے اب اپنا کلام

مشاقی اور پرگوئی کے ساتھ بلند پروازی اور مضمون آفرینی کی بہت کوشش کرتے ہیں فلسفہ کے علاوہ آپ کے کلام میں پند و موعظت بھی پائی جاتی ہے۔

تمہاری بے قراری میں تو میرا سوزِ دل تم تھے
تمہارا میں تو میرے تم وہ قسمت اب کہاں میری

زلیخا کو گریباں چاہئے، یوسف کو پھر دامن
چلے حسن وجنوں پھر جمع کر کے دوستاں میری
رضیؔ ہوں کوٹری میں زندہ لیکن مردہ مردہ سا
رہی جے پور میں شاید کہ جانِ ناتواں میری
معاف صیاد، مضطرانہ یہ نالہ مجھے تازہ بے وطن کا ہے
ابھی ہے آنکھوں میں آشیانہ، ابھی سماں یاد ہے چمن کا
ادھر ہے اِک شانِ بے نیازی ادھر نہیں تابِ عرض ہم کو
نہ پوچھ ہمدم کہ ہے قیامت زبان سے فاصلہ دہن کا
وہ ہوک ہے جذب قصرِ دل میں کہ فطرت غم نثار جس پر
کبھی جو بھولے سے لب تک خراب ہو حال انجمن کا

رونقؔ، احمد علی خاں

رونقؔ تخلص، احمد علی خاں نام، وطن ٹونک، مستقل سکونت جے پور اختیار کی، امیر خاں بانی ریاست ٹونک کے فرزند ہفتم تھے۔ امیر خاں کی موت کے بعد برادر کلاں نے ۲۰ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا مگر آپ کا مطالبہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ تھا جو نامنظور ہونے پر ناخوش ہو کر ٹونک سے جے پور چلے گئے۔

پہلا قیام موضع نٹواڑہ علاقہ جے پور میں ہوا۔ وہاں کے جاگیر دار نے مہاراجہ جے پور کو اطلاع دی تو حکم ہوا کہ جاگیرداراں ٹھکانہ (سرکار) نٹواڑہ اور بیوٹی پیشوائی کر کے صاحبزادہ کو اپنے ساتھ جے پور لے آئیں۔ مہاراجہ جے پور سے حسب دستور ریاست ملاقات ہوئی

جنہوں نے آپ کے ذاتی واضافی اوصاف کی قدر کی۔ دوستانہ طریقہ سے پیش آئے۔ پانچ سو روپیہ ماہوار دعوت خرچ مقرر کیا۔ نیز خاص امراء کے دریا دلی اعزاز بھی مقرر کیے۔ آپ کے صاحبزادہ ولی احمد خاں قدسیؔ مصنف محاوراتِ داغ ہیں۔

شعر وسخن سے دلچسپی سن شعور ہی سے تھی۔ اول نوازش علی خاں تنویرؔ سے اصلاح لیتے تھے، اس کے بعد ۶۵ سال کی عمر میں سید امراؤ مرزا انورؔ سے تلمذ اختیار کیا۔ اس کے بعد استاد ظہیرؔ سے۔ حضرت انور سے اصلاح شروع کرنے پر پچھلا کلام تلف کر دیا اور کچھ دنوں میں بہت اچھا کہنے لگے۔ خوش اخلاق، خندہ رو، متواضع وسیع المشرب اور قدر دانِ علم وفن تھے۔ لکھنؤ گئے تو استاد ناسخؔ سے ملاقات ہوئی۔

۱۴/اکتوبر ۱۸۹۰ء کو انتقال ہوا۔ بیرونِ سانگانیر دروازہ دفن ہوئے۔ ایک مطبوعہ ضخیم اور ایک غیر مطبوعہ دیوان یادگار چھوڑا۔ موخر الذکر کو کسی شخص نے کسی طرح حاصل کر کے اپنے نام سے دلی میں چھپوالیا۔ اس کی اطلاع آپ کے پوتے ولی احمد خاں کو دی گئی پر انہوں نے بر بنائے استغنا کوئی کارروائی کرنا پسند نہ کی؟

پختگی، بندش، چستیٔ الفاظ، ندرت آفرینی اور شیرینی وصفائی کلام کی خصوصیات ہیں۔

آبِ خنجر سے تر ہوا نہ گلو — سر بہت تشنہ کام نے مارا

دل زمانہ سے ہٹ گیا اپنا — ہم بھلے اور گھر بھلا اپنا

بچ گئے ہم صدمہ ہائے ہجر سے — موت کا اچھا بہانا مل گیا

سمجھتے تھے اسے ناداں مگر وہ تو بلا نکلا — کہ دشمن بن گیا نامِ محبت منہ سے کیا نکلا

ہے سب کو گماں دامنِ قاتل میں یہ ہیں گل — چھینٹے جو مرے خون کے دو چار پڑے ہیں

دیکھنے سے ترے زاہد کی یہ حالت بگڑی
خود کہیں، سبحہ کہیں، جبہ و دستار کہیں

تصدق اس زباں کے، اس پیامِ ناز کے قرباں
کہ اپنا حالِ دل کاغذ پہ لکھ کر بھیج دو ہم کو

دل تک ہو چاک تیغ جو سر پر لگایئے
عاشق ہوں ہاتھ سوچ سمجھ کر لگایئے

اعدا کی ملاقات سے انکار مسلّم
کہا کہیے مگر ہم نے سنا اور ہی کچھ ہے

نہ باتیں کیں نہ تسکیں دی، نہ پہلو میں ذرا ٹھہرے
جو تم آئے تو کیا آئے جو تم ٹھہرے تو کیا ٹھہرے

جلوہ اپنے حسن کا دکھلا کے ہر ہر رنگ میں
کافر و مومن میں ڈالی ہے لڑائی آپ نے

غلط ہے کہ دل کا لگانا برا ہے
محبت کا لیکن جتانا برا ہے

کہاں رہ گئی لب پہ جاں آتے آتے
کہ رک رک گئیں ہچکیاں آتے آتے

گل و لالہ سے میکدہ بھر گیا ہے
مغاں کے لئے ارمغاں آتے آتے

نہ آساں سمجھ قصۂ غم کو رونق
کہ آئے گی یہ داستاں آتے آتے

پل میں تولہ ہے، پل میں ماشا ہے
یار کیا ہے عجب تماشا ہے

زیبؔ، منور حسین خاں

زیبؔ تخلص، منور حسین خاں نام۔ دہلی وطن۔ راجستھان سکریٹریٹ میں آفس سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ مرزا غالبؔ سے عقیدت اور مرزا غالبؔ کے قلم سے اظہار بیزاری کی بابت مسدس سے دو بند نقل کئے جاتے ہیں۔

یہ زمیں لاکھ گردشیں کھائے
رقصِ بسمل کی شکل بن جائے

یہ فلک خوب رنگ برسائے　　　اہلِ فن ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائے

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت

خاک کو آسماں سے کیا نسبت

وہ مضامین، وہ مقال کہاں　　　وہ عناصر میں اعتدال کہاں

وہ تعلق، وہ انفعال کہاں　　　ہر مؤذن کہاں، بلالؓ کہاں

اشرف شاعراں سے کیا نسبت　　　لائقِ عارفاں سے کیا نسبت

شفیقؔ، محمد شفیق حسین خاں

شفیق تخلص، محمد شفیق حسین خاں، نسباً افغان ''ببے میاں'' عرف جے پور کے معزز خاندان نواب سعد اللہ خاں سے ہیں۔ پہلے حضرت ایماںؔ سے تلمذ تھا، ان کے بعد مولانا اطہرؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ ترنم سے بہت اچھا پڑھتے تھے، خوش فکر شاعر ہیں، تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے، کلام میں شوخی و آمد ہے۔

وحشتِ دل کا مرے آج یہ عنواں دیکھا　　　گھر بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں دیکھا

مرکزِ حسن پہ نظروں نے لیا جا کے قرار　　　جب نظر ہم نے اٹھائی رخِ جاناں دیکھا

آگے آگے اشک، پھر کچھ دل کے ٹکڑے، پھر لہو　　　یوں روانہ کاروانِ چشمِ گریاں کیجئے

اِک عدو ہے کہ اسے سر پہ چڑھا رکھا ہے

ایک ہم ہیں کہ ترے پاؤں پہ سر رکھتے ہیں

صوفیؔ، محمد ابراہیم خاں

صوفیؔ تخلص، محمد ابراہیم خان نام، اجمیر وطن تھا، مگر جے پور میں مہینوں رہتے تھے درویش متوکل تھے، شعر بہت جلد کہتے تھے۔ اکثر مشاعرہ میں پہنچ کر فی البدیہہ غزل کہتے تھے، حضرت حسن نظامی نے اسی سبب آپ کو قادر الکلام کا خطاب دیا تھا۔ بات کرنے میں ہکلاتے بہت تھے مگر شعر پڑھتے وقت کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پتہ نہیں کس عالم میں ہیں۔

مرا ہاتھ دیکھ براہمن، مرا یار مجھ سے ملے گا کب
ترے منہ سے نکلے خدا کرے اسی ماہ میں، اسی سال میں

مجھے صوفیؔ صاف بتائیے نہ چھپائیے، نہ چھپائیے
کہیں ہولی کھیلی ہے آپ نے جو رنگا کسی نے گلال میں

طالبؔ، عبدالرحیم خاں

طالبؔ تخلص، عبدالرحیم خاں نام، جے پور وطن میں ۳۱ دسمبر 1911ء کو پیدا ہوئے۔ پرائیویٹ تعلیم حاصل کی۔ حافظ محمد یوسف علی خاں عزیز کے شاگرد تھے مگر حضرت عاصمؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ آج کل کسی پرائیویٹ مدرسہ میں بمقام الہٰ آباد مدرس ہیں۔

بہت ہمدرد دیکھے ہیں، بہت بیدرد دیکھے ہیں
محبت کے ہزاروں ہم نے گرم و سرد دیکھے ہیں

ہوا جب امتحاں عشق و ہوس کا بارہا ہم نے
خزاں دیدہ چمن کی طرح چہرے زرد دیکھے ہیں

عاصؔم، محمد عبدالوہاب خاں

عاصؔم تخلص، محمد عبدالوہاب خاں نام، ولد محمد وارث خاں، اپنے حالات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ پیدائش ۱۹۰۰ء میں ریاست جے پور ہوئی۔ ۱۹۱۸ء میں مہاراجہ ہائی اسکول جے پور سے میٹرک کا امتحان دیا۔ اسی زمانہ میں (ایک غیر شاعرانہ) دل کی بیماری ہوئی جس کی وجہ سے ایک مدت تک تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو رہا۔ ۱۹۲۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۷ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ ہوا۔ ۱۹۲۹ میں فارسی میں ایم۔اے۔کیا۔ ۱۹۳۵ میں ایم،او، ایل کی اعزازی ڈگری ملی۔ اس کے علاوہ مکان پر عربی فارسی ہندی اور سنسکرت کا سلسلہ جاری رہا۔

ہندو، عیسائی، جینی، سکھ پارسی وغیرہ مختلف عقائد کے لوگ میرے دوستوں کی فہرست میں شامل ہیں جن پر مجھے فخر ہے۔ عقائد کے لحاظ سے سنی مسلمان ہوں، لیکن عمل کی وجہ سے ہر فرقہ سے پشیمان ہوں۔

مردانِ خدا نے رند جانا ہم کو | رندوں نے خدا پرست مانا ہم کو
ہم اپنی سمجھ میں کچھ نہ آئے عاصؔم | سمجھا کیا کچھ نہ کچھ زمانہ ہم کو

ہندو پاکستان کی تقسیم کے بعد جو انقلاب پیدا ہوا اس کا اثر مجھ پر بھی پڑا۔ اوّل میں نے حالات کا مقابلہ کیا اور کسی قیمت پر ترک وطن کرنا نہ چاہتا تھا لیکن جب جان و مال کے علاوہ عزت کے لئے بھی خطرے پیدا ہو گئے تو عمر بھر کا سرمایہ جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اور احباب کو خیر باد کہہ کر بادلِ ناخواستہ ہجرت کر کے کراچی آ گیا۔

تصنیفات:- اشعار کا مجموعہ، نقش حیات، جس میں اردو فارسی کی نظمیں، غزلیں،

قطعات، رباعیات، مخمس، مسدس، وغیرہ ہیں غیر مطبوعہ ہیں۔

دوڈرامے خالد بن ولید اور عمر خیام اور شعر پر ایک تنقیدی رسالہ، رسول اللہ ﷺ طبع ہو چکے ہیں۔ مختصر افسانوں کا ایک مجموعہ ''حادثے'' کئی قلمی افسانے اور تنقیدی مضامین اردو میں اور ایک فلمی افسانہ ''رتی کلیاں'' ہندی میں قابلِ طباعت واشاعت ہیں۔

اولاد:- اللہ نے تین بیٹے اور آٹھ بیٹیاں دیں۔ بڑا بیٹا عبدالتواب خاں انجینئر ہے، اور این۔ ای۔ ڈی کالج میں پروفیسر ہے۔ چھوٹا بیٹا عبدالحمید خاں ڈاکٹری کا متعلم ہے۔

نمونہ کلام:-

کہتا تو ہوں میں بہت شگفتہ اشعار — لیکن یہی تجربہ ہوا ہے ہر بار
رہ جاتے ہیں پھولوں کی طرح مرجھا کر — کچھ دن سے زیادہ نہیں رہتی یہ بہار

غمِ اُلفت کو سمجھا انبساط زندگی میں نے — کہ حسرت برنہ آنے پر بھی حسرت کم نہ کی میں نے
نظر آئی ادا اس میں جب ان کی برہمی کی سی — گوارا کر لیا عاصم وبالِ زندگی میں نے

وہ کیف نغمہ نہیں لطف نو سخند نہیں — بغیر آپ کے راحت کم از گزند نہیں
تمہاری یاد سے ہوتا نہیں خیال آزاد — خیال کے لئے ہر چند قید وبند نہیں
یہ اور بات ہے دیکھیں نہ وہ ادھر لیکن — ہماری جرأت دید ان کو ناپسند نہیں

یہ زحمت ناز وغمزہ کیا ہے اگر وفا مقتضی نہیں ہے
اگر ہے تو بے قرار اے دل تو چین سے حسن بھی نہیں ہے
غمِ محبت کی دلکشی کو نظر نہ لگ جائے آنسوؤں کی
یہ پردہ داری ہے ورنہ ہمدم ہنسی ہماری ہنسی نہیں ہے

آدمی اِک حادثہ ہے عالم ایجاد میں
آدمی اک فاصلہ ہے متصل اضداد میں

موت کا پیغام ہے یا زندگی کا راز ہے
آدمی قدرت کی ایسی مشتبہ آواز ہے

بندۂ تقدیر بھی، تقدیر کا معمار بھی
قید بھی، آزاد بھی، مجبور بھی، مختار بھی

یہ وہ شر ہے جو ہوا شیطان کو بھی ناگوار
یہ وہ نیکی ہے فرشتے ہو گئے جس پر نثار

عقل کی موجِ تبسم ہے کمالِ آدمی
دیدۂ عبرت کا آنسو ہے مآلِ آدمی

عرشیؔ، محمد حمید اللہ خاں

عرشیؔ تخلص، محمد حمید اللہ خاں، ولد سبحان خاں یوسف زئی پٹھان، وطن جے پور، میر حیدر حسین ذکی ویکتا سے تلمذ تھا۔ ان کی خدمت میں خط کی مشق کو حاضر ہوا کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں شعر وسخن کا شوق ہوا تو ان ہی سے تلمذ اختیار کیا۔ مہاراجہ اورینٹل کالج جے پور سے منشی فاضل پاس کیا۔ پھر انگریزی تعلیم حاصل کر کے ایم۔اے پاس کیا عربی کی استعداد معقول حاصل کی۔ ذوق کتب بینی نے مبلغ علم بہت بلند کر دیا۔ گورنمنٹ کالج اجمیر میں فارسی کے استاد ہو گئے۔ نہایت نیک زندگی بہت عزت سے بسر کی۔ اجمیر میں آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔

جے پور میں ۲۶ / دسمبر ۱۹۲۱ء کو وفات پائی۔ میاں ضیاء الدین کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

تصانیف:- آپ کی زیادہ تر تصانیف کورس سے متعلق تھیں جو شائع ہوئیں اور چند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اور بھی تھیں مثلاً "کلام الملوک" جس میں تیموریہ سلاطین اور شاہزادگان کا کلام آپ نے جمع کیا تھا اور دوسری "لسان ومطالعہ زبان" جس میں زبان کے متعلق بحث کی گئی

ہے۔ایک انگریزی تصنیف کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ دونوں طبع ہو چکی ہیں۔نمونہ کلام:۔

اور سب کچھ تو ہے اے گردش دوراں ہونا — کبھی ممکن نہیں صبحِ شبِ ہجراں ہونا

گو نہیں شوق شکار ان کو مگر کیا کیجئے — دل کو خود ہی ہدفِ ناوکِ مژگاں ہونا

تم نہ چاہو تو ہے دشوار، اگر تم چاہو — کچھ بھی مشکل نہیں مشکل مری آساں ہونا

عزیز، محمد معز الدین خاں

عزیز تخلص، محمد معز الدین خاں، مولانا جلال الدین احمد خاں جلالی کے خلف اکبر، وطن رام پور۔ابتدائی تعلیم گھر پر پائی، قرآن مجید حفظ کیا، علوم عقلی ونقلی کی تکمیل مولانا تسلیم سے کی۔ عربی وفارسی کے منتہی تھے اور نہایت وجیہ اور بارعب بزرگ تھے۔عرصہ تک نائب بخشی فوج جے پور رہے۔(اسسٹنٹ کمانڈر انچیف) خلیق، بامروت، ہمدرد متواضع اور مرنجاں مرنج ہستی تھے۔۱۹؍اپریل ۱۹۲۶ء کو ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔نثر ونظم میں کئی تصانیف چھوڑیں لیکن علمی وادبی سرمایہ تلف ہو گیا۔بمشکل چند نعتیہ اشعار ملے ہیں جو درج ہیں۔ایک کتاب مسدس بنام ''بہار جے پور'' طبع ہوئی تھی مگر وہ بھی نہ مل سکی۔

اسم اعظم ہے ترے ہاتھ لگا خوب عزیز — رکھ سدا وردِ زباں نام فقط بسم اللہ

ہر وقت ہے وہ چہرۂ تاباں مرے آگے — ذرہ سے ہے کم مہر درخشاں مرے آگے

ہے مصحفِ رخسارِ محمدؐ کا تصور — ہر وقت کھلا رہتا ہے قرآں مرے آگے

کیا مرتبہ پایا ہے محمدؐ کی بدولت — بیٹھے ہیں ملک سر بگریباں مرے آگے

جو زندہ دل کہ عشق پیمبر میں مر گئے — ہے آفریں انھیں کہ بڑا کام کر گئے

محشر میں اک اشارۂ ابرو جو ہو گیا — اِک پَل میں پُل صراط سے سارے اتر گئے

حسنِ خدا نمائے محمدؐ کے سامنے | یعقوبؑ کی نگاہ سے یوسفؑ اتر گئے
اچھے ہیں وہ جنہیں ہے بھروسہ حضور کا | عاصی رہے جو کثرتِ عصیاں سے ڈر گئے

عزیزؔ، محمد یوسف علی خاں

عزیزؔ تخلص، محمد یوسف علی خاں نام، یوسف زئی افغان، ادیب الملک خطاب وطن قدیم سوات، مولد ٹونک، سکونت جے پور، مولانا ضیاالدین کے حجرے میں فروکش ہیں۔ وہیں کچھ طلبا مستفید ہوتے ہیں، تلامذہ اصلاح لینے آتے ہیں اور امامت فرماتے ہیں۔ سنہ ولادت ۱۸۸۹ء

اردو فارسی، عربی اور ہندی کی تعلیم جے پور میں پرائیویٹ بھی پائی اور سرکاری مدرسہ میں بھی، قرآن مجید حفظ کیا، گلستان پڑھتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں شعر کا فتح باب ہوا۔ آپ کی علمی قابلیت اسناد کی قید و بند سے آزاد اور رسمی نصاب سے بالاتر طباعی و ذکاوت نے اس میں چار چاند لگا دئے ہیں، مذہبا سنی حنفی ہیں۔

اوّل محکمہ بخشی خانہ فوج میں ملازم ہوئے، پھر جے پور اسٹیٹ گیراج میں محاسب ہوئے۔ سرکاری فارسی دفتر کی ترتیب و تراجم میں بھی کافی مدت خدمات انجام دیں اور ''پوتھی خانہ'' (جے پور ریاست کا کتب خانہ خاص جس کو جے سنگھ لائبریری کہتے ہیں) کی فارسی و عربی کتب کی ترتیب میں بھی کام کیا۔ آخر میں محکمہٗ خاص جے پور کے صیغہ ریونیو میں خلاصہ نویس رہ کر پنشن لی اور اب آزاد ہیں۔

اطہر حضرت ایمانؔ سے تلمذ اختیار کیا۔ پھر حضرت تنویرؔ سے، آخر میں حضرت آگاہؔ کے شاگرد ہوئے۔ آپ کو تذکیر و مجالس خوانی میں بھی مہارت تامہ ہے۔ نہایت شستہ و برجستہ تقریر فرماتے ہیں اور عجیب عجیب نکات بیان کرتے ہیں۔ رنگ مجلس سمجھنے اور رنگ مجلس جمانے والا

اس وقت جے پور میں آپ سے بہتر نہیں۔ نہایت صاف گو اور صفائی پسند ہیں۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے۔ خودداری کا نمونہ بھی ہیں اور انکساری کا آئینہ بھی۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔

نزاکتِ مزاج ذرا سی بات کو رائی کا پربت بنادیتی ہے۔ آپ جب کبھی رمزو کنایہ میں گفتگو کرتے ہیں تو اس کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ آپ کو ''رموز خودی'' اور ''اسرار بے خودی'' کا مجسمہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ آپ بڑوں بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ہر استاد کے مقابلہ میں طبع آزمائی میں تامل نہیں ہوتا۔ اس باب میں آپ بہت بے باک ہیں۔ ''اعتماد محمود'' کا (آپ کی ایک تصنیف سیرت پاک جسکی مخالفت ہو کر جے پور میں وہ دریا برد کردی گئی) مصنف اعتماد نفس کا بھی حامل ہے۔ ''معین الادب'' میں آپ نے ولؔی سے لے کر امیر مینائی اور گراؔمی تک کے جواب میں اپنا کلام پیش کیا ہے۔ اقباؔل اور حاؔلی کو مشورۂ سخن بھی دیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو شاکی اصحاب کی نظر میں سعدی کے اس قوم کے خلاف جلوہ گر ہے۔ نہد شاخ پر میوہ سر برزمین، اور یہی وہ عمل ہے جو صائب کے قول ؏ ثنائے خود بخود گفتن نمی زیبد ''صائب'' کا منافی ہے۔ قدرتِ تقریر کی طرح آپ تحریر پر بھی پورے قادر ہیں۔ نظم ہو یا نثر آپ کے لئے برابر ہے۔ نظم کی ہر صنف میں جو ہر طبع دکھاتے ہیں۔

''مرثیہ کی نئی دنیا'' (تصنیف کا نام جس میں بارہ مراثی ہیں) نظم فارسی اردو دونوں پر قدرت ہے۔ نثر اً تمام تصانیف اردو میں ہیں۔ اسلوب بیان بعض کا بالکل آسان اور عام فہم ہے مگر بعض کا اس لئے توجہ طلب کہ ہر فقرے کو قلیل الالفاظ و کثیر المعانی بنانے کی آپ نے کوشش کی ہے تاہم عسیر الفہم نہیں۔

جے پور کے زمانہ قحط الرجال میں جس قدر کتابیں آپ نے لکھی ہیں، اس کی مثال صرف آپ ہی ہیں، میں نے پوری تفصیل کے لئے خود آپ سے پوری فہرست مانگی مگر وہ نہ ملی، اس لئے ذیل میں ان کتابوں کے نام درج ہیں جن میں زیادہ تر میری مطالعہ کردہ ہیں اور دو چار معلوم شدہ۔

۱۔نظام الادب	۲۔خلاصۃ القواعد	۳۔اسوۂ حسنہ	۴۔اعتماد و محمود
۵۔تصویر شہادت	۶۔تاریخ افتراق اسلام	۷۔مرثیہ کی نئی دنیا	۸۔نور القرآن
۹۔خاکِ شفا	۱۰۔صداقت عزیز	۱۱۔زمبین	۱۲۔قیامت صغریٰ
۱۳۔معین الادب	۱۴۔محی الادب	۱۵۔مجموعہ مسمط و رباعیات	
۱۶۔قومی نظموں کا مجموعہ	۱۷۔تاریخ اتحاد اسلام	۱۸۔قیامت وسطیٰ	۱۹۔خیر الخلائق
۲۰۔دین عزیز	۲۱۔شاہکار عزیز		

نہایت پُر گو شاعر ہیں۔ بہت جلد شعر کہتے ہیں۔ آپ کے یہاں بندش کی چستی، الفاظ کی شوکت، زبان کا چٹخارہ، مضمون آفرینی، بلند پروازی، محاکات کے نمونے، ساختگی اور روانی بخوبی پائی جاتی ہے۔

نمونۂ کلام

رباعی

جب جہل بتاتا ہے جفا کی راہیں　　جب علم سکھاتا ہے ریا کی راہیں
جب عقل کو خوش آتی ہے سہل انگاری　　تو عشق دکھاتا ہے وفا کی راہیں

فن کے جتنے یہ کارخانے ہیں
لغو حیلے، غلط بہانے ہیں

شاعروں سے یہ پوچھتا ہوں میں
پیڑ گنتے ہیں، آم کھانے ہیں

قطعہ

بعدِ خزاں عمرِ بہار نجاتِ امید
وہ گل ہے جسکے سامنے عطر شامہ کیا

موئے سیاہ جس نے کرم سے کئے سفید
وہ دھونہ دے گا فضل سے اعمال نامہ کیا

مرثیہ کا ایک بند

یارب چمن نظم عزا باغ جناں ہو
یہ گلشنِ شاداب ولا خلد نشاں ہو

عاجز کی زباں معجز اعجاز بیاں ہو
ہونٹوں سے لب ولہجہ جبریل عیاں ہو

مضمون مودت سخنِ پاک سے مل جائے
ایمان کی سند صاحب لولاک سے مل جائے

قصیدہ در شان حضرت علیؑ

قلب مومن آئینہ چشم صفا گر آئینہ
آئینہ در آئینہ ہے آئینہ ہر آئینہ

تشبیب

سامنے جو آئے اس کے اپنی صورت دیکھ لے
حال کہہ دیتا ہے سب کا سب کے منہ پر آئینہ

مدح

ہے وہ وجہ اللہ روئے مرتضیٰ ہر آئینہ
جس کے جلوے سے ہوا اللہ کا گھر آئینہ

نور کی تصویر ہے اور نور کی تقریر ہے
خطبۂ حیدر سے ہیں محراب و منبر آئینہ

دستِ بیعت ہو تو پھر انسان انساں ہی بنے
نقشِ پا بن جائے تو بن جائے پتھر آئینہ

اشعار سلام

مجرائی نہیں سبطِ پیمبر تہِ خنجر زہرا تہِ شمشیر ہیں حیدر تہِ خنجر
جب پوچھتے ہیں منزلِ تسلیم ورضا کو کہتی ہے شہادت تہِ خنجر، تہِ خنجر

متفرق اشعار

وہ مغز خشک میرا اشعر تر کیا خاک سمجھے گا سبک روحی کو دیتا ہو جو رتبہ ناتوانی کا
آنکھ لڑتی تھی کہ در پردہ جو گزری گزری دل کو گرتے ہوئے دیکھا نہ سنبھلتے ہوئے دیکھا
جام میں ایسی کوئی چیز تو ہے اے، واعظ جس سے تم جیسوں کو ایمان بدلتے دیکھا
میخانہ دو قدم ہے تو ساقی ہے روبرو دو ہاتھ ہے قرابہ تو دو تر ہے قدح خوار
جامِ وفا ومیکدۂ عشق اے عزیزؔ اسلام بادہ خوار ہے، ایمان بادہ نوش
کس دل جلے نے آہ محبت کا دم بھرا تارِ نفس سے لگ اٹھی تارِ کفن میں آگ
پہنچا دیا ہے شوق نے کس جلوہ گاہ میں اک اور ہی جہان ہے میری نگاہ میں
اے ساکنانِ شہرِ خموشاں کہو تو کچھ مٹی میں مل گئے ہو کہ زیرِ مزار ہو
ہردم سمندِ عمر رواں ہے روانہ دیکھ کس طرح تیز گام ہے بے تازیانہ دیکھ
جس کو دانا دیکھتا ہے پیس دیتا ہے فلک آسیا سے بڑھ کے یہ سنگِ گراں گردش میں ہے
رفتہ رفتہ ایک زینہ عرش تک بن جائے گا آس بندھتی ہے کہ آہوں کا دھواں گردش میں ہے
پھر پھرا کر پھر یہیں آجائے گی فصلِ بہار باغ سے نکلی نہیں اے باغباں گردش میں ہے
ہجر کا دن تو گیا اور شبِ فرقت آئی وہ مصیبت نہ ٹلی تھی کہ یہ آفت آئی
آخری سانس لیا اور عدم آباد میں تھا ایسے لاغر میں خداداد یہ طاقت آئی

گر ملیں پیرِ خرابات کی نعلین اے شیخ　　　یہ سمجھ ہاتھ کلیدِ درِ جنت آئی

نہ جرس ہے نہ فرس ہے، نہ کہیں منزل ہے

کون سی راہ یہ اے پیر طریقت آئی

عشقیؔ، محمد الیاس خاں

عشقیؔ تخلص، نام محمد الیاس خاں ولد مولوی اسماعیل خاں رضیؔ، اب وطن پاکستان ہے، محمد عبدالوہاب خاں صاحب عاصمؔ سے تلمذ ہے۔ مہاراجہ کالج جے پور سے ایم۔اے کرنے کے بعد اردو کے پروفیسر ہو گئے تھے مگر تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔

بہارِ رنگ و بو ہے ابر و باراں ہے جہاں میں ہوں

بہم سب کچھ وہاں وحشت کا ساماں ہے جہاں میں ہوں

عطاؔ، چاند خاں

عطاؔ تخلص، چاند خاں اصل نام، پھر مولانا اسماعیل کے ارشاد کی تعمیل میں عطا اللہ خاں تبدیل کر لیا تھا۔ وطن ٹونک تھا۔ مسکن جے پور، یہی مدفن ہے۔ پلٹن میں ملازم تھے۔ پہلے حضرت حنیںؔ پھر حضرت تسلیمؔ کے شاگرد ہوئے۔ فارسی استعداد اچھی تھی۔ جے پور میں بہت سے شاگرد تھے۔ اپنے زمانے کے شعرائے جے پور کا تذکرہ آپ نے لکھا تھا، وہ تذکرہ آپ کے شاگرد لچھی نرائن سخاؔ کے پاس رہا۔ اب کچھ پتہ نہیں۔ آپ کا ضخیم دیوان تھا، جس میں فارسی کلام بھی تھا، مگر اب اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کلام میں روانی، پختگی، مضمون آفرینی لطفِ زبان، محاکات کے نمونے اور تاثیر بخوبی پائی جاتی ہے۔

نمونۂ کلام:-

فرقت کا غم کبھی جورِ بتاں — کیا کیا ستم نہ ہم پہ تہِ آسماں رہا

اٹھائے لطف کیا کیا کچھ مے وشاہد کے رندوں نے
کوئی زاہد سے پوچھے آپ نے دنیا میں کیا پایا

وہی ہیں آپ، وہی میں ہوں یاد تو کیجئے — کہ وعدے آپ کے تھے مجھ سے مہرباں کیا کیا

بل ہے کبھی ابرو پہ کبھی چیں ہے جبیں پر — باندھی ہے کمر کیا بتِ بیداد نے کیں پر

موجِ ہستی بھی تو ہے ایک طلسمِ حیرت — مٹ گیا دیکھتے ہی دیکھتے کیا کیا ہو کر

کچھ ہو بلا سے بیٹھ گئے مثلِ نقشِ پا — اٹھتے ہیں جیتے جی کوئی اب تیرے در سے ہم

شامت جو دل کی آئی تو پہلو کو چھوڑ کر — دیوانہ جا کے الجھا کہاں زلفِ یار میں

قسمت میں میری کیوں نہ لکھا وصل جائے ہجر — یارب تھی یہ تو بات ترے اختیار میں

آپ اور یہ کوچۂ اصنام خیر ہے — کہئے تو آج حضرتِ واعظ ادھر کہاں

کیا کہتے ہو گلوں میں وفا ہے، کہاں وفا — ہم دیکھے بیٹھے ہیں چمنِ روزگار کو

گلچیں کا رشک گاہ گہے خوف باغباں — بلبل خزاں سے سمجھے ہے بہتر بہار کو

غیر سے خوب مری ضد پہ نبھائی تم نے — واہ دنیا میں کوئی تم سا طرحدار تو ہو

خط میری ضد سے غیر کو تحریر کیوں نہ ہو — ظاہر مرا نوشتۂ تقدیر کیوں نہ ہو

وہ در پردہ فانوس میں شمع ساں ہے — نہاں کا نہاں اور عیاں کا عیاں ہے

صورت دکھائی بھی تو ہمیں آ کے — بے وقت مہرباں وہ ہوئے بھی تو کیا ہوئے

پھر آپ ہوں گے اور وہی الفتِ بتاں — دو دن کو کیا ہوا کہ عطا پارسا ہوئے

اے عطا حسن پرستی ہے ہمارا مذہب
اس میں کافر کوئی سمجھے کہ مسلماں سمجھے

فائزؔ محمد عبدالحیٔ

فائزؔ تخلص بھی ہے اور بطور قلمی نام کے بھی استعمال کرتے ہیں۔ محمد عبدالحی نام، حضرت مولوی ہدایت علی خاں نقشبندی کے فرزند سوئم نسباً افغان، وطن اصل رام پور، سکونت مستقل جے پور۔ عربی فارسی کی تعلیم مولانا قدیر بخش بدایونی مفتی راجستھان سے جے پور میں حاصل کی۔ اردو فارسی اور انگریزی کی بہت سی اسناد کے مالک ہیں۔ پہلے سیاسیات خاص میدان تھا مگر اب احباب کی سرد مہری سے برداشتہ خاطر ہو کر کنارہ کش ہو گئے ہیں، مقرر بہت اچھے ہیں۔ طباع وذکی ہیں، شعر کم کہتے ہیں۔

دل زندگی کا راز ہے، آنسو ہے دل کا راز　　　وہ زندگی نہیں کہ نہ ہو جس میں سوز و ساز

قدسیؔ، ولی احمد خاں

قدسیؔ تخلص، نام ولی احمد خاں نسباً افغان نواب امیر خاں بانیٔ ریاست ٹونک کے پڑپوتے، والد بزرگوار کا نام صاحبزادہ احمد علی خاں اور جد امجد حضرت رونقؔ تھے۔ بزرگوں کا اصل وطن تو بیکانیر تھا۔

۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ جے پور اور لاہور کے مدارس میں سرکاری تعلیم حاصل کر کے ایم۔اے اور ایم۔ایف (علوم مشرقی) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آپ کے متعدد مضامین مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں جن میں طنز و مزاح کے ساتھ ادبی چاشنی اور بلند و شستہ خیالی خوب ہے۔ یہی آپ کا طرزِ خاص ہے۔

تصانیف:- ۱۔ مختصر دنیا　　۲۔ اچھوتا سفر　　۳۔ انشائے سلمٰی

۴۔محاوراتِ داغ ۵۔انگریزی محاورات باترجمہ اردو ہندی

دہلی و پنجاب یونیورسٹیوں، اجمیر بورڈ، اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن آف انڈیا کے پانچ چھ سال ممتحن رہ چکے ہیں۔ تعلیمی بورڈ میرواڑہ، سینٹرل انڈیا، ایجوکیشن کانفرنس اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے۔ مسلم ایجوکیشن کانفرنس علی گڑھ ریڈ کراس اور سینٹ جانس ایمبولنس سوسائٹی کے لائف ممبر ہیں۔

ریاست جے پور میں منصف مجسٹریٹ رہے پھر کچھ عرصہ ریاست سروہی میں چیف منسٹر رہے۔ پھر ریاست دوجانہ میں دیوان ریاست رہے پھر ریاست ٹونک میں منسٹر ان ویٹنگ اور بعد میں ہز ہائی نس نواب صاحب ٹونک کے ایڈوائزر (مشیر) فی زمانہ جے پور میں مستقل قیام ہے۔

شعر و سخن کا ذوق طبعی ہے اور نہایت ستھرا مذاق ہے۔ مولانا اطہر سے اصلاح لی ہے۔ اگرچہ کم کہتے ہیں مگر جو کچھ کہتے ہیں وہ خوب ہوتا ہے۔ متعدد نظمیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ آپ کے صاحبزادے ایم۔اے۔ ایل۔ ایل بی کا بھی ادبی ذوق اچھا ہے۔ ان کی بھی دو تصانیف ''راتیں اور باتیں'' اور ''اسلامی ریاستیں'' چھپ چکی ہیں۔

نمونۂ کلام

اِک ہجومِ یاس سے جس وقت گھبراتا ہوں میں
دم نکلتا ہی نہیں، گھبرا کے رہ جاتا ہوں میں

کوئی مجبوری وہاں ہے بالغ جلوہ گری
یہ دلاسا دے کے اپنے دل کو سمجھاتا ہوں میں

ان کا جلوہ دیکھ کر بے طرح، بے شرطِ قبول
اک وفورِ شوق میں سجدے کئے جاتا ہوں میں

آنے سے ضد، بلانے سے ضد، نامہ بر سے ضد
اللہ میری کیسی مصیبت کی بات ہے

قرآں پہ ہاتھ رکھ دیا مسجد میں بیٹھ کر
اس پر بھی بدگمان ہو حیرت کی بات ہے

قمرؔ، محمد ایوب خاں

تخلص قمرؔ، محمد ایوب خاں نام، نسباً افغان، وطن جے پور، والد بزرگوار کا نام غلام رسول خاں، جوفنِ نقشہ نویسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے جس کی شاہد جے پور کی متعدد عمارتیں ہیں مثلاً میوزیم وغیرہ۔

آپ کے مورث اعلیٰ الف خاں شہاب الدین محمد غوری کے لشکر میں بحیثیت اعلیٰ عہدہ دار فوج ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ انھیں قصبہ لوان علاقہ جے پور میں چار کنویں اور ایک سو ساٹھ بیگھہ زمین انعام ملی تھی اس لئے قصبہ مذکور میں سکونت اختیار کر لی، پھر آپ کے جد امجد چھوٹے خان جو گولہ اندازی میں کمال رکھتے تھے ۱۸۳۱ء جے پور آ کر فوج میں صوبہ دار ہو گئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس زمانہ میں صحیح گولہ اندازی ہی ضامن فتح ہوتی تھی اور یہ فن بنظر عزّت دیکھا جاتا تھا، اس وقت سے آپ کا خاندان گولہ اندازوں کا خاندان مشہور ہے۔

قمر ۱۸۹۳ یا ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے برادرم محترم عبداللہ خاں اور محمد شریف کاتب بال چندر پریس سے پائی، پھر الور چلے گئے، حفظ قرآن مجید کی تکمیل حضرت قاری سید واجد علی شاہ کی خدمت میں کی جن سے آپ کو بیعت بھی حاصل تھی۔ اس نسبت سے اپنے کو "واحدی" کہتے ہیں۔ علم تجوید کے بعد جے پور آنا پڑا۔ یہاں مولوی ریاض الحسن نارنولی سے پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات السنہ مشرقیہ کی تعلیم شروع کی اور باقاعدہ خیاطی کا فن سیکھا۔ ان کے انتقال کے بعد منشی عالم، مولوی، منشی فاضل کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے۔ ۱۹۴۰ء تک تقریباً ۶۰، ۷۰ طلبا کو امتحانات دلایا۔ ۱۹۱۵ء میں جے پور میں اپنی ذاتی دکان خیاطی

کی جاری کی۔ ۱۹۱۸ء میں چودھری نذیر احمد وکیل مرحوم کے مسلم راجپوت اسکول جے پور میں مدرس ہو گئے۔ جنوری ۱۹۲۵ء میں جے سنگھ ہائی اسکول کھیتڑی میں ہیڈ مولوی ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں جب انقلابی طوفان اٹھا اور نارنول میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تو بوجہ قرب کھیتڑی میں بھی اس کے اثرات ظاہر ہوئے لہٰذا ترک ملازمت کر کے جے پور چلے آئے اور نومبر ۱۹۴۷ء میں اس کا ئنشن مشن ہائی اسکول جے پور میں ہیڈ مولوی ہو گئے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

زیر تعلیم ہونے کے زمانہ میں شعر گوئی کا شوق ہوا پھر بزمانہ قیام جے پور منشی عزیز الرحمٰن اور ذہینؔ ورضیؔ کی تحریک پر شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے اور قمرؔ تخلص کر کے شعر کہنے لگے۔ حضرت حسرتؔ موہانی سے باقاعدہ تلمذ اختیار کیا جنہوں نے چند غزلیں دیکھنے کے بعد آپ کو فارغ الاصلاح کر دیا۔ مشق سخن کی تاکید فرمائی اور بصیرت کے لئے اپنے رسالہ ''نکات سخن'' اور ''محاسن'' سخن اور معائب سخن عنایت کئے جن سے آپ نے پورا استفادہ کیا۔

کلام میں پختگی زور، مضمون آفرینی اور روانی بخوبی پائی جاتی ہے، زبان واسلوب بیان بھی اچھا ہے۔

یہ حال ہے کہ پئے جا رہا ہوں مستی میں
ترا خیال ہی میرے لئے شراب ہوا

کبھی سکون کا باعث ہوئی پریشانی
کبھی سکون ہی خود وجہ اضطراب ہوا

کچھ تری حسن آفرینی میں اضافہ ہو گیا
بڑھ گیا ہے یا مرا ذوق نظر اب کے برس

دیکھ لیں اک بار ہم بھی تیری طوفاں خیزیاں
پھر برس ہاں پھر برس اے چشم تر اب کے برس

تیرا ضرور ہاتھ ہے قسمت کے ساتھ ساتھ
اے چرخ اس قمرؔ کے عروج و زوال میں

ذرا سا بھی نشاط بے خودی جس کو میسر ہے
وہ آخر ہوش میں کیوں آئے، کیوں ہشیار ہو جائے

تعجب ہے جسے کافی نہ ہو کونین کی وسعت
تصور میں وہی تصویر کیونکر کھینچ لی میں نے

مجھے دیکھو کہ میں اپنی پرستش آپ کرتا ہوں
کیا ہے اِک نیا ایجاد طرزِ زندگی میں نے

اور کچھ دیکھتے ہیں اہلِ نظر — حسن پر اکتفا نہیں کرتے
ہیں نمایاں ہزار پردوں میں — ان کے جلوے چھپا نہیں کرتے
سن رہے ہیں کان سے جو نغمۂ بے ساز ہم — یہ کسی مطرب کی پہچانی ہوئی آواز ہے
آہ پھنس کر رہ گئے ماحولِ رنگ و بو میں ہم — کس قدر محدود اپنی رفعتِ پرواز ہے
آج تو جی بھر کے کر لے کوئی سجدہ رہ نہ جائے — اے جبینِ شوق ان کا آستاں ہے سامنے
کیا سناؤں ہم نشیں افسانۂ عہد شباب — اب وہ اک بھولی ہوئی سی داستاں ہے سامنے
ہوئی نشو و نما ہی اپنی گرداب و تلاطم میں — ہمارا کیا بگاڑیں گے تصادم موج و طوفاں کے

ناطقؔ، سعید اللہ خاں

تخلص ناطقؔ، سعید اللہ خاں نام، باعلم شخص تھے۔ جے پور میں کہیں ملازم تھے۔

ہیں سب ہوائیں گلشنِ عالم کی سرسری — جو بندھ گئی ہوا وہ نسیمِ بہار ہے
حسرت نہیں کہ داغِ جگر شمعِ طور ہے — گر مر گئے تو واں بھی چراغِ مزار ہے

نطقؔ، عظیم اللہ خاں

نطقؔ تخلص، عظیم اللہ خاں نام، حضرت آگاہؔ کے شاگرد تھے۔ جے پور میں وکالت کرتے تھے ۱۹۳۵ء میں وہیں انتقال ہوا۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔

نہ اٹھے گا مرا سر آستانِ بے نیازی سے — مقدر ہو گیا ہے نقش پائے یار ہو جانا
ترے وعدے میں او ظالم خیالِ غیر حاضر تھا — کہ ہر اقرار کے پہلو میں اک انکار شامل تھا
تصور میں تصویرِ جاناں جو آئے — یقیں چوم لے پاؤں بڑھ کر گماں کے

تذکرہ نادر الہٰ آباد

نادر الہ آباد کے چند شاعروں کا تذکرہ جو ۱۲۴۷ھ میں لکھا گیا۔ مرتبہ اعتصام الدولہ وبیر الملک مرزا کلب حسین خاں نواب مرزا کلب علی خاں بہادر ہیبت جنگ کے فرزند تھے۔

مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب مطبوعہ ۱۹۵۷ء

بلیغ

امانت علی متوطن فرخ آباد، ولد محمدی خاں مصنف "انشائے چشمۂ فیض"

لخت جگرم خون شداز چشم تر افتاد — ایں دانہ یاقوت زدرج گہر افتاد

گردید مشرف زکمین صدر مکانم — عشق تو بدل آمد وسوداز سر افتاد

یک ضربت تو کرد بمن کار دو دستی — سراز تن من تن زسرم ہمدگر افتاد

برتافتہ ام روے خود از روضۂ رضواں — زاں روز کہ درکوچۂ جاناں گزر افتاد

از دست مسیحا گرہ کار چونہ کشود
آہر نقش بلیغ آمدہ ونوحہ گر افتاد

بہادر

بہادر خاں، ولد امداد علی خاں رئیس فیروز آباد۔ شاگرد خوش وقت علی خاں۔

شب فرقت میں اے دل نیند عاشق کی اچٹتی ہے — غضب کی رات ہوتی ہے، بڑی مشکل سے کٹتی ہے
وہ بہر فاتحہ گر بیٹھتا ہے آ کے تربت پر — تو اٹھ اٹھ کر ہماری خاک دامن سے لپٹتی ہے
زمیں کو نقش پائے یار سے رتبہ ملا ایسا — تبرک کی طرح سے خاک اس کوچے کی بٹتی ہے
لہو روتے ہیں ہر دم تیغ وابرو کی محبت میں — نئی صورت سے اپنی آج کل اوقات کٹتی ہے
صفائی کو بہادر ہم جو جائیں تو وہ کہتے ہیں — نہیں ملتی ہے برسوں تک طبیعت جبکہ ہٹتی ہے

ثناؔ

ثنا اللہ خاں ولد منور خاں باشندہ بھیکم پور۔

ایک ہچکی بھی نہ آئی دلِ ناشاد مجھے — بھول کر بھی نہ کیا اس نے کبھی یاد مجھے
پابدست ودگرو دست بدست دگرے — یوں کئے جاتی ہے گھر سے ترے افتاد مجھے
پر لگے پائینچے اپنے جو پکڑ کر وہ چلے — تھے تو انسان نظر آئے پری زاد مجھے
توبہ کرتا ہوں بڑے بول سے تھوکوں نہ کبھی — دخترِ رز کر کے مردار جو داماد مجھے
شعر عنقا مرے ہوتے ہیں ثناؔ روکش میر — کیا عجب ہے جو زمانہ کہے استاد مجھے

جوشؔ

نواب احمد حسن خاں بہادر عرف اچھے میاں صاحب لکھنوی خلف نواب مقیم خاں ابن نواب محبت خاں بن نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں والی ملک کیتھر شاگرد ظفریاب خاں۔

دیکھ کر وہ صفِ مژگاں دلِ شیدا ٹھہرا — مرحبا صف کے مقابل میں یہ تنہا ٹھہرا

وہ یہاں آئیں گے یا مجھ کو بلا بھیجیں گے قاصدا جلد بتا تجھ سے وہاں کیا ٹھہرا
عشق کے بوجھ کا گردوں متحمل نہ ہوا حاملِ بارِگراں خاک کا پتلا ٹھہرا
کون مجھ عاشقِ ناشاد کی فریاد سنے اِک زمانہ تو ترا چاہنے والا ٹھہرا
غیر ممکن ہے جو موقوف ہو رونا اے جوشؔ کس نے دیکھا ہے کہ بہتا ہوا دریا ٹھہرا

خبیرؔ

غلام محمد خاں رئیس فرخ آباد، ولد غلام قادر خاں شاگرد رشکؔ دو دواوین ہندی، فارسی وعروض پر تصانیف ہیں۔

اِک عالمِ خورشید ہے اس رشک پری کا ہے خطِ شعاعی کہ دوپٹہ ہے زری کا
مجھ کو نظر آتا ہے جو خورشیدِ جہاں تاب پردے میں یہ عالم ہے تری جلوہ گری کا
ہے دیدۂ تر سے نہ لبِ خشک سے فرصت دن رات سفر مجھ کو ہے خشکی وتری کا
ہے ماہ پہ آگے ترے مہتاب کا عالم خورشید میں نقشہ ہے چراغ سحری کا
اس حور کو لکھتا ہوں خطِ شوق خبیرؔ اب پر ہے پئے خامہ مجھے درکار پری کا

خورشیدؔ

خورشیدؔ خوش وقت علی خاں ولد داؤد خاں، تھانیدار باشندہ اکبرآباد شاگرد برقؔ۔

بوئے دہانِ تنگ تم جی پھڑک گیا یہ کس طرف گلاب کا غنچہ چٹک گیا
ایذا اٹھا چکا ہوں محبت کے درد کی کھینچی کسی نے آہ، مرا دل دھڑک گیا
رعشے کا روگ دے کے جوانی چلی گئی آیا یہ زلزلہ کہ خزانہ سرک گیا

گردن میں ہے کمندِ محبت پڑی ہوئی　　جتنے کھنچے حضور میں آگے سرک گیا

خورشید مرحبا یہ محبت کا جوش ہے
آئی بہار، ہاتھ میں ساغر چھلک گیا

داد

مولا داد خاں، باشندہ لکھنؤ

حسینوں کے رخِ گلگوں سے ہے چمن کی بہار　　قدم سے وحشیوں کے ہر طرف ہے بن کی بہار
ہر اک نے رشک سے اپنی قبا کو چاک کیا　　گلوں نے جب سے سنی تیرے پیرہن کی بہار
عجب سرور سے کاٹی شبِ وصالِ صنم　　دکھائی بنتِ عنب نے ہمیں دولھن کی بہار
یقین ہے نہ کبھی جائیں سیرِ گلشن کو　　نظر کریں وہ شہیدوں کے جو چمن کی بہار
نہ جائے باغ میں رشکِ چمن مرا اے درد　　شہیدِ ناز کے دیکھے اگر کفنی کی بہار

رعنا

محمد مرداں علی خاں متوطن مراد آباد ولد رحم علی خاں۔ مصنف کتاب ''غنچۂ راگ''۔

خدا کی یاد میں بیٹھے ہیں دنیا سے کنارے ہم
نفس گنتے ہیں دن کو، رات کو گنتے ہیں تارے ہم
فراقِ یار میں ہم زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے
کوئی دم ہی کے اب مہمان ہیں دنیا میں بارے ہم

خدا کی شان ہے پھر دن پھرے، جان جہاں آیا
کنارِ یار میں آئے ہوئے غم سے کنارے ہم
کئی دن سے کھڑے در پر تمہاری راہ تکتے ہیں
صنم اب بے اجل مرتے ہیں لو حسرت کے مارے ہم
اُمیدِ وصل ہے رعنا تو کوئی دم کے مہماں ہیں
وگر نہ ہو چکے ہیں زندگی سے اب کنارے ہم

سروشؔ

امداد علی خاں ابن منو خاں۔ باشندہ فرخ آباد۔

بوسۂ لب نہ دیا آپ نے خوش دل ہو کر — رہ گیا منہ لئے اپنا سا میں سائل ہو کر
عارضِ ماہ سے چھٹنے کا نہیں داغِ کلف — وہ اگر آئے ترے سامنے کامل ہو کر
نقدِ دل کی مرے کرتے ہیں تمنا محبوب — دوڑتے ہیں کفِ رنگیں کفِ سائل ہو کر
دور پہلو سے نہیں چاہئے مینائے شراب — شیشۂ بادہ رہے آبلۂ دل ہو کر
روئے رنگیں کا تصور ہے مگر دل میں سروشؔ — دل خوں گشتہ بہا اشک کے شامل ہو کر

سہیلؔ

ارتضٰی علی خاں ابن مولوی احمد علی خاں۔ متوطن فرخ آباد۔

دشمن نظر آتا ہے ہر اک برہمن اپنا کس راہ سے ہو رام بتِ بے دہن اپنا
اللہ سے ہر دم یہ دعا مانگتے ہیں ہم مل جائے وہ بت دور ہو رنج و محن اپنا
پھولوں سے منڈھوں گا قفسِ بلبلِ شیدا جس روز ملے گا وہ بتِ گل بدن اپنا
کیا کیجئے اس شوق سے اظہارِ محبت باور نہیں آتا ہے اسے یہ سخن اپنا
کس واسطے آزردہ طبیعت ہے سہیلؔ آج کیا حال ہے کچھ تو کہو رنج و محن اپنا

شفقؔ

محمد علی خاں ناخن نگار ولد مولوی احمد علی خان۔ متوطن فرخ آباد۔

بوسہ ہوا حصول جو خالِ حبیب کا چمکا ہے مدتوں میں ستارا نصیب کا
کیا پوچھتے ہو منزلِ ہستی کی بود و باش کہتے ہیں جس کو گور وہ گھر ہے غریب کا
ماتھا رگڑ رہا ہوں ترے آستان سے لکھا مٹا رہا ہوں میں اپنے نصیب کا

شوقؔ

محمد جہانگیر خاں۔ باشندہ فتح گڑھ۔

عالم میں دھوم بس ترے جور و جفا کی ہے پھر کیا امید شوقؔ کو مہر و وفا کی ہے
وہ کون ہے جو چوٹی سے رکھتا نہیں ہے ڈر دہشت کلیم کو بھی اسی اژدہا کی ہے
آواز ہے اذاں کی نہ گھڑیال کی صدا ہے ہے شب فراق یہ کیسی بلا کی ہے

منت کا طوق آج جو اس نے بڑھا دیا توڑی یہاں جنوں نے بھی زنجیر پا کی ہے
تیرا وسیلہ احمدؐ مختار سے ہے شوقؔ ناحق کو فکر اب تجھے روز جزا کی ہے

طالبؔ

محمد طالب علی خاں نقشہ نویس انگریزی متوطن انولہ ضلع بریلی خلف دلاور علی خاں۔

زار اس قدر مرا بدنِ زار ہوگیا پہچاننا اجل کو بھی دشوار ہوگیا
آئی نہ بات یوسف مصری کو پیش یاد اس درجہ محو خوبیٔ گفتار ہوگیا
اس بت کے چار ہوتے ہی میں برہمن بنا تارِ نگاہ رشتۂ زنار ہوگیا
صیاد مرغ دل مرا نازک ہے اس قدر زنجیر بوئے گل میں گرفتار ہوگیا
بوسہ لیا جو رخ کا وہ طالبؔ خفا ہوئے مصحف کو چوم کر میں گنہگار ہوگیا

طبیبؔ

حکیم محمد حسن خاں ولد مولوی فتح علی خاں فقیر متوطن فرخ آباد

سرو گلشن جو ترے قد کے برابر نکلے کچھ نہ کچھ شاخ بھی اے رشکِ صنوبر نکلے
کھول دو عارضِ پُر نور، چلے دورِ شراب چاندنی کھیت کرے مہرِ منور نکلے
فتنۂ حشر بھی جھک جھک کے قدم لیتا ہے تم تو دو ہاتھ قیامت سے بھی بڑھ کر نکلے
زلف ہے اژدرِ موسیٰ، یدِ بیضا، کفِ پا سر سے تم پاؤں تک اعجازِ پیمبر نکلے

عزیزؔ

نواب عبدالعزیز خاں ابن نواب محمد سعادت یار خاں ابن نواب معظم الدولہ حافظ محمد یار خاں ابن حافظ الملک حافظ رحمت خاں۔

نوشِ جاں جب مے خم خانہ وحدت ہوگی
شیخ مے خانہ میں کعبہ کی زیارت ہوگی

نام رکھیں وہ ہم لیں گے اگر نامِ جفا
بات شکوے کی کہیں گے تو شکایت ہوگی

آمدِ یار سے خوش ہے دلِ ناتجربہ کار
نہیں واقف کی قیامت دمِ رخصت ہوگی

شبِ مہتاب دکھائے گی مجھے اور سیاہ
غائب آنکھوں سے جو وہ چاند سی صورت ہوگی

دیکھو دزدیدہ نظر سے اسے محفل میں عزیزؔ
دیکھ لے گا جو تمہیں وہ تو قیامت ہوگی

غناؔ

غلام محمد خاں خلف بہادر خان متوطن اورنگ آباد ضلع بلند شہر۔

زلف ناگن نہیں تو پھر کیا ہے
چشم رہزن نہیں تو پھر کیا ہے

وعدہ اک دن وفا نہیں کرتا
یار پرفن نہیں تو پھر کیا ہے

شب دیجور زلف میں رخ یار
ماہِ روشن نہیں تو پھر کیا ہے

آتشِ غم ہے جس میں شعلہ زن
سینہ گلخن نہیں تو پھر کیا ہے

مسی مالیدہ لب غناؔ اس کا
برگ سوسن نہیں تو پھر کیا ہے

گویاؔ

حسام الدولہ فقیر محمد خاں رسالہ دار قوم افغان آفریدی متوطن مرزا گنج (ملیح آباد) خلف بلند خان شاگرد خواجہ وزیرؔ۔

نا قدر تھا کہ کچھ نہ وہ سمجھا بہائے دل　　اس غم سے ہے زبان پہ میرے کہ ہائے دل

داغِ فراق خلق ہوا ہے برائے دل　　اس درد سے کوئی نہیں واقف سوائے دل

ہر دل کو مثلِ قصۂ یوسف عزیز ہو　　موزوں کروں غزل میں اگر ماجرائے دل

اللہ دردِ عشق نے کیسا کیا ہے تنگ　　دل میں نہ جائے غم ہے نہ پہلو میں جائے دل

مدفوں ہوا ہے کون سا کشتۂ زمیں　　گویا صدا جو قبر سے آتی ہے ہائے دل

نظیرؔ

نظیر محمد خاں خلف محمد فیض خاں سابق کوتوال فرخ آباد۔

باتیں کرنے کا وہ موقع جو نہیں پاتے ہیں　　وعدۂ وصل اشاروں میں ہی کر جاتے ہیں

دُرد بھی دے گا تو انکار نہیں ہے ساقی　　ہم بلا نوش جو پاتے ہیں وہ پی جاتے ہیں

میری جانب سے کوئی جا کے یہ اس سے کہہ دے　　اب تو صدمے نہیں فرقت کے سہے جاتے ہیں

ملک الموت سے کہہ دو کہ چلو رخصت ہو　　جاں بہ لب ہجر میں جس کے تھا وہ اب آتے ہیں

صدمے آغاز وفا میں جو اُٹھائے ہیں نظیرؔ

وصل ہوتا ہے تو راحت بھی وہی پاتے ہیں

نفیسؔ

دلاور خاں ابن بھورے خاں متوطن فرخ آباد شاگرد میاں جعفرؔ

کیا بات سنے وہ بتِ پیر ہماری
موسیٰ کے برابر نہیں تقریر ہماری

کچھ فصل بہاری میں جنوں رنگ نہ لایا
پاؤں میں پڑی آہ نہ زنجیر ہماری

قسمت میں نہ ہو فصل تو تدبیر ہے بیکار
مجبور ہے تقدیر سے تدبیر ہماری

اللہ کی قدرت ہے جو سنتے ہیں کچھ اشعار
کرتے ہیں نفیسؔ اب تو وہ توقیر ہماری

نواؔ

ظہور اللہ خاں بدایونی، ولد مولوی دلیل اللہ

تیر پہ تیر یار کا سینے میں شب گزار تھا
رخنۂ زخم ہر خدنگ دیدۂ انتظار تھا

اشکوں کے ساتھ نکلی یاں مدتوں کی کدورتیں
گریہ نے دھو دیا تمام دل میں جو کچھ غبار تھا

کیجو نہ اے رقیب تو اس کی مصاحبی پہ ناز
کچھ دنوں بزم یار میں ہم کو بھی اعتبار تھا

کھولی تھی چین زلف سے کس نے گرہ کنارِ بحر
موج رواں میں ہر حباب نافۂ مشکبار تھا

وفاؔ

محمد علی خاں اہلکار عدالت دیوانی ضلع شاہجہانپور ولد مولوی احمد علی خان خوشنویس۔

دل میکدے میں خاک ہوا جام کے لئے
جا کر کہیں نگین بنا نام کے لئے

غافل نہیں ہوں ذکر سے دم بھر میں اے صنم　　حق نے زبان دی ہے ترے نام کے لئے
اس ماہ وش کے ہجر میں روشن ہے شمع آہ　　کچھ حاجتِ چراغ نہیں شام کے لئے
ہم سے اُٹھیں گے ناز نہ بیجا حضور کے　　مزدور ڈھونڈھئے کوئی اس کام کے لئے

کچھ اور احتیاج نہیں ہم کو اے وفاؔ
کافی ہے ایک شعر فقط نام کے لئے

یارؔ

امام خاں ولد چاند خاں متوطن فرخ آباد

مرے قتل کو شاید آئے ہوئے ہیں　　جو وہ آستیں چڑھائے ہوئے ہیں
اٹھائیں بھلا ہم نہ کیوں روز ذلت　　وہ دل سے، نظر سے گرائے ہوئے ہیں
وہ کیوں اپنے وعدہ پہ آئیں گے شب کو　　سنا ہے کہ مہندی لگائے ہوئے ہیں
نہ چھیڑ اے فلک ہم کو ہجرِ بتاں میں　　غم و رنج کے ہم ستائے ہوئے ہیں
کیا ان کے گیسو نے جن کو کہ ابتر　　وہ اے یار آفت میں آئے ہوئے ہیں

یوسفؔ، یوسف خاں

اس جنگجو کی جب کہ جبیں پر شکن پڑے　　یہ کشت وخوں جہاں میں ہو رن پہ رن پڑے

کاٹا پہاڑ دل میں نہ شیریں کے گھر کیا　　پتھر ترے نصیب پر اے کوہ کن پڑے
تیغِ زباں جو معرکہ میں ہم علم کریں　　حاسد کو بھاگنے کے سوا کچھ نہ بن پڑے
گھر سے نکالا غیر کے کہنے سے آپ نے　　اب جا کے کس جگہ یہ غریب الوطن پڑے
اغیار کی طرح سے اسے لاؤ اپنے گھر
یوسفؔ یہ چال خوب ہے تم سے جو بن پڑے

حیرتؔ

محمد جان خاں ولد باز خاں باشندۂ الٰہ آباد

رخصت جہاں کے باغ سے روحِ رواں کی ہے　　جاتی ہے آج بوئے گلِ تر جہاں کی ہے
کیوں خود بخود ہے آج معطر مرا دماغ　　خوشبو یہ کس کے گیسوئے عنبر فشاں کی ہے
کس نور سے بنے ہو ٹھہرتی نہیں نگاہ　　رُخ پر تمہارے یار تجلی کہاں کی ہے
مرقد سے میرے اٹھ کے بگولا جو رہ گیا　　کہنے لگے وہ خاک کسی ناتواں کی ہے
حیرتؔ جو سو رہے ہیں یہ خوابیدگانِ خاک
تم کو غنودگی اسی خوابِ گراں کی ہے

حالِ شاعر بزبانِ شاعر

''شعرستان'' تذکرہ شعرائے پاکستان

ادبؔ

لوگ مجھے سعید خان کہتے ہیں، ادبؔ تخلص کرتا ہوں۔ چونکہ علامہ سیماب نے مجھے شعر وشاعری سے صحیح طور سے روشناس کرایا اس لئے مرحوم سے دلی عقیدت کی بنا پر سیمابی کہلانا پسند کرتا ہوں۔

کبھی میرا وطن گریواڑی تھا، لیکن اب میرے لئے ملتان کی زمین ہی سب کچھ ہے۔ کچھ وجوہات کی بنا پر میری تعلیم پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی لیکن اہلِ علم حضرات کی صحبت نے تعلیم کو کسی حد تک پورا کردیا۔ شعروادب کا ذوق مجھے ترکہ میں ملا، اس لئے طبیعت ابتدا سے شعرگوئی کی طرف راغب رہی، لیکن پے در پے صدمات کی وجہ سے طبیعت پر ایک عرصہ تک جمود طاری رہا۔ ۱۹۳۷ء میں علامہ سیمابؔ سے تعلق ہوگیا۔ میری زندگی میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں جسے تحریر کروں۔

نمونۂ کلام

آسان سمجھتا ہوں رہِ عشق کی سختی
مشکل بھی ہے اب تو مری مشکل سے بہت دور

نہ پوچھو عشق کی دنیا میں کیا معلوم ہوتا ہے
مسلسل آفتوں کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے

نہ وہ اپنے، نہ دل اپنا، نہ دنیائے خوشی اپنی
کہاں لے جاؤں یارب یہ پریشاں زندگی اپنی

وہ کسی کا منظر اب تک خیال میں ہے
ہوتی رہیں جفائیں دیکھا کیا زمانہ

رسوائی محبت دل کو نہیں گوارا
مجھ کو ادبؔ کسی سے الفت ہے غائبانہ

دیکھتا ہوں ان کی نظریں بے نیازِ التفات
میں نہیں تاثیرِ الفت کا ادبؔ قائل ابھی

ہے عجب آتش بھرا دل تیرے دیوانوں کے پاس
آگ سی محسوس ہوتی ہے گریبانوں کے پاس

چرخ پر کالی گھٹائیں ساقیا ساغر بکف
واعظا! توبہ شکن ہے یہ سماں میرے لئے

ابرِ بہار کالی گھٹائیں کہاں ادبؔ
ملتان میں تو موسمِ برسات ہی نہیں

حسن والے جو باوفا ہوتے
نہیں معلوم کیا سے کیا ہوتے

ان کے حریمِ ناز کی پابندیاں نہ پوچھ
یہ حکم ہے۔ ذکرِ وفا بھی نہ ہوسکے

اسدؔ

میرا نام محمد اسد خان، والد مرحوم کا اسم گرامی خاں غلام تھا، قادر خان قوم افغاں شیرانی۔ تاریخ پیدائش ۱۲ر رمضان ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۳ر دسمبر ۱۹۰۲ء مقام پیدائش کڑی افغانان ملتان شہر۔ مشن اسکول ملتان اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۴ء میں بی۔اے پاس

کیا۔ ۱۹۲۶ء میں امتحان مقابلہ میں کامیاب ہوکر گورنمنٹ آف انڈیا سکریٹریٹ میں ملازم ہوا۔ فارن اینڈ پولیٹکل ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ اور سپرنٹنڈنٹ رہا۔ پاکستان بننے پر وزارت خارجہ میں سپرنٹنڈنٹ اور بعدازاں وزارت سرحدات میں اسسٹنٹ سکریٹری ہوا۔ اس طرح کوئی بیس برس دہلی وشملہ میں گزرے اور اب چار سال سے کراچی میں قیام ہے۔

شاعری کا آغاز نو دس برس کی عمر سے ہوا۔ باقاعدہ اصلاح کسی سے بھی نہیں لی البتہ ایک نظم پر حضرت علامہ اقبال نے خود اصلاح فرمادی اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ۱۹۲۱ء کے سالانہ مقابلہ میں اس نظم کو اول قرار دے کر انعام کا مستحق ٹھہرایا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اردو اور فارسی کی مختلف نظمیں ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' میں شائع ہونے لگیں۔ بعض فارسی نظمیں افغانستان کے جرائد میں بھی نقل کی گئیں۔ مجموعہ کلام ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ چند مجموعے زیر ترتیب ہیں۔

عجب کیا ہے جو اس کی قدر پہچانی نہیں جاتی
جنوں کے سائے تک بھی عقلِ انسانی نہیں جاتی

یہ ہے موجود بچپن میں، جوانی میں، بڑھاپے میں
بدلتی ہے مگر انساں کی نادانی نہیں جاتی

ہنسی پھولوں کی اور شبنم کے آنسو دیکھ کر بیجا
چمن میں دیدۂ نرگس کی حیرانی نہیں جاتی

قیامت ہے بہشتِ جاوداں میں بھی نہیں تسکیں
یہاں بھی دل سے یادِ عالمِ فانی نہیں جاتی

نہایت دلکشا ہے تیرے جلووں کی فراوانی
مگر ان سے نظر کی تنگ دامانی نہیں جاتی

مٹے شبنم کے قطرے اور بڑھی پھولوں کی رنگینی
جہاں میں رائیگاں کوئی بھی قربانی نہیں جاتی

اسد جب تک جہاں میں ربطِ حسن و عشق باقی ہے
سخن سنجی نہیں مٹتی، غزل خوانی نہیں جاتی

رہیں نہ رند یہ واعظ کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

ہیں کچھ طیور فضائے چمن کے زندانی
فقط اسیری دام وقفس کی بات نہیں

نگاہ بھی نہیں اٹھتی بلندیوں کی طرف
طلب کا ذکر نہیں، دسترس کی بات نہیں

کل بھی تو آج بن کے نکل جائے گا یونہی
قبضے میں ترے آج نہیں ہے تو کل کہاں

زاہد شعورِ حسن سے بیگانہ ہی رہا
حسن نظر نہیں ہے تو حسنِ عمل کہاں

خطیب سے خطاب

تجھ کو تقریر سے مطلب، مجھے اشعار سے کام
حالتِ قوم کی پروا نہ تجھے ہے، نہ مجھے

غیروں کے اعتراض مبارک کہ ہم میں پھر
تائیدِ حق کا ولولہ پیدا ہوا تو ہے

افرنگ سے حجاز کی جانب پھرا ہے رخ
قبلہ بنائے قوم کا سیدھا ہوا تو ہے

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر
وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

اسی سے بجھتی ہے شمع، اسی سے روشن ہے
خبر نہیں یہ ہوا دوست ہے کہ دشمن ہے

ظہور ہر گلِ تازہ نمود ہر مہِ نو
کوئی بتائے یہ جلوے جدید ہیں کہ قدیم

خیال کو بھی اسیرِ نگاہ کرتا ہے
مری نظر میں مصوّر گناہ کرتا ہے

ہمت ہے تو کر پیدا فردوسِ حیات اپنا
بخشی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا

کیا بڑھائیں گے کسی دامن کی جانب دستِ شوق
جن کی خود اپنے گریباں تک نہیں ہے دسترس

جو کوئے یار کو جاتے ہیں وہ ہشیار ہیں
کہ خلدِ راہ میں پڑتا ہے امتحاں کے لئے

فنا یہی ہے کہ دل میں نہ ہو یقینِ بقا
بقا یہی ہے کہ اندیشۂ فنا نہ کریں

اصطفیٰ لکھنوی

الحاج محمد اصطفا خاں، قنوج ضلع فرخ آباد میرا وطن مالوف ہے جو قدامت کے لحاظ سے آج بھی بہت سی باتوں میں سرتاج ہے۔ والد بزرگوار قبلہ مکرم حاجی محمد مرتضیٰ خاں ادخلہ اللہ فی الجناں قوم مہمند افغانی خصوصیات کے مالک اور حسن اخلاق کا مظہر تھے۔ میرے مورث اعلیٰ محمد یعقوب خاں بن محمد ابراہیم خاں افغانستان کے شہر غور سے حضرت بالا پیر رحمت اللہ علیہ کی ہمرکابی میں ایک مرید کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے۔ ہمارا آبائی مکان ابھی تک محلہ بالا پیر میں مرحوم آباء واجداد کی یادگار ہے۔ میں اسی مکان میں بوقت ۹ بجے شب بتاریخ ۲۰ محرم ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۹۲ء عالم شہود میں وجود پذیر ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں استاد محترم سید عبدالحکیم سیف شاہجہانپوری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

نمونۂ کلام

شبابِ رفتہ کے شام وسحر خدا کی پناہ
نہ اصطفا سے یہ پوچھو کہ کس طرح گزرے

دے درد کچھ ایسا کہ جو مجھ میں پیدا احساسِ دل کردے
وہ درد ہے کوئی درد بھلا جو درد مجھے غافل کردے
کیسی ہی پڑے تجھ پر مشکل تو دل میں یقینِ کامل رکھ
اک پل میں اگر وہ چاہے تو آسان تری مشکل کردے

بہزاد

سردار احمد خاں لکھنوی سنِ پیدائش ۱۹۰۲ء وطن لکھنؤ ہے، مکان لکھنؤ کے وسطی محلّہ امین آباد میں تھا۔ غالباً تیسرے درجہ سے شعر کہنا شروع کیا۔ عرصہ تک ریلوے میں ٹی۔ٹی۔ رہا،

اختلاجِ قلب کی شکایت کی وجہ سے ملازمت چھوڑی، سات برس تک عالمِ جذب میں رہا لیکن ہوش تھا۔ قدرے سکون کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی میں مصنف کی حیثیت سے رہا۔ ۱۹۴۰ء میں پنچولی فلم کمپنی لاہور میں بطور مکالمہ نویس ۱۹۴۳ء تک رہا۔ ۱۹۴۶ء میں نغمہ نگار کی حیثیت سے راج کمل کلامندر بمبئی میں ملازم ہوگیا اور ۱۹۵۱ء تک فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا رہا، متعدد مجموعہ کلام نکلے، نغمۂ نور، کیف وسرور، موج طور اور چراغ طور وغیرہ کافی مقبول ہوئے چالیس پینتالیس فلموں کے گانے لکھے۔ آدمی مذہبی ہوں، میرا تعلق خانقاہ نیازیہ بریلی شریف سے ہے، گوشہ نشیں آدمی ہوں، نعت کہنے کا ذوق ہے۔

مری بے خودی کا نظام اللہ اللہ — سرِ شوق غم گام گام اللہ اللہ
زنطقِ تمنا حدیثِ محبت — کلیم اللہ اللہ کلام اللہ اللہ
ہر اِک گام جلوہ، ہر اِک گام حیرت — سرِ راہ یہ اہتمام اللہ اللہ
مری آہ کا نام اللہ اکبر — مرا نالۂ نا تمام اللہ اللہ
ہوائیں ہیں چپ چپ، فضائیں ہیں ساکت — دبے پاؤں ان کا خرام اللہ اللہ
زہے جذبِ الفت جنوں کی یہ ہمت — کہ چھینا خرد کا مقام اللہ اللہ

فروغِ درِ یار بہزاد نکلا
مرا سجدۂ بے قیام اللہ اللہ

وہ ہزار سامنے ہوں، کریں لاکھ رونمائی — انھیں دیکھنے نہ دے گی یہ نظر کی پارسائی
یہ تو ہی بتا دے زاہد ہے ریا کہ بے ریائی — مرا جذبۂ ندامت، تری شانِ پارسائی
ترے آستاں کے صدقے کوئی حد بھی کیف کی ہے — کہیں مست ہو نہ جائے مرا ذوق جبہ سائی
میں جہاں سے منہ پھرا کر ترے پاس آرہا ہوں — کوئی اور کیا بھرے گا مرا کاسۂ گدائی
مری الجھنوں سے پوچھو، مری دھڑکنوں سے پوچھو — بڑی منزلوں سے گذری ہے فغاں کی نارسائی

مری زندگی ہے مستی، مری زندگی کا حاصل
نہ جنوں، نہ ہوش مندی، نہ وفا، نہ بے وفائی

مری بے خودی تصدق، مری مستیاں نچھاور
وہ ادھر ہی آ رہے ہیں بکمال دلربائی

تری رہ گزر کے پھیرے، ترے آستاں کے سجدے
یہی ہیں مری خطائیں، یہی میری پارسائی

....

خبر نہ تھی تیری جستجو میں کشاکش رہروی ملے گی
قدم قدم پر جبیں جھکے گی، قدم قدم آگہی ملے گی

تمہیں مبارک مرا تڑپنا، مجھے مبارک تمہارے جلوے
یہ دونوں عالم رہیں سلامت جہاں کو آسودگی ملے گی

نہ ڈھونڈھ ہم کو نگاہ عالم، جہاں پہ میں ہوں جہاں پہ وہ ہیں
جہاں بھی کھویا ہوا ملے گا، فضا بھی کھوئی ہوئی ملے گی

ابھی نہ چھیڑو، ابھی نہ چھیڑو، ابھی تو ذوقِ طلب میں گم ہوں
یہ راز کیوں مجھ پر کھولتے ہو کہ اور مشکل ابھی ملے گی

خرد کے دھوکے میں آ رہا ہوں، جنوں سے دامن بچا رہا ہوں
سمجھ رہا ہوں یقیں میں پھنس کر سکون کی زندگی ملے گی

ہمیں تو ہر ذرہ میکدہ ہے کہ ہم تو ہیں تیرے رند ساقی
مگر کہاں مستیاں ملیں گی، مگر کہاں بے خودی ملے گی

گماں کے ہاتھوں خراب وخستہ کدھر یہ دیوانے جا رہے ہیں
کہیں نہ کعبہ، نہ بتکدہ ہے، ملی تو ان کی گلی ملے گی

بہارؔ، محمود الحسن خاں کوٹی

میرا نام محمود الحسن خاں ہے۔ ضلع فتح پور ہسوہ (یوپی بھارت) کے قصبہ کوٹ میں جو دریائے جمنا کے بائیں کنارے پر آباد ہے اور کھوکھر پٹھانوں کی مشہور بستی ہے جولائی ۱۹۰۸ء کی کسی تاریخ میں ایک متوسط درجہ کے زمیندار گھر میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا اسم گرامی بدر الحسن خان ہے جو بفضلہٖ بقید حیات ہیں اور بھارت ہی میں رہ رہے ہیں۔ میرے جد اعلیٰ (ملک بہل خاں) کو شاہانِ مغلیہ سے ۱۲ گاؤں معافی میں ملے تھے۔ کوٹ ان ہی میں سے ایک ہے۔

اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ قرآن شریف مولوی حافظ محمد حسن ایرانی مرحوم نے ختم کرایا۔ ورنا کیولر فائنل کا امتحان اردو اور ہندی میں کوٹ کے گاؤں اسکول سے پاس کیا۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ اجمیر میں گزرا جہاں کمشنر اجمیر مارواڑ کے دفتر میں کلرک اور پھر برانچ انچارج کی حیثیت سے تقسیم ملک کے قبل تک مامور تھا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں پاکستان آیا اور جب سے اب تک ایک فرم میں کام کر رہا ہوں۔

مجھے اردو، انگریزی فارسی اور ہندی ادب سے برابر لگاؤ ہے اور ان چاروں زبانوں سے بے تکان استفادہ کرتا ہوں۔ شعر ۱۰، ۱۱ سال کی عمر سے کہہ لیتا تھا۔ سب سے پہلی غزل ۱۹۲۸ء میں لاہور کے ادبی دنیا میں شائع ہوئی۔ ایک زمانہ میں افسانے بھی لکھے ہیں ان کا مجموعہ ۱۹۴۵ء میں رائل ایجوکیشنل بک ڈپو نے ''خاکستر'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ دوسرا مجموعہ ''گل گیر'' اسی بک ڈپو نے ۱۹۴۷ء میں مجھ سے لے لیا۔ یہ مجموعہ مارکیٹ میں آیا ہی تھا کہ فسادات شروع ہو گئے اور اس طرح یہ بھی ناپید ہو گیا۔ حضرت عیشؔ فیروز پوری (خاندان امیریہ) کے تلمذ کا مجھے فخر حاصل ہے جنہوں نے میرے طالب علمی کے زمانے میں میرا کلام دیکھا، ۱۹۲۱ء میں

فارغ الاصلاح قرار پایا۔ زندگی سادہ اور ضروریات بیحد مختصر رکھتا ہوں۔ ہر قسم کے شوق سے مبرا، خوشامد اور تملق سے فطری طور پر متنفر ہوں۔ خودداری عزیز ہے۔ دو نظمیں اور دو غزلیں حاضر ہیں۔ انتخاب کی ضرورت نہیں محسوس کرتا اس لئے کہ جو کچھ کہتا ہوں بزعم خود چھان پھٹک کر کہتا ہوں۔

ایک کروٹ اور بھی

وہی عالمِ پیچ وتاب آج تک ۔۔۔ وہی شورشِ اضطراب آج تک

وہی سوزشِ روح فرسا ہنوز ۔۔۔ وہی جاں گسل التہاب آج تک

وہی بندگی کی فتادہ روش ۔۔۔ وہی خواجگی کا عذاب آج تک

وہی التجائے کرم گستری ۔۔۔ وہی بابِ عالی جناب آج تک

وہی مے گرو میکش ومیکدہ ۔۔۔ وہی دور جام شراب آج تک

وہی پیاسی پیاسی حریص انکھڑیاں ۔۔۔ وہی بہکا بہکا شباب آج تک

وہی تونسے تونسے سے سروچمن ۔۔۔ وہی جھلسے جھلسے گلاب آج تک

کہاں کا اُجالا، کہاں کا سحر ۔۔۔ ہے شیشوں میں بند آفتاب آج تک

تلاطم ہے اِک عمر سے تہہ نشیں ۔۔۔ اُبھرتے رہے ہیں حباب آج تک

کبوتر ہے مصروفِ صید افگنی ۔۔۔ نشیمن گزیں ہے عقاب آج تک

ہے اس مردِ حق کوش کا منتظر ۔۔۔ خدا کی قسم انقلاب آج تک

کہ جس کی ہر اک سانس میں متصل ۔۔۔ دھڑکتا ہے سبطِ محمدؐ کا دل

۱؎ جوش کا شعر تصرف کے ساتھ

مرے سینۂ پاک میں متصل
دھڑکتا ہے مولا رسالت کا دل
جوش

شاعر کا گھر

ہم جیسے کسمپرس پراگندہ حال لوگ — رہتے ہیں اس دیار میں، گاندھی نگر ہے یہ
یہ پست جھونپڑے، یہ شکستہ مکاں، یہ دھول — ویرانہ درکنار بیاباں بہ سر ہے یہ
بھونچال مل رہے ہیں ہر اک موڑ پر یہاں — اک تازہ انقلاب کا پیغامبر ہے یہ
میں ہوں فریب خوردہ لیلائے حریت — ماتم گسار وعدۂ نا معتبر ہے یہ
گاندھی نگر ہے یہ

تنگ اور چشمِ حاسدِ کم ظرف سے بھی تنگ — تاریک اور قبر سے تاریک تر ہے یہ
نصف النہار سے بھی پرے جا چکا ہے مہر — اب تک امیدوار نمود سحر ہے یہ
پابندگی میں رشکِ طلسمِ خیال وخواب — کہنہ سنی میں غیرتِ عمرِ خضر ہے یہ
پھر بھی نزولِ شعر سے ہوتا ہے مفتخر — اس حال میں بھی مہبطِ شمس وقمر ہے یہ
شاعر کا گھر ہے یہ
گاندھی نگر ہے یہ

جلے ہوں گے نشیمن، اٹھ رہا ہوگا دھواں لیکن — مجھے تو یہ غبارِ کارواں معلوم ہوتا ہے

دلاورؔ حکیم دلاور خاں دھولپوری

میں ریاست دھولپور کا باشندہ ہوں اس ریاست کے قصبہ باڑی میں میری پیدائش ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ اسی قصبہ میں میرا دیار تھا۔ میں شکم مادر ہی میں پانچ ماہ کا تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ جب میں اس دنیا میں آیا تو سرپرستی کرنے والا کوئی نہ تھا سوائے والدہ کے۔ جب کچھ ہوش آیا تو گھر میں کتابوں کے ڈھیر اور کاغذات کے پلندے دیکھ کر پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تو خود ہی جا کر مدرسہ محمدیہ میں داخل ہوگیا اور کچھ علم حاصل کیا۔ دل میں شوق اٹھا کہ قرآن شریف حفظ کروں اس کے واسطے گوالیار گیا اور انجمن مدنی میں داخل ہوگیا مگر آرزو بر نہیں آئی۔ گھر میں طبی کتابوں کا مطالعہ کیا تو علم طب کا شوق ہوا اور حکیم محمد یعقوب سے پڑھنا شروع کر دیا۔ تقریباً سات سال ان کے پاس پڑھا۔ ان کے مطب میں دواسازی کا کام کیا۔ اس عرصہ میں وہ گوالیار چلے گئے تو میں نے پھر حکیم عبدالکریم خانصاحب مستند طبیہ کالج دہلی کی خدمت میں رہ کر اپنی پریکٹس جاری رکھی اور ان کے مطب کا کام خود سنبھالا۔ مجھ کو شکار کا بہت شوق رہا۔ جب ہند کی تقسیم ہوئی تو اپنے قدیم وطن کو چھوڑ کر اوکاڑہ آگیا اور اب یہاں ملازمت کر رہا ہوں۔ شعر وشاعری کا شوق عرصہ سے ہے لیکن اوکاڑہ میں آکر چند باذوق حضرات کی صحبت نے میرے اس جذبہ کو ابھارا اور اب میں بلا تکان شعر کہہ لیتا ہوں۔

ترے تیرِ نگاہِ ناز نے بسمل بنایا ہے وہ ابرو نے کیا ہے کام جو کرتی ہیں شمشیریں

....

یہی التجا ہے دلاورؔ خدا سے زمانے میں آئے ہمارا زمانہ

....

چھوڑ کر کیا وطن کو یاد کریں اپنا شیوہ غمِ ہجرت ہی سہی

....

پتہ یہ چل رہا ہے ہچکیوں سے　　　کہیں میں یاد فرمایا گیا ہوں

....

مرنے کے بعد آیا دلاور انھیں خیال　　　چکر لگا رہے ہیں ہمارے مزار کے

....

وہ آئیں اور آ کر ہاتھ سینے پر مرے رکھیں
جو دل میں درد ہے میرے وہ دل سے دور ہو جائے

ذاکر محمد اسماعیل خاں زئی

میں محمد اسماعیل خاں زئی کے نام سے یاد کیا جاتا ہوں۔ آباء واجداد کی جائے رہائش حیدر آباد دکن ہے۔ میں جھانسی میں پیدا ہوا جہاں والد بزرگوار جی آئی پی ورکشاپ میں بحیثیت چارج مین کام انجام دیتے تھے۔ میری تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۲۶ء ہے۔ ابتدائی تعلیم جھانسی میں حاصل کی اور ورناکیولر کا فائنل کا امتحان پاس کرنے کے بعد والد صاحب کے تبادلہ کی بنا پر مجھے بمبئی آنا پڑا۔ والدہ محترمہ کو بمبئی کی آب وہوا راس نہ آئی اور میں ان کے ہمراہ اپنے چچا محمود خاں سب انسپکٹر پولیس کے پاس میرٹھ چلا گیا۔ یہاں میں نے سینئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کی۔ چچا کو ادبی ذوق حد درجہ تھا اور میں مشاعروں میں اکثر ان کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ شاعری سے میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ سب سے پہلی غزل کا شعر پیش ہے۔

غم کا افسانہ اگر ذاکر سناتا ہوں انھیں
ہنس کے کہتے ہیں تمہاری تو یہ عادت ہوگئی

والدہ محترمہ علاج کے باوجود جانبر نہ ہو سکیں اور مجھے حالات نے والدہ صاحبہ کے پاس بمبئی آنے کے لئے مجبور کیا جہاں شعر و شاعری کا چرچا کافی تھا۔ میں نے بحیثیت کلرک ملازمت اختیار کر لی۔ ابتدائی شاعری کا زمانہ رہبر دہلوی کی رہبری میں گزارا۔ پھر ۴۷ء کا انقلاب شروع ہو گیا اور میں ایک جذبہ کے تحت پاکستان آ پہنچا جہاں ورکشاپ اکاؤنٹس آف مغلپورہ میں کام کر رہا ہوں اور خوش قسمتی سے عبداللہ مضطر گجراتی بی۔ اے کی شاگردی کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ شعر و سخن کا مشغلہ بدستور جاری ہے اور میں اپنی فکر میں اب خاص رنگینی اور بلندی محسوس کرتا ہوں۔

ہوا دے رہا ہے زمانہ کا دامن — چراغِ محبت بجھا جا رہا ہے
شراب جوانی ہے، بدمستیاں ہیں — وہ پہلو نشیں ہیں، مزا آ رہا ہے
تصور کی رنگینیاں اللہ اللہ — کوئی آ رہا ہے، کوئی جا رہا ہے
دھواں اٹھ رہا ہے چمن کی طرف سے — نشیمن کسی کا جلے جا رہا ہے
پتہ دل کی دھڑکن سے چلتا ہے ذاکرِ — کوئی چپکے چپکے ادھر آ رہا ہے

....

گلوں کو نہ چھوتے جو معلوم ہوتا — ہاتھوں میں کانٹے چبھیں گے ہمارے
نہ ہرگز سنو بات ذاکر کسی کی — تمہیں چاہے کتنا ہی کوئی پکارے

شرافت

میرا نام شرافت علی خان ہے اور تخلص شرافت۔ ۲۰ رفروری ۱۹۳۳ء بمقام ریاست

رام پور یوپی میں پیدا ہوا۔ صفدر علی خاں صفدر مدظلہٗ کا خلف اکبر ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھا جہاں شعر و شاعری کا ہر وقت چرچا رہتا تھا۔ اب کراچی آنے کے بعد فاولر لائن ''انجمن معیار ادب'' کے زیر اہتمام ہر ہفتہ مطروحہ و غیر مطروحہ مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ والد صاحب کی مصاحبت سے میں نے بطور خاص اکتساب فیض کیا ہے۔ اُردو فارسی کا میں نے کماحقہٗ مطالعہ کیا ہے۔ پندرہ سال کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ نمونہ کلام

غمِ دو جہاں سے بڑھ کر ترا غم ہے مجھ کو پیارا ... مرا حاصلِ محبت مری زیست کا سہارا

تری یاد ایک طوفاں، ترا قرب ایک ساحل ... یہ ہی زندگی تلاطم، یہ ہی زندگی کنارا

یہ ادائے دل ستانی، یہ نگاہِ قدردانی ... یہ صدا کہاں سے آئی، مجھے کس نے یہ پکارا

....

رہے کیوں تشنۂ توحید مستانہ محمدؐ کا ... مئے وحدت سے ہے لبریز پیمانہ محمدؐ کا

دمِ آخر مری آنکھیں لگی ہوں جانبِ طیبہ ... الٰہی خاتمہ بالخیر ہو صدقہ محمدؐ کا

نہ سمجھنے کے یہ کمبخت، نہ سمجھانے کے ... کتنے بے معنی ہیں جملے مرے افسانے کے

شفیق، شفیق اللہ خاں کوٹی

میں ۱۴/اگست ۱۹۰۳ء عیسوی بمقام کوٹ ضلع فتح پور (یوپی) پیدا ہوا۔ ۱۹۱۲ء کے بعد مختلف اسکولوں اور شہروں میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ ٹکنیکل اسکول لکھنؤ میں داخل ہوگیا۔ تین سال کے بعد ڈپلومہ لے کر محکمۂ زراعت کے انجینئرنگ لائن میں ملازمت کرلی۔ اسی لائن میں ترقی کرکے اب محکمۂ سپلائی اینڈ ڈیولپمنٹ لاہور میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف انسپکشن ہوں۔ شاعری کا ذوق مجھے لکھنؤ سے پیدا ہوا۔ مجھے علامہ سیماب اکبرآبادی سے شرف تلمذ حاصل

ہے۔ نمونہ کلام

دنیا کا بھی غم ہے مجھے، عقبیٰ کا بھی غم ہے
سب کچھ ہے مگر پھر بھی تری یاد سے کم ہے

پروانہ بھٹک جائے جو اَب بھی تو ستم ہے
جو شمعِ کلیسا ہے وہی شمعِ حرم ہے

ہے ختم کہانی مگر آنکھوں میں تو دم ہے
صورت وہ اگر اب بھی دکھا جائیں کرم ہے

ساقی ترے الطاف کا ممنون ہوں لیکن
پیمانے میں جو کچھ ہے مرے ظرف سے کم ہے

سرمایۂ حیات رہے وہ تمام عمر
گزرے تھے چند لمحے جو اس کے خیال میں

لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے
میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بھی تری انگڑائی ہے

میرے پہلو سے مرے دل کو اڑا لائی ہے
تیری انگڑائی بھی ظالم تری انگڑائی ہے

تری مست آنکھیں وہ آنکھیں ہیں جن پر
تصدق ہے جامِ مئے ارغوانی

یہ جذب وکشش اے جوشِ طلب ناکام ہے اور ناکام نہیں
لب پر ہے تبسم ان کے مگر آنکھوں میں کوئی پیغام نہیں

یہ بحرِ محبت ہے اس میں جو ڈوب گیا وہ پار ہوا
برباد جو ہے برباد نہیں، ناکام جو ہے ناکام نہیں

ان آنکھوں سے پینے کو جی چاہتا ہے
ابھی اور جینے کو جی چاہتا ہے

سراپا جہنم ہے یہ زندگانی
مگر پھر بھی جینے کو جی چاہتا ہے

....

کس سے کہوں کہ میرا نشیمن اجڑ گیا
کس کو نہیں یہ رنج پریشاں کیے ہوئے

....

سرِ مژگاں جو دو ستارے ہیں | زندگی کے یہی سہارے ہیں

....

معجزہ کوئی تو وحشت میں نمایاں ہو جائے | جیب میں ہاتھ رہیں، چاک گریباں ہو جائے
میں کسی پھول کو چھولوں تو بنے سوکھ کے خار | تم جو کانٹے بھی اٹھالو تو گلستاں ہو جائے

....

یہ عشق نامراد سلامت رہا اگر | آؤں گا تیرے در پہ پشیماں ہزار بار

....

پڑ جاتی ہے جاں جس سے افسانۂ الفت میں | وہ ذکر ہمارا ہے، وہ نام تمہارا ہے

....

عشق میں کھائی تھی ٹھوکر کھا گئے | ہم سزا اپنے کئے کی پا گئے

شمیمؔ، مبارک شمیم شاہجہاں پوری

۱۳؍مارچ ۱۹۲۴ء کو بمقام شاہ جہاں پور پیدا ہوا۔ جب کچھ ہوش آیا تو خود کو متضاد ماحول میں گھرا ہوا دیکھ کر عجیب الجھن محسوس کی، دادھیال میں ۹۵ فیصد اعزہ اَن پڑھ اور عسکری جذبہ سے مغلوب تھے برخلاف اس کے ننھیال میں ۹۰ فیصد تعلیم یافتہ مہذب اور مرنجاں مرنج دکھائی دیئے۔ میرے والدِ محترم (عبدالعلی خانصاحب) اپنے گھر والوں کی مخالفتوں، خفگیوں اور دھمکیوں کے باوجود جائز بغاوت پر قائم رہے، راہ میں آئی ہوئی مشکلات ان کے آہنی ارادوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ خاندانی رواج کے خلاف تعلیم حاصل کی۔ قانونی پیشہ کو ذریعہ معاش بنایا اور

پچھلے ۱۵ سال سے وہ اب تک کامیاب قانون داں کی حیثیت سے پریکٹس کررہے ہیں۔

قصبہ کانٹ کے قاضی نیاز رسول سے ابتدائی تعلیم کے بعد مجھے اسکول میں داخل کردیا گیا۔اس کے بعد اٹاوہ بھیج دیا گیا۔ یہاں میری عصبیت اور تنگ نظری دور ہوگئی۔اٹاوہ میں ایک طالب علم کے لئے ہوسٹل کے باہر کی ہوائیں کس قدر مسموم اور فضائیں کتنی تاریک اور بھیانک ہوتی ہیں اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس ماحول سے واقف ہیں مگر میں نے ان ہواؤں میں مہک اور مہک میں انجان سی کشش محسوس کی۔ بھیانک تاریکیوں سے روشنی کی ایک باریک کرن پھوٹی اور بلاواسطہ میرے معصوم دل میں اتر گئی۔ میں گھبرا گیا اور سب سے پہلی بار میں نے کہا۔

مدد مدد اے جنونِ فطرت بھڑک اُٹھا ہے جگر میں شعلہ

یہ اشک رُسوا کریں نہ مجھ کو جو میری آنکھوں میں آرہے ہیں

وہاں سے پھر شاہجہانپور گیا کچھ عرصہ کے بعد علی گڑھ چلا گیا۔علی گڑھ کی زندگی راس نہ آئی۔ ملیریائی فضا سے دم گھٹنے لگا دوسرے ہی سال لکھنؤ جاکر داخلہ لے لیا، وہیں سے بی۔اے کیا۔ایک سال ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی میں گزارنے کے بعد بڑے بھائی کی اچانک موت کی بنا پر لکھنؤ سے مستقل طور پر گھر واپس آ گیا۔

لکھنؤ کے دورانِ قیام ذوقِ شعری بڑھتا رہا اور ۱۵ر مئی ۱۹۵۰ء کو پاکستان کے لئے روانہ ہوگیا۔ یہ موڑ ایک انوکھا موڑ ہے جہاں قدم قدم پر مایوسیوں اور نامرادیوں سے مقابلہ کررہا ہوں۔ ذیل اشعار میری موجودہ حالت کے ترجمان ہیں۔

تمناؤں کو میری یاسِ پیہم نے مٹا ڈالا　　　شمیم اس حال میں جینے کی پھر کیونکر تمنا ہو

ہائے مجبوریاں محبت کی　　　اشک امنڈے مگر بہا نہ سکے

زندگی بھر میں حوادث سے رہا ہوں دوچار　　　میں نے دیکھے ہیں بہت ایسے تلاطم پہلے

یہ تیرہ فضائیں، تند ہوا، طوفاں ہے کہ بڑھتا آتا ہے
آغاز سے وحشت ہوتی ہے، انجام سے جی گھبراتا ہے
کیا صبحِ بہاراں سے کھیلے، کیا محفلِ انجم میں بہلے
وہ دل کہ اذیت سہہ سہہ کر مانوسِ الم ہو جاتا ہے

عشق تکلفات کی حد سے گزر گیا شمیمؔ　　　اب وہ کسی کے واسطے شورشِ چشمِ تر نہیں

غمِ حیات مجھے دل نشیں بناتا ہے　　　یہ شغلِ بادہ و مینا تو اِک بہانہ ہے

صفدرؔ، صفدر علی خاں

میرے والد کا اسم گرامی یعقوب علی خاں اور شہیدؔ تخلص تھا، بزرگ افغانستان سے بعہد نواب فیض اللہ خاں والیٔ ریاست رامپور میں آکر آباد ہوئے، والد صاحب علم نجوم اور جفر میں مہارت رکھتے تھے، اسی لیے نواب حامد علی خاں نے انھیں زمرۂ منجمین میں داخل کر لیا اور تحصیلِ علمِ نجوم کے لیے اپنا استاد منتخب کر کے جوہر شناسی کا ثبوت دیا، مزید برآں نواب صاحب نے اعزازاً ایک ہاتھی برائے سواری عنایت کیا۔ میری تعلیم و تدریس میں نواب صاحب نے بذاتِ خود دلچسپی لی لہٰذا عربی فارسی میں کماحقہٗ دسترس حاصل ہو جانے کے بعد علومِ نجوم و جفر کے حصول کے لیے نواب صاحب نے حکم فرمایا چنانچہ ان کے ظل نعمت مآب میں میں فارغ التحصیل ہوا۔

میں نے پہلا شعر چودہ سال کی عمر میں کہا۔ یہ شجرۂ تلمذ حضرت مصحفیؔ تک پہنچتا ہے۔ مجھے ابتدا میں ناسخؔ کا رنگ پسند تھا، بعدہٗ داغؔ کا رنگ مرغوب ہوا۔ پھر مومنؔ اور اسیرؔ کا رنگ اپنایا

اور اب تک یہی رنگ پسند ہے۔ تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، یہ شغل شاعری ۱۹۳۳ء تک بڑی شد و مد سے جاری رہا۔ ۹؍ جون ۱۹۳۳ء کو والد صاحب کے سانحۂ ارتحال کے بعد کام اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ پھر شعر و شاعری خواب و خیال بن گئی، ریاست رام پور کے بھارت میں الحاق کے بعد میں نے رام پور کو مصلحتاً خیر باد کہہ دیا، اس لیے کہ میں فطرتاً خوددار واقع ہوا ہوں، نہ خود غلامی پر راضی ہوا اور نہ آئندہ نسلوں کے لیے اسے بہتر سمجھتا ہوں، چنانچہ شروع ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے کراچی آ گیا۔ اب خاور لائن کراچی میں مقیم ہوں، یہاں آنے کے بعد بغیر اشاعت بھی یہ عالم ہے کہ صبح ۱۰ بجے سے شام تک اہلِ حاجت کا میلہ لگا رہتا ہے۔ وہی پہلی سی عدیم الفرصتی یہاں بھی جاری ہے کہ دن کا بیشتر حصہ اسی انہماک میں گزر جاتا ہے، بھلا جب فرصت کے لمحات اتنے عنقا ہوں تو شاعری کیسے کی جائے۔ اس پر بھی دوستوں کے مجبور کرنے پر کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔

صفدر یہ قدر دانیٔ احباب دیکھنا — غربت میں ہے وہ عیش کہ جیسے وطن میں ہوں

....

حدِ سفر کو حاصلِ منزل بنا دیا — ڈوبا میں جس جگہ اسے ساحل بنا دیا
بیچارگی کا شکوہ نہ کر اس کا شکر کر — اس دل کو جس نے درد کے قابل بنا دیا
ناقص کی قید مشربِ ساقی میں کفر تھی — جس پر نظر پڑی اُسے کامل بنا دیا
محتاجِ یک نگاہ تھا دل کا معاملہ — مشکل تھا یہ بھی کچھ جسے مشکل بنا دیا
صفدرؔ خدا کرے نہ اسے آشنائے غم — جس نے نشاطِ دل کو غمِ دل بنا دیا

....

مانعِ کثرتِ گریۂ دل ناداں نہ ہوا — ناخدا کو بھی کچھ اندازۂ طوفاں نہ ہوا
بن جاتی ہیں چلمن رخِ روشن کی شعاعیں — پردہ وہ اٹھاتے ہیں تو پردہ نہیں اٹھتا

صفدر نہ مجری نہ سلامی کسی کے ہم — تکیہ ہے صرف رحمت پروردگار پر
لائے گا صورِ حشر ہمیں کیا فریب میں — کیا جانتے نہیں تری آوازِ پا کو ہم

نہ حور، نہ پری ہو، نہ مہ جمال ہو تم — مثال دے کوئی کس سے کہ بے مثال ہو تم

جب انھیں شکل پر غرور ہوا — آئینہ آگیا مقابل میں
زندگی نے کہا خدا حافظ — پاؤں رکھا جو کوئے قاتل میں

کام سے کام ہے تکلف کیا — میں نے جب پی تو ساغرِ گل میں

لعل، محمد لعل خاں کشمیری

میں ریاست جموں وکشمیر ضلع میر پور کے ایک نامی گاؤں رٹہ میں بتاریخ ۱۷ر جون ۱۹۲۲ء میں ظہور پذیر ہوا۔ پرائمری تعلیم گاؤں کے اسکول ہی میں پوری کی اور پھر مڈل اسکول شری پرتاپ سنگھ پورہ میں داخل ہوگیا۔ تعلیم کا شوق تھا۔ روزانہ چار میل مارچ کرتے ہوئے اسکول جاتا تھا، مگر یکایک تعلیم سے دل اُچاٹ ہوگیا۔ بٹیر، تیتر اور مرغ بازی کا شوق ہوا جو بڑھتے بڑھتے تعلیم پر غالب آگیا۔ قبلہ وکعبہ بمبئی میں تجارت کرتے تھے۔ میری گمراہی کی خبر پاکر گھر آئے اور آتے ہی اپنے لختِ جگر پر ہاتھ صاف کیا۔ ہم اس ہاتھ کی صفائی کی تاب نہ لا سکے اور اپنے لنگوٹیا کو ساتھ لے کر کلکتہ جا پہنچے۔ کلکتہ پہنچ کر فلمی دُنیا میں داخل ہونے کا شوق چرایا۔ نیو تھیٹر اور رادھا فلم کمپنی میں کام کرنے لگے۔ ایک قریبی رشتہ دار کو خبر ہوئی اور مجھے پھر بمبئی بھیج دیا گیا۔ والد صاحب وہاں موجود تھے ہی، لہٰذا بندہ آزاد کو پھر شعبہ دَرس گاہ میں مقید کردیا گیا مگر ہم بھی ایک کائیاں تھے کتابیں مغل ہوٹل میں اور ہم محبوب پروڈکشنز میں۔ ۱۹۳۹ء میں لڑائی کے نعرے بلند ہوئے اور ہم بھی نعروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے رائل انڈین نیوی میں بھرتی ہوگئے۔ شعر گوئی کا شوق

فلمی دُنیا میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ نیوی میں پہنچے تو حضرت نیر سیمابی کی معیت نے اس شوق کو ہوا دی اور محمد لال خاں میں لال کشمیری کا اضافہ ہو گیا۔ آج کل رائل نیوی ایمونیشن ڈپو میں ہوں۔ قبلہ استاد کا ساتھ ہے اور سرکاری اوقات کے بعد فکر سخن کر لیتے ہیں۔ شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم اور شاعر سرتاج حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم کے کلام سے بہت استفادہ کیا ہے اور ان ہی دو بزرگوں سے زیادہ متاثر ہوں۔

لاسکوں میں تاب ان نظروں کی یہ ممکن نہیں
دیکھتا ہوں ان کی نظروں سے چھپا کر ان کو میں
صبح دم ہوتے ہی سارے یک بیک رخصت ہوئے
چاند تاروں کو بھی اپنا ہم سفر سمجھا تھا میں
وسعتِ ارض وسما کے پار بھی تھا ضوفشاں
جس کے جلووں کو بھی تا حد نظر سمجھا تھا میں
کڑکتی بجلیوں سے ہی منور آشیاں کر لے
جو ممکن ہو تو فطرت کو بھی اپنا ہم زباں کر لے
جہاں میں تنگ دل رہ کر بھی جینا کوئی جینا ہے
حریمِ دل کو پھیلا کر حریف دو جہاں کر لے
اگر یہ چاہتا ہے بے نقاب آئیں وہ محشر میں
تو پہلے طور پر جا کر نظر کا امتحاں کر لے

پھر معرضِ وجود میں ہے ایک سومنات　　پھر احتیاجِ غزنوی بت شکن ہے آج

قسمت کو بدل دے جو بیک جنبشِ نظر
اس مردِ قلندر کی نظر ڈھونڈ رہا ہوں

ماہر افغانی

نہیں شعور جب انساں کو ذات کا اپنی
تو پھر خدا تو خدا ہے، خدا کی بات نہ کر

خیال بیدل

مجاز حافظ محمد عبدالنعیم خاں لودی اکبر آبادی

اس ذکر کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ میرے بزرگ کون تھے اور کہاں سے آئے۔ ہاں میرے والد مولوی عبدالحکیم خانصاحب کو بھی ذوق سخن گوئی بدرجہ اتم تھا، وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان دونوں حضرات کا کلام اشاعت کا مرہون منت نہ ہوسکا۔ میرے تایا مولوی محمد عبدالعزیز خان عزیز فتح آبادی حضرت داغ دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے۔ یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ عمائدین اکبر آباد سمجھے جاتے تھے۔

میری عمر تقریباً تیس سال ہے۔ بحمد للہ صاحب اولاد ہوں، آگرہ اور شکوہ آباد میں میٹرک تک تعلیم پائی۔ اس کے علاوہ اپنے محترم استاد پروفیسر بشارت علی خاں ارمان آفریدی اکبر آبادی کے اصرار پر منشی کا امتحان پاس کیا۔ میں نے ۱۹۳۳ء میں باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۹۳۴ء میں علامہ سیماب کا شاگرد ہوا، میرا ہر فرصت کا وقت قصر الادب میں گزرتا تھا، پہلے حافظ تخلص کرتا تھا مگر بعد میں استاد مرحوم نے یہ تخلص بدل دیا اور مجاز تجویز فرمایا۔

آج کل میرا رنگِ تغزل بدل چکا ہے، وقت کی ضرورت اور ماحول کے تقاضے نظم کرنا اب اچھا معلوم ہوتا ہے، تقریباً چار سو غزلیں اور نظموں کا مجموعہ سرمایۂ حیات ہے۔

خندۂ بے دلی نہ دیکھ گریۂ وبے کسی نہ دیکھ
تو بھی نہ رو اُٹھے کہیں روتی ہوئی ہنسی نہ دیکھ

ایک رگِ بہار میں سیکڑوں خار ہیں نہاں
پھول کے دل کے زخم دیکھ، پھول کی پنکھڑی نہ دیکھ

میرے طریق عشق میں ہوش خودی کا نام ہے
دیدۂ ہوش سے مرا عالم بے خودی نہ دیکھے

تیرے تصورات سے اس کو ذرا سجا تو لوں
دل کو میں دل بنا تو لوں، دل کی طرف ابھی نہ دیکھ

دل کا وضو ہے اشکِ خوں، دل کی نماز ہے نیاز
بندگیٔ مجاز دیکھ، مسلک بندگی نہ دیکھ

قفس نہیں تو مرے ساتھ دفن ہو زنجیر
کوئی تو عہد اسیری کی یادگار رہے

اُلجھ کے ٹوٹ نہ جائے ربابِ حسن وشباب
تو اپنے نغموں کی لے سے مری فغاں نہ ملا

مذاقِ سوزِ طلب سلامت لگی ہوئی بھی کہیں بجھی ہے
جو طور پر سرد ہو چکی ہے وہ آگ دل میں دبی ملے گی

مجیدؔ، عبدالمجید

والد کا نام عبدالعزیز خاں، وطن ڈیرہ اسماعیل خان عمر ۲۳ سال ۱۵ ستمبر ۱۹۲۸ء، ۱۹۴۲ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر ایر فورس میں ملازمت کر لی، پہلی غزل ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی، یوں شاعری کی ابتدا پانچویں جماعت سے ہو گئی تھی۔

میں جو روتا ہوں لوگ ہنستے ہیں
جانے کیا ہو گیا زمانہ کو

انھیں ہے صرف بھروسہ تری نوازش کا
جو دو جہاں کو محبت میں ہار بیٹھے ہیں

سسکیاں ہوتی رہیں گی یونہی ہر روز بلند
عصمتیں سیکڑوں لٹ جاتی ہیں ایوانوں میں

منظؔر حفیظ اللہ خاں خورجی

میرے والد کا نام احسان اللہ خاں صاحب، وطن عزیز تحصیل خورجہ، ضلع بلند شہر، یو پی کا ایک چھوٹا سا قصبہ مونڈا کھیڑہ، جائے پیدائش لاہور اور تاریخ پیدائش ۱۹۲۸ء ہے۔

کب تک ترے فراق میں تڑپا کروں گا میں | دوں کس طرح تسلیاں ذوقِ نظر کو میں
مجھ کو گمان ہوتا ہے یوں روزِ حشر کا | چپ چپ سا دیکھتا ہوں کبھی گھر کے گھر کو میں

منظؔر چلی ہے زندگی بھی دل کے ساتھ ساتھ
کس طرح دیکھوں لٹتے ہوئے اپنے گھر کو میں

ناسؔق، عبدالستار خان

میرا نام عبدالستار خاں ہے۔ چونکہ تھوڑا بہت شاعری سے ذوق ہے تخلص ناسؔق ہے، میرے والد مرحوم و مغفور کا نام عبدالقادر خاں، آبائی وطن قصبہ منڈا ضلع بجنور تھا مگر جد بزرگوار نے جو انتہائی خوددار تھے اپنے بڑے بھائی عالم گیر خاں صاحب مرحوم سے کسی خانگی امور کے باعث اپنا تمام حق وارثت اپنے بھائی کے سپرد کر کے ترک وطن کیا اور قصبہ شیر کوٹ ضلع بجنور میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۱۸ء بمقام ہلدوانی ضلع نینی تال (یو پی) عالم ارواح سے عالم اجسام میں آیا۔ سن پیدائش سے لے کر ۱۹۲۷ء تک جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باعث مجھے کسی اسکول وغیرہ میں داخل نہیں کرایا گیا البتہ جملہ ابتدائی تعلیم اُردو فارسی وغیرہ والد مرحوم نے دی۔ ۱۹۲۸ء میں بریلی بی۔ سی۔ ایم ہائی اسکول میں درجہ چار میں داخل کرادیا گیا۔ ابھی مشکل سے چار

مہینہ ہوئے تھے کہ والد کا سایۂ عاطفت سر سے اُٹھ گیا، مجبوراً بریلی کو خیرآباد کہا اور دھام پور کے ایک اسکول میں داخل ہوا پھر ہلدوانی کے ہائی اسکول میں داخلہ ہوا، ۱۹۳۲ء میں نمونیہ کا حملہ ہوا ۱۹۳۳ء تک بیمار رہا، اپنے عزیز ترین عزیز کے مشورہ سے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۳۷ء میں ادیب کا امتحان دے کر کامیاب ہوا اور ۱۹۴۰ء میں میٹرک پاس کیا۔

۱۹۳۶ء میں جبکہ ادیب کی تیاری کر رہا تھا میرے ماموں فیروز جنگ خانصاحب تقریباً ڈیڑھ ماہ کی رخصت پر تشریف لائے، وہ ہر سال گیارہویں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس دفعہ انہوں نے اعلیٰ پیمانہ پر انتظام کیا، مجھ سے کہنے لگے اس مرتبہ میں تمہارے لیے بالکل نئی کتاب لایا ہوں جس میں اچھی نعتیں ہیں، وہ تمہیں پڑھنی ہوں گی، اس وقت اتفاقاً میری زبان سے یہ نکل گیا، اس مرتبہ میں خود اپنی لکھی ہوئی منقبت پڑھوں گا، یہ سن کر ماموں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور مجھے بھی اپنے الفاظ کی پاسداری کرنی پڑی چنانچہ ماموں کی دی ہوئی نعتیہ نظم کا ایک مصرعہ لے کر ''محی الدین جیلانی مرے محبوبِ سبحانی'' ترنم سے پڑھتا رہا اور تک بندی کرتا رہا، تین دن کے بعد اپنے استاد گرامی مولانا عبدالقویم ارشؔق کی خدمت میں چوبیس شعر کا نعتیہ قصیدہ غوث پاک کی شان میں جن میں سے اکثر شعر عروض سے قطعی پیدل تھے بغرض اصلاح پیش کیے، انہوں نے ازراہِ ہمدردی وعنایت اس کی اصلاح کی اور کچھ شعر خود بھی لکھ دیئے اور میری ہمت افزائی کی اور کہا کہ تمہارے اندر شاعری کا مادہ موجود ہے۔ اگر تم اس طرف توجہ دو تو خاصا لکھنے لگو گے۔ اس کے بعد میں نے مسلم لیگ کی حمایت میں ایک نظم بہ عنوان ''کانگریسی مسلمانوں کے نام ماہِ صیام کا پیام'' لکھی اور مولانا مظہر الدین مرحوم ایڈیٹر و مالک اخبار ''الاماں'' و ''وحدت'' پسند کی اور الامان میں شائع کی۔ اس کے بعد علامہ سیمابؔ سے اصلاح لینا شروع کی۔

دماغ وقلب کی تفریق ہے اک لفظِ بے معنی　　　　وجود ان کا سمجھ لینا جدا ہے وہمِ لایعنی

محبت، اف محبت نام کس شے کا محبت ہے

کہ ہر اک حرف میں جس کے بھری اتنی جلالت ہے

غلط ہے یہ محبت صرف دل میں ہوتی ہے پیدا　　　　دماغ اول اثر لیتا ہے اس کی سحر کاری کا

نہ میرا اس پہ ہے قابو، نہ دائم جذبۂ الفت

کروں کیوں ایسے وعدہ سے منغص میں تری راحت

میں کج خلقی کا الزام اپنے سر پر لے نہیں سکتا

تجھے وعدہ تو دے سکتا ہوں، دھوکا دے نہیں سکتا

نیازؔ، نیاز شیروانی

میں شیرانی النسل افغان ہوں۔ میرے بزرگ شہاب الدین غوری کے ہمرکاب نواحِ سلیمان سے بسلسلۂ فوجی ملازمت ہندوستان آئے تھے جن کو بصلۂ حسن خدمات فتحیابی جودھ پور مارواڑ کے علاقے میں مواضعات کھانو کلاں، کھانو خورد، ناگور شریف وغیرہ بطور جاگیر عطا فرمائے تھے، ابتدائی تعلیم والد صاحب سے پائی۔ زاں پور سنٹرل کالج رتلام میں فارسی کی اوّل جماعت تک جو اس وقت دسویں جماعت کہلاتی تھی، حاصل کی۔

۲۹؍اپریل ۱۹۱۵ء میں میری شادی منشی احمد اسماعیل خاں صاحب کا مدار محل نواب محمد علی خاں صاحب فرمانروائے ٹونک کی منجھلی صاحبزادی سے ہوئی جو پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب لکچرار و فیلو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی بہن اور اختر شیرانی کی پھوپھی ہیں، اس زمانے میں

صیغہ پولیس رتلام میں آنریری مجسٹریٹ مہاراجہ صاحب مرحوم املیۂ پرگنا رتلام کا سرشتہ دار رہا اور چند ماہ تک مہاراجہ آملہ متصل بڑنگر مالوہ علاقہ گوالیار کے کنور صاحبان کا معلّم اُردو رہا۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان آگیا۔ خداوند کریم نے مجھ کو چار لڑکے، لڑکیاں، پوتے، پوتیاں وغیرہ جن کی مجموعی تعداد اس وقت بائیس ہے عطا فرمائی ہیں۔

شاعری کا مرض اوائل عمری میں رتلام میں پیدا ہوا اور ابتدا میں مخدومی صاحبزادہ مشرف یار خاں مشرؔف سے تلمذ حاصل کیا۔ کچھ نظمیں مولانا ظفؔر علی خاں اس کے بعد مولانا سیماؔب اکبر آبادی کی خدمت میں لکھ لکھ کر بھیجتا رہا۔ اخبار دبدبۂ سکندری رام پور، عزیز ہند جھانسی، ریاست دہلی وغیرہ میں بھی میرے مضامین و نظمیں شائع ہوتی رہیں۔

کیوں نہ بھڑکے ہند کے گلرنگ ایوانوں میں آگ
خود یہیں سے تو لگی تھی اپنے بیگانوں میں آگ

غالباً اس راز سے واقف برہمن بھی نہیں
کس کے جلوؤں نے لگا رکھی ہے بت خانوں میں آگ

اِک نہ اِک دن یہ نتیجہ سامنے آنے کو ہے
شمع خود ہی جل مرے گی دے کے پروانوں میں آگ

رنگ لائے گا کسی دن خونِ ناحق دیکھنا
خود بخود اک دن بھڑک اٹھے گی کاشانوں میں آگ

اُن میں کسی کا دل ہے اُلجھا ہوا یقیناً
وہ بار بار اپنے سلجھا رہے ہیں گیسو

رنگیں دوپٹہ ان کا زیب گلو ہوا ہے
اور دوش پر ہوا سے لہرا رہے ہیں گیسو

بہتر یہ ہے کہ ان سے دامن بچا کے رہنا
تم کو نیاز دیکھو بہکا رہے ہیں گیسو

وفاؔ، محمد دلشاد خاں

محمد دلشاد خاں نام اور وفاؔ تخلص کرتا ہوں۔ ۱۹۳۱ء کی کسی ساعت میں آگرہ میں پیدا ہوا لیکن وطن قصبہ آنولہ ضلع بریلی ہے۔

مجھ کو محروم نہ رکھ باعثِ رسوائی ہے
ماسوا اپنے کسی غیر کا سائل نہ بنا

چشمِ کرم سے آپ نے کیا دور کر دیا
پیمانۂ حیات مرا چور کر دیا

کیوں الٹتا ہے عبث تو دورِ ماضی کے ورق
کام لے ذہنِ رسا سے حال و مستقبل بنا

''گلزارِ سخن''

بابو جگن ناتھ پرساد فیضؔ

اکبرؔ

اکبرؔ تخلص، نواب محمد اکبر علی خاں دہلوی برادر خورد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ شاگرد مومن۔

اس عشق نے یارو مجھے دنیا سے اٹھایا　　دیوانہ بنا کے
زلفوں میں پرو کر کے گرفتار کرایا　　پھر شانہ بنا کے
پھر شوق کے شیشے میں شراب عشق کی اپنے　　بھر بھر کے پلائی
پھر میرا تماشا اک عالم کو دکھایا　　مستانہ بنا کے
یہ دخترِ رز لگتی ہے ہر ایک کے منہ سے　　افسوس اے ساقی
کیا نام رہا تیرا یہ کیا تو نے پلایا　　میخانہ بنا کے
بیدل کیا دلبر نے عبث لے کے مرا دل　　کس مکر و ہنر سے

پھر اپنے لگا کان کے بالے میں جھلایا	دردانہ بنا کے
نزدیک رقیبوں کے صنم رات کو بیٹھا	مجلس کیا روشن
پھر اپنے شمَعرو کے اوپر مجھ کو جلایا	پروانہ بنا کے
غیروں کو بلاکر وہ لگا پاس بٹھانے	مدت کے گویا[1] دوست
ہم دوست یگانوں کے تئیں دور بٹھایا	بیگانہ بنا کے
اکبر کی یہی عرض ہے اب حق سے شب و روز	کہ اپنا تو طالب
دُنیا میں اگر رکھتا ہے تو رکھ لے خدایا	مردانہ بنا کے

[1] بتخفیف واؤ

بہارِ بوستاں شعراء

۱۲۹۸ھ

آزاد محمد علی خاں بدایوں

استاد مذاق

داغ کی لے کے سپر کھیت میں آ ہی نکلا
آپ کے باغ کا لالہ بھی سپاہی نکلا

اثم، فتح علی خاں بریلی

استاد مذاق

ہوں ضعیف و ناتواں کیوں کھینچتا ہے مجھ کو تو
کیا ملے گا پھل تجھے قاتل کہ مجھ میں دم نہیں

اخترؔ بلند خان آنولہ ضلع بریلی
استاد مذاقؔ

شمع مرکر بھی گل ہی کہاتی ہے
اچھے اچھے ہیں ہر بہانے سے

نیازمندؔ، نیاز محمد خاں مذاقی بدایوں
استاد مذاقؔ

خیالِ زلفِ جاناں آ گیا ہے
دلِ دیوانہ کو سودا ہوا ہے

یوسفؔ، نواب محمد یوسف علی خاں مذاقی جاوڑہ

ملقب بہ بانکے میاں

زندہ کریں ہیں مردہ دلوں کو نظر کے ساتھ
آنکھیں بتوں کی کیا ہیں قیامت بھری ہوئی

اویسؔ

اویسؔ محمد اویس خاں امروہہ
استاد امجدؔ

اویسی ہے عاشق جب اس کا پیارا
محبت ہوئی ہے نہ دیکھا نہ بھالا

جوشؔ

محمد حسین خاں ملازم پولیس بدایوں — مذنبؔ

ہے دامِ بلا گیسوئے خمدار کسی کا
ہر پیچ سے لاکھوں کو ہے آزار کسی کا

خارؔ، غلام نبی خاں بدایوں — استاد امجدؔ

خارؔ آنکھوں میں نہ کیوں خار چبھے
رخ گل رو جو نہ ہو پیش نظر

نواب مدہوشؔ

محمد عبداللہ خاں بدایوں — مذنبؔ

بیٹھتا آ کے جو آغوش میں وہ آئینہ رو
بخت کا اپنے میں نواب سکندر ہوتا

میکشؔ

احمد علی خلف محمد علی خاں آزاد بدایونی، شاگرد حضرت مذاق، اُنہوں نے اپنے والد

آزاد اور جناب ناطق وشائق سے بھی اصلاح لی ہے، دور دراز جنگلوں میں بحیثیت ملازمت سرکار رہتے ہیں، آدمی لائق ہیں۔

ہوا میں قتل ہو کر تیغ جوہر دار سے قاتل — میری قسمت کا لکھا تھا تری شمشیر پر لکھا

پڑی ہیں ناخنِ وحشت سے پیشانی پہ تحریریں — جنوں نے حاشیہ یہ نسخۂ تقدیر پر لکھا

سخت جانی مری دکھلا چکی جوہر اپنا — تو بھی کچھ کاٹ دکھا تیغِ ستمگر اپنا

بات کی بات میں کہہ دیں گے جو فرمائیں حضور — قصۂ غم ہمیں سب یاد ہے ازبر اپنا

مولفہ حافظ سید محمد ممتاز علی صاحب

آثار الشعراء تذکرہ شعرائے بھوپال

۱۳۰۴ھ

دولہ

دولہ تخلص نواب غفران مآب جہانگیر محمد خاں صاحب بہادر فرزند رشید امیر کبیر میاں امیر محمد خانصاحب بن نواب وزیرالدولہ وزیر محمد خانصاحب ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ جوان خوش رو،

اق شہ سوار، تیغ زن، شیر افگن، نیزہ باز، تیر انداز موزوں، طبیعت بانی بنائے سخاوت، خلیق
ردت ۱۲۵۲ھ کو صدر نشین ریاست ہوئے۔ نواب سکندر بیگم صاحبہ سے عقد نکاح ہوا۔ ۱۲۶۰ء
ی میں انتقال ہوا۔ عربی فارسی اور فن شاعری میں مولوی عبدالقادر ملا شہاب الدین و میر اصل علی
نی شریف حسین سے تلمذ تھا۔ دیوان اُردو مطبع نظامی میں طبع ہو چکا ہے۔

اے گوہر بحر آشنائی	دی جوہر کانِ دلربائی
خوش خرم و شاد کام باشند	در بزم طرب مدام باشند
من بعد بدردی نگارم	حالیکہ بہجرت تو دارم
زا نروز کہ از شما جدا ام	در رنج و فراق مبتلاام
بی روی تو اے صادق من	تیرہ شدہ است روی روشن
ہر لحظہ خیال تست درماں	ہر دم غم تست مونس جان
یاد رخ تو فسانۂ من	نامت بزباں ترانۂ من
مقصود بجز تو نیست محبوب	جز عافیت تو نیست مطلوب
صد شکر شہ بلندی و نسبت	مابین حصول خیریت ہست
گویم پس ازیں بطرز اخلاص	اوصاف ورود نامۂ خاص
جمعیت خاطر پریشان	آئینہ طوطیان حیران
گلدستۂ باغ زندگانی	اعنی خط آں حبیب جانی
پیچیدہ حروف آن دلارام	گسترده برائی دلبران دام
از اول نامہ تا بہ اتمام	دیدیم و بیافتیم آرام

خواندیم ز مرسلہ مضامین | دادیم بجان خویش تسکین
باشد کہ مدام ہمبریں نہج | ارقام نمودہ باشی ایں نہج
ایں نامۂ شوق از جہانگیر | برزود صبا مساز تاخیر

اُردو

عبث ہے ساتھ پھرنا غیر کے اوس شاہ خوباں کا | گدا کا ہرزہ گردی ہے ہنر اور عیب سلطاں کا
مساوی ہو نگاہِ لطف شہ اپنی رعیت پر | برابر مہر تاباں کے ہو ہر ذرہ بیاباں کا
قمر کی طرح کب منت کشِ خورشید انجم ہیں | نہیں لیتے ہیں عالی طبع ہرگز بار احساں کا
رعایت ان کی لازم ہے ہوئے ہیں عہد و پیماں جو | خلاف وعدہ فرمائی نہیں ہے کام انساں کا
اگر مشغول ہو سلطان اپنے عیش و عشرت میں | خبر گیراں بھلا پھر کون ہووے ملک والیواں کا

اگر منظور ہووے دین و دنیا کی جہانگیری
تو دستور العمل دولہ تو کر دستور شاہاں کا

راسخ

میاں عنایت محمد خاں صاحب عرف عنایت اللہ خاں صاحب فرزند محمد عادل شاہ خاں (بلرامپور) رام پوری داماد میاں فاخر محمد خاں مرحوم اخوان ریاست بھوپال سے ہیں، علم درسیہ صرف ونحو عربی وفارسی میں ان کو شیخ احمد علی رامپوری سے تلمذ رہا۔ فنِ شاعری میں سید اسماعیل حسین منیر وسید احمد علی رسا سے استفادہ کیا، بہ نسبت فارسی کے اُردو کلام میں مہارت تام رکھتے ہیں، جودتِ طبع کے باعث ان کے اشعار دوسروں کے اشعار سے بہتر ہیں۔

دل ہی دل میں کہہ رہا ہوں ہو گیا تھا کیا مجھے | خلد نے کس کی گلی کا دے دیا دھوکا مجھے
آپ اچھے میں برا اس کا خدا ہی کو ہے علم | عرصۂ محشر میں جلنے دیجئے اچھا مجھے
شرم کی دولت گمانِ عشق مجھ پر ہو گیا | بات الٹی ہے حیا نے کر دیا رسوا مجھے
شرم آئے گی گنہ سے منہ دکھاؤں گا میں کیا
حشر میں گم کرنا یارب صورتِ عنقا مجھے

ہے آج مستی کی بدلی ہوئی ہوا ساقی | کہو تو سچ مجھے کیا کیا پلا دیا ساقی
شرابِ حق میں مرے جائے یہ آبِ فرات | نہ میکدہ میں دلا یاد کربلا ساقی
نہ کرتی نغمہ سرائی جو عندلیب بہار | تو میکدے میں یہ طوطی نہ بولتا ساقی
مرید پیر مغاں کون ہے یہاں راسخ
کٹے زبان جو نکلے دہن سے یا ساقی

سراؔج

افضل میر خاں بن ہزار میر خان مرحوم ساکن قدیم بھوپال نبیرۂ نواب نظیر الدولہ امراؤ دولہ باقی محمد خاں صاحب بہادر قوم میرازیٔ خیل، ذہین و خوش خصال، جواں بخت و جواں سال۔

ایذا وہ کون سی ہے جو اے چارہ گر نہیں | سوزش نہیں ہے دل میں کہ دردِ جگر نہیں
سوز و گداز آہ و بکا نالہ درد و یاس | سب کچھ ہیں فیضِ عشق سے لیکن اثر نہیں
بزمِ نشاط، ساغرِ مے، نغمۂ طرب | سب ہیچ ہیں جو پاس وہ رشکِ قمر نہیں
خوش ہو سراؔج بزمِ ستمگر میں آج کل
تیرے سوا رقیب کا ہرگز گزر نہیں

شاداب

عبدالمجید خان بن سکندر خاں سید خیل سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ اس کے بعد مولوی عبدالرحیم و مولوی صالح محمد و مولوی محمد عبداللہ صاحب و حکیم اصغر حسین سے کتب درسیہ فارسی وصرف ونحو ومنطق وحکمت پڑھیں اور شعروسخن میں مولوی یوسف علی صاحب صدر الصدور کے شاگرد ہیں، کلام فارسی اکثر اور اُردو کم کہتے ہیں۔

بریں سمیں بتاں ہرگز مدہ ای یار ہمدم دم — کہ میسازند ایں سنگیں دلان از خویش ومحرم دم
زمارِ زلف شبرنگِ بتانِ شوخ میترسم — ندارم از پلنگ ویوز ومار وگرگ وزیغم غم
بساں ابر گر یانم برنگ رعد نالانم — بجز او نخواهد گشت سیلاب سرشکم کم
زچشم اشکبار ونالۂ آتش فشان ہردم — بفرقم آتش سوزندہ باشد زیر پایم یم

چوشاداب حزیں راکشت تیغ ابروے یوسف
برای غسل باید جست آب چشمہ زم زم

سرور اہل کمال وحاکم ملک کرم — عالم اسرار درس وکامل علم وعمل
مطلع مہر وعطاؤ داور دادارد ہر — مورد اکرام داور مرہم درد علل
ہرگداؤ مالدارو ہررا داد مدام — ملک ومال ودرو گوہر دام ودرہم کالرمل
رام اودام دودوگرگ واسد موروگس — کاراومہر وعطاؤ دارا دسطح محل
مطرح دارو مدار کار اہل ملک ومال — داورِ دارا مدارو سرور والا محل
ادعاء ورک اسم سعد او گرد داگر — صدودہ ہم کوہ وحس ولا والا دارد حمل
ہرسحر درددرگہ داور دعاہا کردہ ام — دوردارد کرد گارم صدمۂ درد علل
درگہ او داوردادارما دارد مدام — سال وماہ وہردم وہرلمحہ دلدار داہل

ادعا دارد مطر اخلئہ احمر کہ او
دراصول دوحہ مدح گل داردسمل

شوکت

میاں یار محمد خاں صاحب خلف الاصغر نواب فوجدار محمد خاں بہادر مغفور میرازی خیل۔ حقیقی ماموں حضور رئیسِ بھوپال دام اقبالہ عنایت الٰہی سے مخزنِ علوم وفنون ہیں۔ ۲۷ر ماہ صفر المظفر ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ عربی فارسی وغیرہ مولوی سید محمد عبداللہ صاحب آئین سیف میراکبرعلی خاں سے اور با قاعدہ سواری اسپ وخیل سکندر محمد خاں رسالدار سے، بعد کو مولانا محمد عباس رفعتؔ سے اصلاح لی۔ میاں صاحب بڑے ذہین ومتین ہیں، ہر فن میں تصنیف وتالیف کی بہت سی کتابیں ہیں۔

دیوانِ شوکتؔ اُردو، گلدستہ نرگس، تذکرہ فرخ بخش، انشاء نورچشم ہفت خوانِ شوکتؔ، قرآبادیں شوکتؔ، باز نامہ، خیل نامہ، فرسنامہ، مراسلاتِ شوکتؔ، چارباغ شوکتؔ، شہنشاہ نامہ، فارسی واُردو میں خوب کہتے ہیں۔

دردلم زاں سروقدرفتاری باشد لذیذ	ازلب شکرفشاں گفتاری باشد لذیذ
منت شمشیر کی باشد پسند خاطرم	زخم دل ازابروی خمداری باشد لذیذ
کولب قاصد کجا پیغام بردشنام یار	کان زلبہائی لطافت باری باشد لذیذ
بید ماغیہا سیر گلشنم کردست داغ	داغہایم از گل گلزاری باشد لذیذ
ناصحا تاکہ نمکریزی برزخم سینہ ام	سخت گوئی از دہان یاری باشد لذیذ
آفتاب کوئی تواز سایہ ہا خوشتر بود	گرم جوشی ہائی توبسیاری باشد لذیذ

ذوقہا بردم دم نظارہ از سیب ذقن — کی بدیسان میوۂ بازاری باشد لذیذ
ساغرِ غم در فراق تو پیاپی می کشم — خون دل از بادۂ گلناری باشد لذیذ
زخمیم کردی واز شور تکلم بیقرار — ایں نمک از مرہم زنگاری باشد لذیذ
خستہ ام لیکن بہ پشت رستہ ام از خستگی — تسلیہ در خاطر بیماری باشد لذیذ

می زدست دیگری زہرست درکام دلم
شوکتا جام از کف دلداری باشد لذیذ

اردو

دل جو بلبل کا تڑپ کر تہِ خنجر نکلا — طائرِ روحِ رواں کھولے ہوئے پر نکلا
یوں ہر اک کوچۂ سفاک سے باہر نکلا — کوئی بسمل، کوئی زخمی، کوئی مضطر نکلا
ہو گیا آج مسیحا کا گذر بھولے سے — مری تربت پہ لگاتا ہوا ٹھوکر نکلا
کوئی تدبیر سے آزاد نہ دیکھا ہم نے — جس کو ڈھونڈا وہ گرفتارِ مقدر نکلا
بتِ بدمست جو آیا تو ہے استقبال — دختِ رز دوڑی، قدم لینے کو ساغر نکلا
دیکھیں رکھتا ہے گلا کون تیغِ دو دم — گھر سے کہتا ہوا قاتل یہی باہر نکلا

ابرِ نیساں ہے خجل تیرے قلم سے شوکت
حرف جو نکلا وہ موتی سے بھی بہتر نکلا

شوق

نصیر احمد خاں ولد شفاعت احمد خاں رامپوری شاگرد نواب مرزا خاں داغ محکمۂ تحقیقات روبکاری سرکار میں ملازم ہیں، کلامِ اُردو۔ ذوق رکھتے ہیں۔

جگرودل سے جو اُٹھے تھے شرر دونوں ساتھ
چرخ پر بن گئے وہ شمس و قمر دونوں ساتھ

شوقِ نظارہ سے مضطر نہیں گردوں کے ساتھ
چرخ پر نکلے ہی کیوں شمس و قمر دونوں ساتھ

قتل وہ کرتا رہے زندہ بھی کرتا جائے
حشر تک یونہی رہیں خنجر و سر دونوں ساتھ

ایک دن یہ ہے ہمیں دیکھنا ان کا ہے محال
ایک دن وہ تھا کہ تھے آٹھ پہر دونوں ساتھ

تیر دل میں جو لگا یا تو جگر میں پیکاں
ہائے گھائل ہوئے دل اور جگر دونوں ساتھ

کس کے اِک جلوہ کے مشتاق ہوئے ہیں دونوں!
جاتے ہیں برہمن و شیخ کدھر دونوں ساتھ

شوقؔ اس کوچہ میں کہتا تھا جگر تھامے ہوئے
دل و دیں لے گئی اِک بُت کی نظر دونوں ساتھ

شہیرؔ

حافظ خان محمد خان ولد مولوی غلام محمد خان رامپوری

ان کے والد ماجد ممالک متوسط میں تحصیل دار تھے۔ یہ بھی وہیں رہے، لکھنے پڑھنے میں مہارت حاصل کی، غالبؔ کے شاگرد ہیں۔ خطاب افتخار الشعراء سے مفتخر ہیں۔ نمونہ کلام

کس از بزمت نرفت امشب بساما نیکہ من رفتم
فغان برلب قلق دردل شکایت بردہن رفتم

زاغیار آنقدر بگر یختم کزیار بگذشتم
زغربت آنقدر دورا وفتادم کز وطن رفتم

میاں اولیائے عشق غوث الاعظمی دارم
قدم ہر گردن مجنون و دوش کوہکن بود

ازین پس میوۂ شیر بہشتی آن ثمن باشد
چو طفلاں درکنار کور و دامان کفن رفتم

شہیرؔ آں ناتواں ہمرتبۂ افسانۂ خویشم
ز دل گرتا بلب بردند بر دوش سخن رفتم

شعر ؎

سوخت دل عمری درآتشاز برائ کار نفس

خوب شد کامروز آن سوز دروں سوز اکثر

اردو

پوچھو نہ اہلِ عشق کو کیا ہیں، کہاں کے ہیں

اچھے ہیں، جس طرح کے ہیں، جو ہیں، جہاں کے ہیں

کوئی ہوان کی وحشتِ دل کا علاج ہو — اک ہم اگر نہیں نہ سہی، مدعی سہی

میں نامدارِ ہجر و عدو کامگارِ وصل — وہ کام کرگیا ہے تو میں نام کرگیا

بزمِ جاناں میں جو جاتا ہوں تو فرماتے ہیں — ایک یہ بھی مرے ایام کی شامت آئی

غیر تھا بدمست مے، ہم کامیاب

یار بھی قسمت سے اچھے پڑ رہے

عاقلؔ

میاں عاقل محمد خاں صاحب فرزند میاں شیر محمد خاں مرحوم، مرازی خیل برادر عم سرکار فیض آثار ریاست، علم فارسی وغیرہ محمد اکبر علی مدرس سے پڑھا۔ شعر گوئی میں عزیز اللہ خاں عزیزؔ بھوپالی کے شاگرد، لیاقت و بردباری میں وحید۔ نمونہ کلام:

جلوہ گر جس وقت ان کا روئے انور ہوگیا — ماہ کس کا مہرِ تاباں بھی مکدر ہوگیا

دیکھ کر گلشن میں میرے سروقد کو باغباں — قمریاں قرباں ہوئیں، صدقے صنوبر ہوگیا

آمد گلرو ہوئی شاید کہ گلچیں باغ میں
ہر روش پر جب تو یہ پھولوں کا زیور ہو گیا

او شہِ خوباں ترے آئینہ رو کے سامنے
آئینہ حیراں ہوا، ششدر سکندر ہو گیا

کیا جلا کر سوزِ غم نے زار ہم کو کر دیا
خال چشمِ مور اپنا جسم لاغر ہو گیا

او سپہرِ حسن ترے روئے رشکِ مہر پر
ماہِ نو ابرو بنا ہے، خال اختر ہو گیا

خود وہ آ جاتے ہیں عاقل از رہِ لطف و دعا
بر سرِ یاری مگر اپنا مقدر ہو گیا

عزیز

محمد عزیز اللہ خاں صاحب ولد فیض اللہ خاں صاحب مرحوم افغانان بنگش مصنف کتاب نعت۔ تلمذ مولوی عبداللہ خان بھوپالی سے ہے۔

تو جو بے پردہ دکھا دے حسن کا جلوہ مجھے
آفتابِ حشر پر ذرے کا ہو دھوکا مجھے

عشقِ چشمِ یار میں چشمک کی سوجھی ہے مجھے
گھورتی ہے باغ میں کیوں نرگسِ شہلا مجھے

جاؤں گر یادِ تبسم میں ترے اے بحرِ حسن
کھینچ لے زنجیر موجِ آب سے دریا مجھے

رنگ بگڑا دل کا، اُلجھن میں پڑی جانِ حزیں
ہو گیا اندھیر زلفِ یار کا سودا مجھے

ایک ہیں سب عاشق و معشوق راہِ عشق میں
قیس کی صورت میں آتی ہے نظر لیلیٰ مجھے

اُس نے لٹکائی تھی جعد عنبریں جب تا کمر
دام میں آئی نظر اک پیکرِ عنقا مجھے

رہروانِ عشق کو رہبر کی کچھ حاجت نہیں
جادۂ اُلفت میں گویا خضر ہے رستا مجھے

پاؤں وحشت نے نکالے، چل گئے دستِ جنوں
اب ٹھکانہ کچھ نہیں جز دامنِ صحرا مجھے

ڈوب بھی جاؤں تو رسوائی سے بچنے کا نہیں
پھینک دے ساحل پہ جوشِ موج سے دریا مجھے

دم بخود ہوں نقش بر دیوار کی صورت عزیزؔ
دیکھ کر تصویر اس کی ہو گیا سکتہ مجھے

جوہرؔ

معشوق علی خانصاحب ابن اصغر علی خانصاحب متوطن شاہجہانپور، حال مقیم بھوپال، زمرۂ وکلاء میں معزز پیشہ مختاری میں نہایت خوش حال، سخن آرائی و سخن سنجی میں طاق، جودت طبیعت کے سبب شہرۂ آفاق ہیں پر مجلس ہنگامہ مناظرہ رونق بزم مشاعرہ کوئی بزم سخنوراں ایسی نہیں جس میں ان کی یاد نہ ہو، کوئی محفل سخن سنجاں نہیں جو ان کی ذاتِ ستودہ صفات سے آباد نہ ہو، مزاج ان کا اردو کی شاعری کی طرف بہت مائل ہے، مرزا غالبؔ سے تلمذ حاصل ہے، ان کی ان ہی غزلوں پر راسخؔ و عزیزؔ وغیرہ نے غزلیں لکھی ہیں۔

پھر بلا میں اس دلِ بیتاب نے ڈالا مجھے
پھر کسی کی زلف شبگوں کا ہوا سودا مجھے

استخواں کیا خاک تک باقی نہیں ہے دہر میں
آسیائے چرخ نے اس طرح سے پیسا مجھے

حلقۂ زنجیر سے باہر نہ رکھوں گا قدم
خانۂ زنداں ہوا ہے عالمِ دُنیا مجھے

دیکھنے والا ہوں میں بھی تو کسی خوش چشم کا
یوں نہ تو آنکھیں دکھا اونرگسِ شہلا مجھے

عشقِ چشمِ سرگیں نے کر دیا اتنا ضعیف
اب نہیں نامِ خدا فریاد کا یارا مجھے

گھات میں آیا نہ پیرِ چرخ کی طفلی میں بھی
کیا جوانی میں ستائے قحبۂ دُنیا مجھے

خود بخود جوہرؔ سے ملنے کو چلا آئے وہ شوخ
اے فسوں گر ایسا کچھ بتلا دے وہ لٹکا مجھے

تو اپنے منہ سے نہ رندوں کو کہہ برا ساقی
ان ہی کی ذات سے ہوگا ترا بھلا ساقی

ہمیں دے ساغرِ مے، ہم سے لے دعا ساقی
کہ کام آئے گا تیرا لیا دیا ساقی

پڑیں گے لینے کے دینے نہ مانگ قیمتِ مے
جو کوئی مستی میں تجھ سے اُلجھ پڑا ساقی

یہ ایک جام اور اس میں بھی تھوڑا سا کچھ کم
نہ آئی دیتے ہوئے بھی تجھے حیا ساقی

بتا تو کون سا بدمست رات آیا تھا
جو شیشہ شیشہ سے محفل میں لڑ گیا ساقی

ہوا ہے پیرِ مغاں کا مرید کیا جوہرؔ
جو اُٹھتے بیٹھتے نکلی ہے منہ سے یا ساقی

عزیزؔ

عبدالعزیز خاں صاحب مرحوم ولد میاں جی عظیم خاں بھوپالی کتب فارسی درسیہ اپنے والد سے اور مشقِ سخن محمد عزیز اللہ خاں عزیزؔ سے حاصل کی۔ اظہار نویسی عدالت فوجداری ریاست پر مامور تھے۔ تیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام

دوشم بعین خواب زہاتف ندا رسید
بیدار ای عزیزؔ کہ آں دلربا رسید

صد چاک شد دلم بہ غمش در رہ وفا
برلب نمی رسد کہ بجانم چہا رسید

چیزیکہ دیدہ ام ازاں شاہ ملک حسن
عین کرامت ست کہ با این گدا رسید

کشتی مابغرق ندامت قریب بود
شکر خدا کہ احمد ماناخدا رسید

پیریست برکشاد دہان لحد عزیزؔ
توبہ بکن کہ مرگ نہان برقفا رسید

خانۂ دل میں خیالِ یار مہماں چاہئے
دفعِ خواب چشم کو مردم نگہباں چاہئے

گر ہوس ہے صید مرغِ خاطرِ عشاق کی
دام گسترده تری زلفِ پریشاں چاہئے

تابِ رُخ سے آگ لگ جائے گی زلفیں چھوڑ دو
دھوپ سے یہ آتشیں آئینہ پنہاں چاہئے

کی جو تم نے زیب تن تنزیب کی کُرتی سفید
خونِ عاشق کی میری جاں اس پہ افشاں چاہے

غیورؔ

محمد نجف علی خاں صاحب خلف شہباز مرحوم محمود خیل، ان کے والد ماجد اپنے وطن خاص کوہاٹ سے متعلقہ پشاور بطور سیاحی و زیارتِ مکۂ معظمہ و مدینہ منورہ و کربلائے معلّی و نجف اشرف وغیرہ سے شرف حاصل کر کے واردِ ہندوستان ہوئے اور حیدر آباد ہوتے ہوئے بھوپال آئے، بیگم صاحبہ قدسیہ مغفورہ کی سرکار میں بہ مشاہرہ یک صد روپیہ ملازم ہوئے۔ ان کے فرزند غیورؔ تخلص ۲۰؍ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ کو پیدا ہوئے، نیّرِ اعظم مادۂ ولادت ہے، کتب درسیہ فارسی و صرف و نحو عربی مختلف استادوں سے پڑھیں، شعر و سخن میں مؤلف تذکرہ سے اصلاح لیتے ہیں، نہایت ذہین، متین، زود گو و تیز فہم ہیں۔

بوقتِ قتل قاتل نے گلے ہم کو لگایا ہے
ہے خوبی بخت کی ظالم کو کس دم رحم آیا ہے

عبث ابرو پہ بل ہے، قتل سے انکار کس کو ہے
تہِ تیغ اس لیے پہلے ہی میں نے سر جھکایا ہے

خطا ثابت ہو گر مشک ختن زلفوں کو ہم سمجھیں
یہ جوڑا ناگنوں کا اس نے شانوں پر بٹھایا ہے

سرورِ باغِ عالم سے بھلا مسرور کیا ہوویں
کہ ہجرِ یار کا سینہ پہ اپنے رنج چھایا ہے

نہ کیوں مہرِ درخشاں زرد ہو جاوے ندامت سے
رخِ انور کو اس مہ رو نے جو غرفہ سے دکھایا ہے

فراقِ یار میں رونے سے کب آنکھوں کو فرصت ہے — ہمارے اشکوں کے سیلاب نے دریا بہایا ہے
نقاب اُلٹا ہے کس نے اپنے رُوئے پُر لطافت سے — مہِ کامل نے جو منہ اپنا یہ بدلی میں چھپایا ہے
یکا یک ہو گیا جو موجزن دریائے فکر اپنا — تو ہم نے نخلِ مضموں آج اے گلرو جمایا ہے
جلانا عاشقِ مضطر کا جو بازی سمجھتا ہے — غیور ایسے پری رو سے عبث دل کو لگایا ہے

معجزؔ

محمد نبی خاں ولد محمد سردار خاں متوطن قدیم ریاست رام پور، تلامذہ داغؔ، کچھ مدت سے بھوپال میں وارد ہو کر پیشۂ وکالت ومختاری میں بسر کرتے ہیں، کتب عربی وفارسی میں دستگاہ ہے، یہ کلام ان کا طبع زاد ہے۔

نمونۂ کلام ۔

سودا ہو جس میں ہے مجھے اس سر کی احتیاج — ہوگی کسی کو بختِ سکندر کی احتیاج
کافی ہے قتل کو مرے حسرت تری ادا — دشنہ کی احتیاج، نہ خنجر کی احتیاج
وہ سادگی کسی کی ہزاروں بناؤ ہیں — زیور کی احتیاج، نہ گوہر کی احتیاج
کعبہ میں، گاہ دیر میں اور میکدہ میں گاہ — دردر لئے پھرے ہے کسی در کی احتیاج
زاہد تجھے ہو خلد مبارک ہمیں تو یاں — لائی عدم سے کوچۂ دلبر کی احتیاج
اُمید ہے کہ ہاتھ لگے خاکِ پائے یار — اکسیر کی ہے کچھ نہ مجھے زر کی احتیاج
انگاروں ہی پہ لوٹتا ہوں تا سحر مدام — کیا ہو شبِ فراق میں بستر کی احتیاج
منظور ہے کہ ٹھوکریں کھائے نگاہ بھی — روزن میں در کے کون تھی پتھر کی احتیاج
معجزؔ دُرِ سخن کو کرو تم بھی زیبِ گوش — ہے سامعین کو اسی گوہر کی احتیاج

مقصودؔ

محمد مقصود علی خاں ولد محمد ولی خاں مرحوم شاہجہاں پوری اردو فارسی کے ناظم و ناشر عروض کے ماہر، بھوپال میں نائب ناظم ضلع مشرق ہیں، عروض پر ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔

بوادایٔ جنون بگذشت یکدم دامن مارا | چرا ممنون ہمدردی نباشم خار صحرارا
لبش چوں ذائقہ آبِ حیاتِ سرمدی دارد | زحسرت دم فرد بندد بزیر لب مسیحارا
کجا پروا بود مارا بزہر مارگیسویش | تصور می کنم تریاق آں حال سویدارا
گہی از اشک ریزی ضبط کن ای ساغر چشم | زپیانہ بہ پیمایش نمی آرند دریارا

سید بختی من مقصودؔ شدت آں چناں دار
کہ روز روشنم ہمرنگ شد زلف شب آسارا

اردو

گلِ سوسن کو وہ جلا کر کے | آئے لب پر دھڑی جما کر کے
عشق کو اپنے سر بلا کر کے | گھر بگاڑا بنا بنا کر کے
خانہ برباد دل کی قدر نہ کی | گھر اجاڑے کئی بسا کر کے
غرق ہو ورطۂ تحیر میں | کشتی عمر کو بہا کر کے
دوست ظاہر کے دشمن جاں ہیں | رازِ دل ان سے رکھ چھپا کر کے
پان دے کر کے ہاتھ کھینچ لیا | خوں رلایا مجھے ہنسا کر کے
عرضِ بوسہ پہ ہنس کے فرمایا | ہم پشیماں ہیں منہ لگا کر کے

دل میں مقصودؔ مثلِ خاکستر
آتشِ عشق رکھ دبا کر کے

حکیم مومن خاں مومنؔ

انیسویں صدی عیسوی کے شعراء میں مومنؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے، مومن خاں نے اپنے بارے میں خود کچھ نہیں لکھا، پٹھانوں کو ہمیشہ نام ونمود سے نفرت رہی ہے اور نہ ہی مومنؔ کو حالیؔ جیسا کوئی شاگرد ملا جو ان کی شاعرانہ شخصیت کو نمایاں کرتا، تعجب کی بات یہ ہے کہ آبِ حیات جو محمد حسین آزادؔ کا تذکرہ ہے، مومنؔ جیسے باکمال شاعر کے ذکر سے خالی ہے، اس کی وجہ شاید سیاسی رہی ہو یا مذہبی، مومنؔ اگرچہ غدر سے پہلے انتقال کر گئے تھے لیکن انہوں نے غالبؔ کی طرح اُبھرتی ہوئی نئی طاقت کے لئے کچھ نہیں کہا تھا، بلکہ وہ سید احمد بریلوی اور اسماعیل شہیدؒ کی تحریک کے خاص رکن تھے اور انگریز اس تحریک کو پسند نہیں کرتے تھے، شاید اسی لئے آبِ حیات کا پہلا ایڈیشن اُن کے ذکر سے خالی رہا، آزاد کے علاوہ دوسرے ہمعصروں نے بھی ان کے حالات لکھنے سے اجتناب کیا، خود مومنؔ نے جو خطوط لکھے ان کا پتہ نہیں چلتا، ان کے زمانہ میں لکھے گئے دوسرے تذکروں میں مومنؔ کا مختصر ذکر مل جاتا ہے جن سے مومنؔ کے بارے میں ایک خاکہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے لیکن مومنؔ پر کوئی تفصیلی کام نہیں ہوسکا، انھیں نظرانداز کیا گیا ہے، مومنؔ جیسے شاعر اور عظیم انسان کے بارے میں تفصیلات کو تلاش کیا جاتا تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔

شیفتہؔ نے ''گلشنِ بےخار'' میں ان کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے لیکن ادبی اور علمی حیثیت ہی سے بحث کی گئی ہے، مولوی کریم الدین نے فیلن کے ساتھ طبقات شعراء ہند اور تذکرہ نازنیناں مرتب کئے، وہ مومنؔ سے پوری طرح واقف تھے لیکن انہوں نے بھی حالاتِ زندگی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، گلستانِ سخن کے مولف قادر بخش صابرؔ نے بھی ان کے حالات کو تفصیل سے بیان نہیں کیا، طورِ کلیم نورالحسن اور نساخ کے سخن شعر میں بھی کوئی خاص ذکر نہیں ملتا۔ تذکروں میں تفصیل سے حالات بیان بھی نہیں کئے جاسکتے اور ان سب نے تذکرہ نویسی کا کام کیا ہے،

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی

سوانح نگاری کا نہیں، ان تذکروں کی تاریخی اہمیت ہے، ان کے ذریعہ سے ملنے والے حالات بالکل درست اور صحیح ہیں۔

آزاد کی آبِ حیات میں حالی نے ان کے حالات شامل کرائے، باقی دوسرے تذکرہ نگار بھی نہ صرف ان کے ہمعصر تھے، بلکہ ان کے مومن سے قریبی تعلقات بھی تھے۔

مومن کے حالاتِ زندگی کو پڑھنے کے لئے جو کچھ سرمایہ مل جاتا ہے وہ ''واقعات[1] دارالحکومت دہلی'' بشیر الدین احمد، حیاتِ مومن، عرش گیاوی، مولانا ضیاء الدین احمد نے دیوان مومن کے دیباچہ میں مومن کے حالات کو بیان کیا ہے۔ کلب علی خان فائق نے ''حیاتِ مومن میں'' ان کی زندگی اور شخصیت پر روشنی ڈالی ہے، نگار کا مومن نمبر بھی ان کے حالات بیان کرتا ہے۔ مومن کی زندگی حالات اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے یہی ماخذ ہیں جن کی روشنی میں انھیں جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

مومن ایک پٹھان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں ان کے اجداد کشمیر سے دلی میں آباد ہوگئے۔ شاہی طبیبوں کی حیثیت سے انھیں دربار میں بلند مرتبہ ملا۔ حکیم مومن خان مومن کے دادا حکیم نامدار خاں اپنے بھائی حکیم کامدار خان کے ساتھ کشمیر سے آکر دلی میں آباد ہوئے۔ شیفتہ نے ''گلشن بے خار'' میں لکھا ہے کہ ''از دودمانِ گرامی وخاندانِ نامی است''۔ مومن کی شادی میر درد کے خاندان میں ہوئی اور دوسری شادی شاہ محمد نصیر کی صاحبزادی سے ہوئی۔ یہ دونوں سید تھے لہٰذا مومن کے تذکرہ نگاروں میں بعض نے یہ سمجھ لیا کہ مومن بھی سید تھے۔ مومن کے نواسے عبدالحئی انصاری کا کہنا ہے کہ مومن پٹھان تھے اور ان کا خاندان پٹھانوں کا اہم خاندان تھا۔ [2]

---

[1] مومن اور مطالعہ مومن صفحہ ۱۱۵ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی

[2] سیرت اجمل۔ ہندوستانی دواخانہ دہلی

مومن کے والد غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں تھے اس طرح مومن نامدار خانی اور حکیم اجمل خاں کامدار خانی مشہور ہو گئے۔ حکیم اجمل خاں کا تعلق نسل مومن سے نہیں ہے، ان کے اجداد بابر کے ساتھ ہرائے سے آئے تھے۔ ۲

مومن خاندانی طبیب تھے، ان کے اجداد اطباء کی حیثیت سے بڑے عہدوں پر فائز تھے، مغلوں کے عہد میں پرگنہ نارنول میں چند مواضعات ملے تھے۔ مومن خاں کے خاندان کے قبضہ میں رہے لیکن سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا کی تو پرگنہ نارنول بھی اسی میں شامل کر دیا گیا۔ سلطنت مغلیہ کمزور ہو چکی تھی لہٰذا نواب نے مومن خاں کے خاندان کی پنشن مقرر کر دی اور اس علاقہ کو ضبط کر لیا، اس میں سے کچھ مومن خاں کو بھی ملتا تھا کچھ تو شاہی طبیب کی حیثیت سے اور کچھ علاقہ کی آمدنی کی وجہ سے مومن کے عہد تک یہ خاندان شان و شوکت سے زندگی بسر کرتا رہا۔ ۱

حکیم غلام نبی خاں مومن کے والد اپنے عہد کے طبیبوں میں بڑے مرتبہ کے مالک تھے۔ چیلوں کے کوچہ میں مطب تھا۔ ان کے مطب کے قریب ہی شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ تھا۔ دونوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی زندگی پر گہرا مذہبی اثر تھا۔ مومن کی زندگی پر باپ کی شفقت اور عادت و اخلاق کے گہرے اثرات پڑے تھے، مومن کے والد غلام نبی خاں کا انتقال ۱۲۳۱ھ میں ہوا۔ مومن نے اپنے والد کی موت پر فارسی میں قطعۂ تاریخ کہا۔

پدرم شد اسیر دام اجل　　روحش از بند آخشیجان رست
طائری بود آسماں پرواز　　رفت بر شاخسار قرب نشست

واقعات دار الحکومت دہلی۔ بشیر الدین احمد

به من الہام گشت سال وفات
که غلام نبی به حق پیوست

۱۲۴۱ھ

مومن کو اپنے والد بزرگوار کی وفات کا شدید رنج ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ والد کی وفات کے بعد تنہائی اور احساسِ ذمہ داری کا بوجھ اچانک اٹھانا پڑا، گھریلو معاملات میں والد کی موجودگی اولاد کے لئے بے فکری اور آزادی کا ماحول بنا دیتی لیکن اچانک اس ذمہ داری کو اٹھانا، معاملات کو برتنا، عزیز اقارب سے تعلقات کا جائزہ لینا، بزرگوں سے اچھا برتاؤ اور والد کے دوستوں کا احترام کرنا اور گھریلو زندگی کی ناؤ چلانا بڑے اہم کام ہوتے ہیں، مومن کو بھی ان ذمہ داریوں کو اٹھانا پڑا اور اس کے بعد ہی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ایک خط میں اپنی چچی کو لکھتے ہیں۔

"اولین جفای ازین بی رحم بر من رفتہ آنست کہ ضمیرم بہ خاک دل سوختہ وجگر برشتہ دل گرفتہ روزی کہ رنگ کالبدم ریخت بہ شور محبت رغبتم انگیخت، جفای ندیدہ جفائی دیدم دستی تا کشیدہ ستمہا کشیدم دیگر بیداد جانگزائی کہ جز بیم جانی نہ گزاشتہ سایۂ والد مشفق را کہ بہ آغوش عاطفتم پروردہ از سرم برداشتہ ہنوز آن جراحت ناسور اثر رو بہ التیام نیارزدہ بود کہ مرگِ مادر مشفق سینہ خراشیہا نمود۔[1]"

مومن کے والد بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ اپنے والد کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی ذات کے گہرے اثرات مومن پر پڑے تھے۔

---

[1] انشاء مومن صفحہ ۲۲۲

[2] آب حیات (آزاد) حیات مومن (عرش گیاوی) صفحہ ۳۷۔۳۸

مومنؔ کی ولادت ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں کوچہ چیلان میں ہوئی۔ مومنؔ کے والد اسی محلہ میں مطب کرتے تھے اور وہیں ان کا آبائی مکان بھی تھا۔ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کا مدرسہ بھی یہیں تھا۔ شاہ صاحب نے ہی مومنؔ کے کان میں اذان دی اور ان کا نام مومنؔ خان رکھا۔ گھر کے لوگوں نے حبیب اللہ خاں نام رکھنا چاہا، لیکن شاہ صاحب نے کہا کہ اسی نام سے دُنیا میں نام پائے گا۔ [۲]

مومنؔ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ کے مدرسہ میں داخل کردیئے گئے۔ شاہ صاحب کی صحبت سے فائدہ بھی اُٹھایا اور کچھ کتابیں بھی پڑھیں۔ مومنؔ بڑے ذہین تھے۔ وہ شاہ صاحب کے وعظ سنتے تو انھیں یاد کرلیتے اور من وعن انھیں دہرا دیتے تھے۔ اس سے ان کی علمی دلچسپی اور شاہ صاحب سے دلی لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے بعد انہوں نے باقاعدہ تعلیم شاہ عبدالقادرؒ سے حاصل کی۔ یہاں اُنہوں نے عربی، حدیث، معانی، فقہ، منطق وغیرہ علوم حاصل کئے اور فارسی بھی پڑھی۔ یہاں بھی وہی عالم رہا، شاہ صاحب کے وعظ جو نکات باطنی پر مبنی ہوتے ازبر ہوجاتے اور دوسرے روز مطب میں دہرادیا کرتے۔ مزا تو یہ تھا کہ مومنؔ نکات باطنی اور اسرار سینہ کو بھی اسی طرح بیان کردیتے تھے جس کی جھلک حضرت شاہ صاحب کی تفسیر ناتمام میں موجود ہے۔ [۱]

ان عالموں کی صحبت نے مومنؔ خاں کو واقعی مومنؔ بنادیا۔ ان کے سینہ میں علم اسلام کا ذخیرہ جمع ہوگیا جس کے لیے مومنؔ ساری زندگی ان بزرگوں کے احسان مند رہے اور ہمیشہ عزت سے ان کا نام لیتے رہے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات پر انہوں نے قطعہ تاریخ کہا۔

انتخاب نسخہ دیں مولوی عبدالعزیز   بے عدیل و بے نظیر بے مثال و بے مثل

---

[۱] حیات مومن عرش گیاوی

[۲] کلیاتِ مومن مطبوعہ نول کشور ۱۸۳

جانبِ ملکِ عدم تشریف فرما کیوں ہوئے　　کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا　　لوٹتا تھا خاک پر قدوسی گردوں محل
کیا کس ونا کس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن　　ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز ومبتذل
مجلس دردآفریں تعزیت میں مَیں بھی تھا　　جب پڑھی تاریخ مومنؔ نے یہ آکر بے بدل

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہوگئے
فقرودیں، فضل وہنر، لطف وکرم، علم وعمل[2]

اس قطعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مومنؔ کو شاہ صاحب سے کس درجہ عقیدت تھی اور وہ انھیں لطف وکرم اور علم وعمل کا بے بہار سرمایہ خیال کرتے تھے۔

ان علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد مومنؔ نے آبائی پیشہ طبابت کی طرف توجہ کی۔ اب وہ اسلامی علوم اور عربی وفارسی سے پوری واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ جلد ہی انہوں نے فنِ طب میں بھی کمال حاصل کرلیا۔ اس فن کے جاننے والے ان کے گھر ہی میں موجود تھے لہٰذا کہیں جانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے والد غلام نبی خاں اور چچا غلام حیدر خاں خود مشہور طبیب تھے، طب میں مومنؔ ان ہی حضرات کے شاگرد ہوئے، کچھ کتابیں پڑھیں اور نسخہ نویسی کی۔ نسخہ نویسی بنیادی چیز تھی۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ خود اعلیٰ پائے کے طبیب ہوگئے اور جلد ہی ان کی شہرت پھیل گئی۔ گلدستہ نازنیناں کے مولف کریم الدین لکھتے ہیں کہ حکیم اس پائے کے کہ بوعلی سینا اگر تمام عمر قانونِ طبابت سیکھنے میں گنوائے پر ان کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ پائے۔[1]

طب کے علاوہ علمِ نجوم سے بھی انھیں کافی دلچسپی تھی اور انہوں نے باقاعدہ اس علم کو بھی

---

[1] کریم الدین گلدستہ نازنیناں صفحہ ۱۰۲

حاصل کیا تھا۔ خاندانی پیشہ طبابت کے علاوہ دوسرے علوم کی طرف بھی توجہ دی۔ مومنؔ کی طبیعت سیمابی تھی جو ایک مقام پر ٹھہرنا پسند نہ کرتی تھی اس لئے انہوں نے دوسرے علوم بھی حاصل کئے۔ اس زمانہ کا یہی مذاق تھا کہ مختلف علوم کے میدان میں اپنے کمالات دکھا کر اپنے ہم عصروں کو مرعوب کیا جائے یا ان سے اپنی لیاقت کا لوہا منوایا جائے۔ نجوم سے بھی ان کو فطری مناسبت تھی۔ سال میں ایک بار تقویم دیکھ کر پورے سال تمام ستاروں کی گردش اور جگہ ذہن میں محفوظ رہتی تھی۔ اگر کوئی اپنی قسمت کا حال جاننا چاہتا تو بس اس سے سوالات کر کے جوابات دیتے جاتے۔ نجوم میں دخل کا معاملہ یہ تھا کہ ایک غریب ہندو آیا جو بہت پریشان تھا، مومنؔ خان کے ایک پرانے دوست شیخ عبدالکریم بھی موجود تھے، خانصاحب نے اس کو دیکھتے ہی کہا کہ تمہارا کچھ مال کھو گیا ہے، پریشان مت ہو۔ وہ رونے پیٹنے لگا، کہا چپ رہو، جتنا پوچھوں اتنا بتاؤ، پوچھا زیور کی قسم سے تھا، اس نے کہا ہاں، مومنؔ نے کہا تم نے لیا ہے یا تمہاری بیوی نے، کوئی دوسرا چرانے نہیں آیا، ہنس کر کہا۔ رکھ کر بھول گئے ہو، کہیں باہر نہیں گیا ہے، گھر ہی میں ہے۔ اس نے کہا گھر کا کونہ کونہ دیکھ لیا، اس کے بعد انہوں نے گھر کا سارا نقشہ بنایا۔ پھر کہا اس گھر میں دکھن کی طرف ایک کوٹھری ہے۔ اس میں اتر کی طرف ایک لکڑی کا مچان ہے، اسی پر مال رکھا ہوا ہے جا کر لے لو، اس نے کہا مچان بھی دیکھ چکا۔ خانصاحب نے کہا وہیں کونے میں پڑا ہے پھر جا کر دیکھو۔ جب اس نے روشنی کر کے دیکھا تو زیور کا ڈبہ وہیں پڑا تھا۔ [1]

عرش گیاوی نے حیاتِ مومنؔ میں بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے مومنؔ کی پوتی سے یہ واقعہ سنا ہے۔ مومنؔ گنڈے تعویز بھی کرتے تھے، علمِ رمل کی بھی سارے شہر میں دھوم تھی۔ نجوم کے علاوہ علم رمل میں ان کے دخل کا یہ عالم تھا، عرش گیاوی بیان کرتے ہیں

---

[1] عبدالغفور نساخ سخن شعراء صفحہ

کہ مومن کا دربار لگا ہے۔ مختلف علوم وفنون کے شائق دامنِ طلب پھیلائے بیٹھے ہیں، یہ رمل میں خانصاحب کے شاگرد ہیں۔ دیوار پر ایک چھپکلی دکھائی دی۔ خانصاحب کہتے ہیں ذرا دیکھنا یہ چھپکلی دیوار سے کب ہٹے گی، شاگرد زور لگا کر کہتے ہیں، یہ ابھی جاتی ہے۔ خانصاحب شطرنج کھیل رہے ہیں، مسکراتے ہیں اور دیوار کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں، واہ جب تک پورب سے اس کا جوڑا نہ آجائے کیسے جائے گی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد بالا خانہ پر جہاں خانصاحب جلسہ جمائے بیٹھے تھے ریشمی کپڑوں کے دو گٹھے لئے ہوئے ایک سوداگر آتا ہے۔ اس کا ایک مزدور پوربی دروازے سے ایک گٹھ لا کر اتارتا ہے۔ گانٹھ سے ایک چھپکلی پٹ سے گرتی ہے اور دوڑ کر دور والی چھپکلی سے جا ملتی ہے۔ پھر دونوں چھپکلیاں چلی جاتی ہیں۔ راقم عالم تحیّر میں خانصاحب کا منہ دیکھتے ہیں، وہ مسکرا کر کہتے ہیں میاں ہنوز دلی دور است۔ تم شاعری کی طرح اس کو بھی حاصل کرنا چاہتے ہو یہ مذاق نہیں ہے [1]

طبقات شعراء ہند میں کریم الدین لکھتے ہیں۔ مومن کو علمِ نجوم اور رمل خوب آتا ہے۔ [2]

عبدالغفور نساخ کا بیان ہے کہ علم تنجیم اور طب میں خوب دخل ہے [3]

نورالحسن طورِ کلیم میں لکھتے ہیں۔ در طب ید طولیٰ داشت و در نجوم پائے والا [4]

علم موسیقی میں بھی انھیں دخل تھا اور وہ اس کے بڑے قدرداں بھی تھے، نظیر بیں باز

---

1. عرش گیاوی حیات مومن صفحہ ۴۳
2. طبقات شعرائے ہند صفحہ ۴۴۴
3. عبدالغفور نساخ سخن شعراء صفحہ ۴۶۷
4. نورالحسن اور کلیم صفحہ ۹۷
5. ضیا احمد بدایونی دیوان مومن صفحہ ۲۵ مقدمہ
6. عبدالغفور نساخ سخن شعراء صفحہ ۴۶۷

نے جو اس زمانہ کا استاد تھا مومنؔ کے انتقال کے بعد بین اٹھا کر رکھ دی کہ اب دلی میں اس کا کوئی قدر داں نہیں۔ ۵

علم دین ہو یا طب شعر و شاعری ہو یا نجوم، علمِ موسیقی ہو یا رمل و شطرنج با قاعدہ ان علوم کو حاصل کیا اور ان میں کمال پیدا کیا لیکن فطری طور پر وہ صرف شاعر تھے اور آج تک وہ اسی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے شاہ نصیر سے اصلاح لی جو اس زمانہ کے مشہور شاعر تھے لیکن جلد ہی وہ خود اساتذہ میں شمار کئے جانے لگے۔ عبدالغفور نساخ کا بیان ہے کہ مومن نے ایک یا دو غزلوں میں شاہ نصیر سے اصلاح لی تھی، اصلاح پسند نہیں آئی۔ ۶

آبِ حیات کا بیان ہے کہ شعر و شاعری سے انھیں فطری مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اسے اور بھی چمکا دیا۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا مگر چند روز کے بعد ان سے اصلاح لینا چھوڑ دی اور پھر کسی کو استاد نہیں بنایا۔ ۱

انہوں نے اپنی شاعری غزل سے شروع کی لیکن جلد ہی دوسری اصناف سخن کی طرف بھی توجہ دی اور اس میں بھی کمال حاصل کر لیا۔

نورالحسن طورِ کلیم میں لکھتے ہیں کہ تمام اصنافِ سخن پر قدرت حاصل ہے، لطافتِ شعری کے پوری طرح ماہر، فارسی شعر گوئی میں کسی سے کمتر نہیں، یہ چیز ان ہی کو نصیب ہے کہ اہلِ ایران انھیں اپنے میں جانتے ہیں اور ہندی ان کی زبان دانی پر ناز کرتے ہیں۔ ان کا دیوان اصناف سخن سے پُر ہے۔ ۲

نساخ کا بیان ہے کہ جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے، اشعار ان کے پُر مضمون و شیریں و

---

۱ آبِ حیات صفحہ ۴۲۲

۲ نورالحسن طورِ کلیم صفحہ ۹۷

۳ عبدالغفور نساخ سخن شعراء صفحہ ۴۶۷

عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں، اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گذرا نہیں ~~
مومن نے شخصی مرثیہ لکھا جو انفرادی مرثیوں میں بہت اہمیت رکھتا ہے اپنی محبوبہ کی ناوقت موت پر یہ ان کا اظہارِ غم ہے جس میں مومن کا دل سوزِ محبت سے بلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی معشوقہ کے قیامت خیز حسن، پاکیزگی اور پردہ نشیں دوشیزہ کے حجاب اور پردہ نشینی کا ذکر اثر انگیز شعری پیکر میں کیا ہے جس میں رعایتِ لفظی، صنایع و بدایع، تشبیہات واستعارات کا التزام کیا ہے ؎

سر پیٹتی ہیں حلقۂ ماتم میں قمریاں نخلِ عزا ہے آہ یہ کس سروِ ناز کا

اپنے غمِ بے پایاں کا بیان اس طرح کیا ہے ؎

یا جوشِ غم میں موت سے بدتر ہے زندگی آپ آ کے دیکھ جایئے باور اگر نہیں

محبوبہ کے شخصی اوصاف کے بیان میں مومن نے اپنے فن کا کمال دکھا دیا ہے ؎

پھرتی نہ تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب نعش اس کی جاتی ہے سرِ بازار ہائے ہائے

اردو زبان میں سب سے پہلے انقلاب کا لفظ آج کے معنوں میں مومن نے ہی اپنایا ؎

اے حشر جلد کر تہ و بالا زمین کو گر کچھ نہیں اُمید تو ہے انقلاب کی

شہادت کے جذبہ سے ان کا دل لبریز تھا۔ ایک مثنوی میں کہتے ہیں ؎

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
حبیبِ حبیبِ خداوند ہے خداوند اس سے رضامند ہے

....

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار پہ ترے کرم کا ہوں اُمیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے عروجِ شہید اور صدیق دے

ایک قصیدہ میں کہتے ہیں جو شاید ٹونک کے نواب وزیر محمد خاں کی مدح میں لکھا گیا ہے۔

یاد ایام عشرتِ فانی — نہ وہ ہم ہیں، نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
ایسی وحشت سرا میں آئے کون — نے دری کر رہی ہے دربانی
نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں — کہ میں شہری ہوں یا بیابانی

ترا اقبال روز افزوں ہو
جیسے مومن پہ لطفِ رحمانی

مومن کے نو قصائد میں سات کا تعلق دینی موضوعات سے ہے، دو کا تعلق دُنیاوی شخصیتوں سے ہے، جس میں مہاراجہ پٹیالہ کے بھائی اجیت سنگھ بھی ہیں۔ ان کی دو سو اٹھارہ غزلیں ہیں، اس کے علاوہ متفرق اشعار۔

ہمارے خون کا دھبہ نہ جائے حشر تلک — وہ لاکھ بدلے قبا پر رہے گا دامن سرخ
نہ کیوں کر بس مو اجاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر — وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

کیونکر نہ آدھی رات جاگے وہ جس کا دھیان ہو
آہوئے نیم خواب میں، نرگسِ نیم باز میں

پھر دل ہے داغ مطلعِ خورشید دیکھ کر — از بس کہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے
آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو — ہے بولہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
جو بے حجاب نہ ہوگی تو جان جائے گی — کہ راہ دیکھی ہے اس نے حیا کے آنے کی
دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہمنشیں! نزاکتِ آواز دیکھنا
شبِ فرقت میں خاک جھپکے آنکھ — یاد ہے چشمِ نیم خواب ہمیں
ایسی لذت خلشِ دل میں کہاں ہوتی ہے — رہ گیا سینے میں اس کا کوئی پیکاں ہوگا

ہے زمیں سب فتنہ خیز اس کے خرامِ ناز سے
یہ قیامت کیسی آئی آسماں باقی رہا

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح
طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لوآپ اپنے دام میں صیاد آگیا

دیکھ لو شوقِ ناتمام مرا
غیر لے جائے ہے پیام مرا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

ہم رنگ لاغری سے ہوں گل کی شمیم کا
طوفانِ باد ہے مجھے جھونکا نسیم کا

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

عدم میں رہتے تو شاد رہتے۔ اسے بھی فکرِ ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا، جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

مومنؔ خدا کے واسطے ایسا مکاں نہ چھوڑ
دوزخ میں ڈال خلد کو کوئے بتاں نہ چھوڑ

امتحاں کے لئے جفا کب تک
التفاتِ ستم نما کب تک

سرگیں آنکھوں سے نامہ کو لگاتے کیوں ہو
خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہیے ستانے کو

نمودؔ

میاں عالمگیر محمد خانصاحب فرزند سعید دستگیر محمد خاں صاحب مغفور حضور پُر نور شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ ریاست بھوپال کے بھتیجے حضور عالیہ ممدوحہ اپنی اولاد کی طرح محبت کرتی ہیں، بارہ ہزار روپیہ کی جاگیر ہے، عیش سے بسر کرتے ہیں، فارسی وعربی میں مہارت تام ہے، انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں، شعروسخن سننے اور کہنے دونوں کا شوق وذوق رکھتے ہیں۔ اردو میں خوب

کہتے ہیں۔

ناز سے گورِ غریباں پہ وہ دلبر آیا — حشر اموات ہوا، فتنۂ محشر آیا

واہ لب تک نہ یہ جام مئے احمر آیا — ساقیا ہاتھ پکڑنا مجھے چکّر آیا

ہے عدم میں بھی مقرر کوئی راحت کا مقام — جو گیا کنجِ لحد میں وہ نہ باہر آیا

حشر میں کہہ دوں یہی ہے جو یہ شبیر کا غم — تشنہ لب ہو کے میں اے ساقی کوثر آیا

تو ہے آئینہ روائے شہ ملک طوبیٰ — آئینہ لے کے پئے نذر سکندر آیا

جا کے دُنیا سے یہ کہنا پڑا مرقد میں نمود — کیا گیا لے کے وہاں کیا یہاں لے کر آیا

مر کے افشا عشق طفلِ برہمن ہو جائے گا — رشتۂ زنار ہر تارِ کفن ہو جائے گا

دیکھ سیدھا مجھ سے گر وہ سحرِ فن ہو جائے گا — چرخ کج رفتار تیرا بانکپن ہو جائے گا

واقف اپنے حال سے وہ گلبدن ہو جائے گا — نازکی سے مثلِ شاخِ یاسمن ہو جائے گا

صورت پروانہ گر عشاق کا ہوگا ہجوم — عارضِ جاناں چراغِ انجمن ہو جائے گا

کرتی ہے کاہیدہ ایسا الفت مژگان یار — رونگٹا بھی ضعف سے اب بارِ تن ہو جائے گا

سوئے گلشن ہوگا اس برقِ تجلی کا گزر — وادیِ ایمن کبھی صحنِ چمن ہو جائے گا

ہوگا گلگوں اشکِ خوں سے ہجر میں فرشِ زمیں — نالہ چوب خیمۂ چرخِ کہن ہو جائے گا

وصل میں وہ حور وش آ کر جو رکھے گا قدم — غیرتِ فردوس بھی بیت الحزن ہو جائے گا

گور مجنوں محمل لیلیٰ بنی گی ہجر میں — مظہرِ شیریں مزارِ کوہکن ہو جائے گا

کیا یوں ہی سوزِ دروں مجھ کو جلائے گا نمود
کیا زبانِ شمع ہر موئے بدن ہو جائے گا

شاہ نیاز احمد خاں نیازؔ

متوفی ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء

حضرت شاہ نیاز بہت بزرگ صوفی درویش اور شاعر تھے۔ وہ مقاماتِ تصوف سے پوری طرح باخبر تھے۔ کہتے ہیں۔

مقام اے نیاز اندر جہان ہر کس نمی داند
فرید دہر و شمسِ وقتم وہمرنگ منصورم

شاہ نیاز بلند پایہ صوفی تھے، ان کی شاعری میں اسلامی روایات پوری طرح پائی جاتی ہیں۔ پیدائش سرہند کی ہے، اُن کے والد حکیم شاہ رحمت اللہ بھی درویش تھے، شاہ نیاز مولانا فخر الدین چشتی نظامی سے ۱۷۸۵ء ۱۷۱۴ء کے زمانہ میں آئے، مصحفی نے ان کو دہلی میں دیکھا تھا۔

شاہ نیاز نے سترہ سال کی عمر میں علوم ظاہری سے فراغت حاصل کی، انیس سال کی عمر میں مولانا فخر الدین کے دستِ حق پر بیعت ہوئے اور علوم باطن سے آگاہ ہوکر پیر کے حکم سے بریلی آئے اور مسجد بی بی جی کے جنوبی حجرے میں قیام فرمایا، رام پور بھی گئے جہاں شاہ عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کی، اس کے بعد تمام زندگی بریلی میں بسر کی اور درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا، اُن کی تصانیف بہت ہیں لیکن ۱۷ کا پتہ چل سکا ہے۔

(۱) شمس العین (۲) کشف العین (۳) مجموعہ قصائد عربی (۴) شرح قصاید عربیہ
(۵) نور العین (۶) دیوان نیاز (۷) رسالہ راز و نیا (۸) تحفہ نیاز
(۹) تسمۃ المراتب (۱۰) لیعرفون (۱۱) لیعبدون (۱۲) حاشیہ شرح چغمنی
(۱۳) حاشیہ ملا جان (۱۴) رسالہ منطق (۱۵) بیاض (۱۶) ملفوظات نیاز

مجموعہ رسائل ہر علوم مختلفہ (پیام مشرق دہلی اپریل ۱۹۲۷ء صفحہ ۱۳ بحوالہ چند شعرائے بریلی) شاہ نیاز بڑے باکمال بزرگ تھے اور نکاتِ تصوف سے عشق و عقل دونوں ہی طریقوں سے واقف تھے، وہ ہمہ اوست کا مضمون یوں پیش کرتے ہیں۔

حسن روی ہر پری عکس روی دوست
رنگ و بوی گلشن خوبی زرنگ بوی اوست

ذات خورشید ست فی الواقع بہ ہر ذرہ محیط
درصفات و ذات ایں پیدا و پنہاں ذات اوست

ہم وجوب و ہم قدم ہم وصف امکان وحدوث
درنگاہ دیدۂ بینا ہمہ حالات اوست

چشم دل نیاز کہ تاباں ست چوں صدف
از آب روشن دربی بہائی اوست

....

عین دریا است حبابم بہ نگاہ تحقیق
ورنہ این قطرہ چرا شورش دریا می کرد

نیا بد درنگاہ تو بجز آں حسن بیرنگی
بہ ہر جانب کہ بینی باشد آں دلدار منظورت

نیست جز ہستی حق پیدا و پنہاں در وجود
چشم دل بکشاد بنگر بی حجاب ای ہوشمند

تذکرہ شعرائے اردو

موسوم بہ

گلِ رعنا

ازمولانا حکیم عبدالحیؑ مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

طبع ثانی ۱۳۵۳ھ

عاجزؔ

عارف الدین خاں عاجزؔ، باپ دادا بلخ کے باشندے تھے، عالمگیر کے عہد میں ان کے والد ہندستان آئے۔

عاجزؔ ہندستان میں پیدا ہوئے۔ منصب زیادہ نہیں تھا مگر مزاج میں قناعت تھی اور نواب لشکر خاں نے رسالہ کی بخشی گیری کو منصب کا ضمیمہ کردیا تھا اس لئے اطمینان اور فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مزاج میں ظرافت اور شعروسخن سے قدرتی لگاؤ تھا، اورنگ آباد پہنچ کر شوق بڑھ گیا تھا۔ فارسی اور اُردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ دونوں زبانوں میں بہت اچھا شعر کہنے لگے، تاریخ کہنے میں بھی سلیقہ تھا۔ ایک روز مرزا افضل قاقشالؔ ''مؤلف تحفۃ الشعراء'' کے

مکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مکان نیا بن کر تیار ہوا تھا۔ افضل نے کہا۔ آپ کو تاریخ گوئی میں دعویٰ ہے۔ اس مکان کی فی البدیہہ تاریخ کہیے، کہا آپ کیا دیں گے۔ انہوں نے کہا۔ جو کچھ کہیے، حاضر ہے، تھوڑی دیر نہیں گزری کہ یہ تاریخ کہہ کر سنادی۔

منزل عیش بہ از چار محل　　　کرد بنیاد چو مرزا افضل

گفت تاریخ بیانش ہاتف　　　منزل جاہ و مکان افضل ۱۱۶۴ھ

کبرسنی میں ایک بار سخت بیمار ہوئے۔ نواب موسیٰ خاں سے کہلا بھیجا کہ میں مرتا ہوں، تاریخ کی فکر کیجیے، انہوں نے جواب دیا تاریخ گوئی میں خود آپ کو مہارت ہے، آپ ہی تکلیف کیجیے۔ یہ سن کر مسکرائے اور اپنے نام و تخلص کے اعداد جمع کیے، ایک عدد بڑھتا تھا فرمایا کاش ایک سال کی مہلت اور مل جاتی تو نام کا نام تاریخ کی تاریخ ہو جاتی۔ دو چار روز کے بعد صحت یاب ہو گئے۔ اچھے ہو کر کسی ضرورت سے نانڈیڑ گئے، وہاں چند روز رہے کہ وعدہ پورا ہو گیا اور نانڈیڑ میں مدفون ہوئے، میر اولاد محمد ذکا کو توارد ہوا، انہوں نے عارف الدین خاں عاجزؔ سے تاریخ وفات نکالی، جس سے ۱۱۷۸ھ نکلتے ہیں، ایک مثنوی لکھی ہے جس میں لال و گوہر کا قصہ نظم کیا ہے، ایہام اور ذومعنین کا شوق تھا مگر مثنوی بہت صاف و سادہ ہے۔ نمونہ

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی　　　عطا کر مجھ کو یاقوتِ معانی

سخن کے در کا مجھ کو جوہری کر　　　سخن سنجوں کو میرا مشتری کر

سخن کا لال دے میری زباں کو　　　درِ معنی سے بھر میرے بیاں کو

....

جنوں کے دشت کا بن کر بگولا　　　خرد کی راہ کو وحشت سے بھولا

سحر سے شام تک مانندِ خورشید　　　طلب کے فرق پر رکھ پائے امید

غزالوں کی طرح سرگرم رم تھا
بیاباں اس کو گلزار ارم تھا

برس جب دو چلا جب راہ میں آہ
نظر میں اس کے آیا دشتِ جانکاہ

کروں اس دشت کی کیونکر صفت کو
زبان پر کس طرح ڈالوں لغت کو

وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار
اجل کا کھیت تھا وہ دشت خونخوار

بیابانِ عدم کے تھا برابر
وہاں تھا حضرت عزرائیل کو ڈر

وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی
وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی

وہاں کی گرد تھی پانوں کی دارو
وہاں کی خاک تھی دوزخ کی بالو

غزلوں کے منتخب اشعار

دیکھ دامن گیر محشر میں ترے ہوئیں گے ہم
خوں ہمارا اپنے دامن سے نہ اے قاتل چھڑا

عاجز ہوں شاہ ملک جنوں میرے واسطے
سورج کلاہ و چتر فلک ہے زمیں ہے تخت

ہے ہمارے بت کا دل پتھر کے چہرے کی طرح
کیا کروں اس کی صفت ہے سخت ہیرے کی طرح

ہر سحر کیا دیکھتی ہو آرسی اے سادہ رو
ہے تمہارے حسن کے دفتر کی دونوں صاف فرد

جب سے اے رنگیں ادا تیرا ہے رنگ گل میں نقش
تب سے میری آہ کا ہے سینۂ بلبل میں نقش

عاجزؔ بھی شمع آہ جلاتا ہے باغ میں
روشن اگر گلوں سے ہوا ہے چراغ باغ

باغ میں اس لالہ رو کے آہ جب جاتے ہیں ہم
دل کے داغوں کو گلوں سے تازہ کر آتے ہیں ہم

عشق سے خوش قامتوں نے سبز پوشی کر پسند
سرو کے بوٹے قبا پر اپنی چھپواتے ہیں ہم

خوش نگاہ کی یاد میں ساغر کو جب گرداں کروں
بے تکلف گردن مینا نرگس داں کروں

اس حنائی ہاتھ کی تعریف خونِ دل سے لکھ
ریشۂ نخل قلم کو پنجۂ مژگاں کروں

چمن میں جا کے وہ رنگیں ادا جب مسکراتا ہے
گلوں سے رنگ اڑ کر لال سا جنگل کو جاتا ہے

ہمارا اشک خونیں یاد میں گل رو کے بہہ بہہ کر
نگہ کو رشتۂ تسبیح یاقوتی بناتا ہے

نبیرہ خاں جہاں خاں لودھی شاگرد خاں آرزو
تذکرہ شمیم سخن صفحہ ۲۲

یکرنگ

مصطفیٰ خاں یکرنگی دہلوی، شاعر ریختہ، معاصر میاں آبرو میگویند کہ بسیار چسپان اختلاط و آشنائے درست بود، نکات الشعرا۔

کہن سال اور کہنہ مشق تھے، اس کے باوجود حضرت مرزا مظہرؒ کو اپنا کلام دکھاتے تھے، مصحفیؔ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک قول کے موافق وہ خانِ آرزو کے اور ایک قول کی بنا پر

شاہ مبارکؔ کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں، مگر خود ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔

آزاد کہتے ہیں کہ بزرگوں سے سنا اور تذکروں میں بھی دیکھا، بڑے مشاق تھے اور اپنے وقت میں سب انھیں خوش فکر و باکمال مانتے تھے، تخلص کی طرح عالم آشنائی میں بھی یکرنگؔ یکتا تھے۔

اس قدر کی ہے حمایت غیر کی
ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

خلق یکرنگ کی ہوئی دشمن
جب سے تیرا وہ دوست دار ہوا

سنتا نہیں ہے بات کسی کی تو اے سجن
تجھ کو ترا غرور نہ جانوں کرے گا کیا

کم نہیں کچھ بوئے گل سیتی فغانِ عندلیب
برگِ گل سے ہے گی نازک تر زبانِ عندلیب

سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے
راستی ہے گی دار کی صورت

پھر گیا ہائے ہم سے وہ مہرو
سرد مہری سہی ہوا کی طرح

کہتے ہیں ہم پکار سنو کان دھر سجن
گر غیر سے ملوگے تو دیکھوگے ہم نہیں

ہرگز تم اب کسو کے سخن آشنا نہیں
سب خوبیاں ہیں تم میں و لے اک وفا نہیں

یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت و لے
مظہرؔ سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
میرا صبر و قرار جاتا ہے

گر خبر لینی ہے تو لے صیاد
ہاتھ سے پھر شکار جاتا ہے

کیا جانیے کہ وصل ترا کس کے ہو نصیب
ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے

یکرنگؔ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط
رکھتا ہوں دو نَین جو کہو تو نذر کروں

اس زُلف کا یہ دل گرفتار ہے بال بال — یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں

مجھ کو معلوم یہ ہوا گل سے — پھول جاتے ہیں زر سے دولتمند

شیفتہ

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

نواب مصطفیٰ خاں کے دادا ولی داد خاں کوہاٹ سے دہلی آئے۔ نواب مصطفیٰ خاں کی ولادت ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء کو دلی میں ہوئی۔ فرزند عظیم الدولہ سرفراز الملک ہوئے۔ مولوی محمد نور، مولانا کرم اللہ محدث اور دوسرے نامور علماء سے تعلیم پائی اور سفرِ حج میں شیخ محمد عابد سندی مشہور محدث سے سند حاصل کی۔ شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی، حکیم مومن خاں سے مشقِ سخن کی۔ نواب کی سخن گوئی سے زیادہ سخن فہمی کی دھوم تھی، مرزا غالب تک ان کی سخن فہمی کے معترف تھے۔ مرزا کے نزدیک نواب کی پسند شعر کے حسن قبح کا معیار تھی۔ کہتے ہیں۔

غالب بہ فن گفتگو ناز دباین ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

نواب نے حج کے بعد اس شغل کو کم کر دیا تھا، کبھی کبھی دوستوں کے کہنے سے کچھ کہہ لیتے تھے۔ تصنیفات میں ایک فارسی دیوان، ایک ''اُردو دیوان'' ایک مجموعہ ہے جس میں فارسی انشاء پردازی کا اعلیٰ نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔ ایک سفرنامہ ہے ترغیب **السالک الیٰ احسن المالک** فارسی نام اس کارہ آورد ہے۔ علاوہ ان کتابوں کے مبسوط تالیف ''گلشنِ بے خار'' ہے جس میں ریختہ گو شعرا کے کلام کا انتخاب ہے۔ اسی سے ان کی سخن فہمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

نواب دین دار اور مذہبی آدمی تھے۔ جوانی میں مولانا شاہ اسحاق محدث کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ وہ ہندوستان سے ہجرت فرما گئے تو حضرت شاہ عبدالغنی محدث سے بیعت کر کے

حلقۂ مشائخ میں داخل ہو گئے۔ ۶۳ برس کی عمر پائی۔ ۱۲۸۶ء میں انتقال ہوا۔

ہائے اس برق جہاں سوز پہ آنا دل کا — سمجھے جو گرمیٔ ہنگامہ جلانا دل کا

ایک نالہ میں ستم ہائے فلک سے چھوٹے — جس کو دشوار سمجھتے تھے سو آساں نکلا

کب طالعِ خفتہ نے دیا خواب میں آنے — وعدہ بھی کیا وہ کہ وفا ہو نہیں سکتا

نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے چین — دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی — صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

کیا جانے گزری غیر پہ کیا اس کی بزم میں — آئے وہ اس طرح سے مجھے پیار آ گیا

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر — کیا کوئی اور ستم یاد آیا

کہتا تھا وقتِ نزع کے ہر اک سے شیفتہ — دینا کسی کو دل تو وفادار دیکھ کر

جو بات میکدے میں ہے اِک اِک زباں پہ ہے — افسوس مدرسہ میں ہے بالکل نہاں ہنوز

اے تابِ برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی — کچھ رہ گئے ہیں خار و خسِ آشیاں ہنوز

عبث ہے شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرنا — ملے گا بادہ کشوں سے نشانِ بادہ فروش

کہتے ہیں بے وفا مجھے میں نے جو یہ کہا — مرتے رہیں گے تم ہی پہ جیتے ہیں جب تلک

یاں عجز بے ریا ہے نہ واں نازِ دلفریب — شکرِ بجا رہا گلۂ بے سبب تلک

ہیں جاں بہ لب کسی کی اشارت کی دیر ہے — دیکھے ہے اس نگہ کو قضا اور قضا کو ہم

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ — دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

دشمن نواز یار و فلک بوالہوس پرست — کس سے جفائے غیر کا یا رب گلہ کروں

کچھ اور بے دلی کے سوا آرزو نہیں — اے دل یہ یاد رکھیو کہ ہم ہیں تو تو نہیں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ — طاعت میں کچھ مزا ہے، نہ لذت گناہ میں

آہ و زاری نارسا، شوقِ اسیری بے اثر — کون لائے آشیانے تک مرے صیاد کو

ننگ مہمائیٔ دشمن بھی کیا ہم نے قبول
شیفتہؔ لیکن نہ آئے وہ کسی تدبیر سے

ناصح تری زبان ترے بس میں نہ ہو تو پھر
انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے

اے جان لب پہ آ کے ٹھہرنے سے فائدہ
رہنا ہوا تو رہ گئے چلنا ہوا چلے

ایسی رغبت سے قتل گماں کا ہے کو تھا
شیفتہؔ اس کو تو لو تم سے محبت نکلی

اے عدو کس لئے نازاں ہے سمجھ تو آخر
جس سے ہم خوار ہوئے ہیں یہ وہی عزت ہے

وہ شیفتہؔ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

جس لب کے بوسے غیر لے اس لب کے شیفتہؔ
کم بخت گالیاں بھی نہیں تیرے واسطے

سحر ان کا ارادہ ہے سفر کا
قیامت آنے میں شب درمیاں ہے

گلستانِ سخن

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

ساقی کو میکدہ میں سرِ ناؤ نوش ہے
صوفی کو خانقاہ میں سرِ وجد حال ہے

عاشق کو اضطراب ہے عجز و نیاز سے
معشوق کو غرور ہے غنج و دلال ہے

منظور ہے حکیم کو ہر شے کی معرفت
حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہے

ہر کام فلسفی کا سفاہت کے ساتھ ہے
ہر بات منطقی کی مراد جدال ہے

اربابِ حکمتِ نظری کو عمل نہیں
اہلِ کلام کو ہوس قیل و قال ہے

جن کو کہ دستگاہ ہے فنِ نجوم میں
عمر ان کی صرف زائچہ ماہ و سال ہے

ہیں بعض لوگ درپے اسراف رات دن
بعضوں کو روز و شب سرِ توفرِ مال ہے

بعضوں کو ہے مذاق میں فخرِ نسب لذیذ
بعضوں کو ذوقِ دعویٰ فضل و کمال ہے

مفلس کو فکر ہے کہ کسی ڈھب سے کچھ ملے
منعم غریقِ لجۂ بیم و زوال ہے

جو ہیں مرضِ اسیرِ چمن ان کو بزم میں — ذکرِ شجر کبھی کبھی فکرِ مآل ہے
جی میں کسی کے خواہشِ آرائشِ لباس — دل میں کسی کے حسرتِ جاہ وجلال ہے
کوئی طلب میں اشہبِ گلگوں نظیر کی — کوئی اسیر شوقِ شعار غزال ہے
کوئی خدائے قامتِ آفت خرام ہے — کوئی خراب نرگسِ جادو مثال ہے
ناحق کسی کو فکر، کسی کو شکایتیں — بے وجہ کوئی خوش ہے، کسی کو ملال ہے

کس واسطے ہم آتے ہیں دُنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھئے تو بہت کم خیال ہے

گلستانِ سخن

مرزا قادر بخش صابر ۱۲۷۱ھ

آباد

نوجوان یوسف جمال محمد یعقوب علی ولد محمد اسحاق خاں ساکن قدیم شاہجہاں آباد موزونی طبیعت سے کبھی زبان پر اشعار آجاتے ہیں۔ یہ تین شعر ملے ہیں ۔

اس کی قامت کی یاد میں ہم نے | مصرعِ سرو انتخاب کیا
تو نے دریا میں اِک نگاہ کے ساتھ | قطرہ آب کو شراب کیا
ان خراباتیوں کی صحبت نے | تجھ کو آباد کیا، خراب کیا

آتی

نواب احمد یار خاں خلف الصدق نواب فلک جناب ربدہ روسائی عالی تبار سلالہ خاندان عز ووقار نواب محمد امیر خاں مرحوم والی ٹونک محبت دنیائے دوں سے کنارہ کر کے خاطر کو یادِ حق میں مشغول اور طبیعت کو مرضیات ایزدی میں مصروف کیا، آزادانہ بسر کرتے ہیں، بیشتر اوقات سیاحت وسفر میں بسر ہوتے ہیں خصوصاً زیارت اولیاء میں گزارتے ہیں۔ شعر فارسی گاہ گاہ موزونی طبیعت سے ان کی چشمہ طبع سے تراوش کرتا ہے۔ یہ شعر ان کی زبانِ فصاحت بیان سے مسموع ہوئے۔

بعشق روئے تو در باختم دل و جان را | بکار زلف تو کردم متاع ایمان را
حیات کشتۂ تیغ تو گردہند بخضر | خوردز چشمۂ فولاد آبِ حیوان را
گدای کوچہ جان بخش گلرخاں آتی | بہ نیم جو نخرد قصر باغ رضوان را
بسی گذشت کہ از گل خبر نمی شنوم | ولی نماند مگر بلبل خوش الحان را

انصاف

عبدالرحمٰن خاں ساکن اکبرآباد راجہ بنارس کی سرکار میں جو بالفعل اکبرآباد میں قیام پذیر ہے، نوکر اوصاف حمیدہ اس کے وضیع وشریف کی زبان پر ہیں یہ شعر اس کا مسموع ہوا۔

حسد کی آگ سے غیروں کا دل کباب ہوا | ہمارے ساتھ جو کی اس نے بادہ خواری رات

اوجؔ

عبداللہ خاں ساکن سردھنہ نوشت وخواند سے اس قدر بہرہ رکھتا تھا کہ اپنے اشعار کو لکھ لیتا اور اپنی لکھی کو پڑھ لیتا۔ چونکہ اصل طینت میں فکر بلند اور طبیعت رسا واقع ہوئی تھی صید مضامین کے واسطے دشت ناپید کنار خیال میں جاتا اور تیز پائی سعی سے اس کا سراغ پاتا، لیکن اس کی شوخی اور اپنی ناتوانی سے باندھ نہ سکتا۔ رفتہ رفتہ طبیعت کجی کی طرف مائل ہوگئی بلکہ اپنی اعوعاج پر راسخ ہوگئی اور یکتائی کا مضمون ذہن میں جم گیا۔ مشاعرہ میں شعر کو ایسے لہجہ سے پڑھتا کہ اس کے خلل دماغ پر دلالت کرتا۔ بیشتر کاملانِ سخن بطریقِ ظرافت کے اس کو استاد کہتے ہیں اور وہ اس سخن کو واقعی جان کر علم مباہات بلند کرتا، ہمیشہ زمین ہائے سنگلاخ کی تلاش میں رہتا اور مضامین میں بلندی کی فکر میں آسمان پر چڑھ جاتا اگر ایسا ذہین استعداد علمی کا بدرقہ رکھتا یا کسی خضرِ راہ سے ملتا البتہ شاعری کے رسم وراہ سے آگاہ ہوکر منزل مقصود کو پہنچ جاتا۔ بہر کیف تین شعر اس کے مرقوم ہوتے ہیں۔

بہاتا ہے جوشِ عشق شیریں دشوں میں رونا — ہے آپ شورگریہ آبِ زلال اپنا

غیر جنس ایک جگہ رہ کے جو ہوتا ہم جنس — شعلہ آتش کا پروبال سمندر ہوتا

سخن اپنا نہیں یہ اوجؔ کچھ الہامِ غیبی ہے — لکھی ہے کاتبِ قدرت نے موزونی طبیعت میں

بیخودؔ

محمد نام الدین خاں ولد محمد حیات خاں حاکم وقت کی طرف سے عہدہ اسسٹنٹی پر مامور اور شیوہ راست معاملگی میں و نیک نہادی میں مشہور ہے۔ اصلاحِ شعر ریختہ اپنے والد ماجد سے

لیتا ہے۔ یہ دو شعر اس کے نتائج افکار سے ہیں۔

رہ گیا پیکاں جو پہلو میں ترا اچھا ہوا
دل لگی کو اور دل پیدا ہوا، اچھا ہوا

تھی ہمیں مدت سے اے بیخود اسیری کی ہوس
ہوگیا دل مائلِ زلفِ دوتا اچھا ہوا

تحسین

محمد حسین خان ساکن شاہجہاں آباد، جوان سعادتمند، کانِ حیا، معدن حلم، چند سال سے کتابیں چھاپنے کا کارخانہ اپنے کاشانۂ دولت میں مقرر کیا اور مطبع کا نام مصطفائی رکھا ہے، ہر چند اس شہر میں کثرت مطبع اتنی ہے کہ حوصلہ شمار کا ان کی تعداد سے تنگ ہے لیکن اس ہوشیار طبع کے سلیقہ سے نسخہائی مطبوعہ کی صحت اور درستی خط مشہور آفاق ہے۔ یہ چند شعر اس کے افکار گوہر نثار کا نمونہ ہیں۔

آزار ہوا اس کو مگر عشق بتاں کا
بے طور ہے نقشہ دلِ بیتاب وتواں کا

جب بت سے نہ راضی ہوں تو بتخانہ سے کیا کام
تحسین چلو کعبہ کو جھگڑا ہے کہاں کا

اے دل تو عشق کیجو مگر دیکھ بھال کر
عاقل کو چاہئے کہ کرے فکر دور کا

لب کی خوبی میں کیا سخن ہے پر
فتنہ روزگار ہیں آنکھیں

کوئی کیونکر بچائے جاں ہمدم
ایک خنجر گزار ہیں آنکھیں

صیاد اس طرح جو نہ کرم پہ عتاب ہو
کیوں آشیاں چمن میں ہمارا خراب ہو

تحسین ان کو دیکھنے جاتے تو ہو مگر
ایسا نہ ہو کہ جاں کو وہی پھر عذاب ہو

خیالِ بتاں دل میں رکھتے ہو تحسیں
مگر تم بھی رسوا ہوا چاہتے ہو

اگر نہیں ہے تجھے ذوقِ میکشی تحسیں
تو تیرے ہاتھ میں یہ ساغر وسبو کیا ہے

یار کہوے کہ اٹھ مرے در سے
دل یہ کہہ دے یہیں رہا کیجئے

علی مولا خاں

ساکن شاہجہاں پور، نوجوان ظریف مزاج، خوش طبع ہے، حسن جمال کا یہ عالم ہے کہ اگر اقتضائے جوانی سے خوباں دلربا پر دل آجاوے، عاشقی سے معشوقی کی نوبت پہنچ جاوے۔ سخن کی رنگینی گل پر ناز اور کلام کی لطافت گوہر پر زباں دراز کرتی ہے۔ ہر چند اشعار نازک اس نازک طبع کے بہت مسموع ہوئے ہیں لیکن سوائے اس شعر کے ذخیرہ حافظہ میں نہ تھا۔

کیا لکھیں اور ذرا غور کریں آپ ہی
ڈرتے ڈرتے یہ لکھا ہے کہ پڑھیں آپ ہی

تسلیم

حاتم خاں قوم افغان اور روسائے رام پور میں سے ہے۔ شاگرد علی بخش بیمار ذہن سلیم اور طبع مستقیم رکھتا ہے۔ یہ چند اشعار منتخب ہوئے۔

شباب گیسوئے مشکیں کے عشق میں گزری　　پھرا کیا میں خطا میں تمام شب بہکا
کچھ اس کے حق میں بلے ہوں گے وہ لب میگوں　　یہ بات کیا ہے کہ تسلیم بے سبب بہکا
پہلے اے غنچۂ گل منہ تو ذرا بنوالے　　کیجیو پھر دہن یار سے نسبت پیدا
کہربا کا ہے کو اس طرح سے تنکے چنتا　　تیرے دیوانے کی کرتا جو نہ رنگت پیدا

۳۲ رجسٹر اوّل　　حاتم خاں ابن صالح محمد خان

تنویر

خدا بخش خاں نام، شاگرد رشید حافظ قطب الدین، خوش اخلاق و نیک نہادی ایک

شیوہ ہے کہ دستِ قدرت نے اس کی ذات میں ودیعت رکھا ہے، مشقِ سخن یہاں تک پہنچی ہے کہ شرائط شعری سے سمجھ کر ارادہ کو افکار گونشار سے متعلق کرتا ہے والّا اگر ارادہ قامت سخن کلیہ موزونی سے وایما متجلی ہوتا رہے۔ یہ چند شعر اس کے نتائج فکر سے ہیں۔

سیکھ لیں اس نے بھی اس عہد شکن کی باتیں	کہ ٹھہرتا ہی نہیں دل کسی عنواں میرا
دل میں نشتر ہی چبھا کرتے ہیں ہر دم تنویر	لے چکے دم وہ کہیں کاوش مژگاں میرا
یہ نہ جانا تھا ہمیں کو ہوئے گا آزار یہ	سنتے تھے ہم عشق بھی ہے نام ایک آزار کا
دیکھا اسے دریا میں تو بیتاب ہی دیکھا	غربت سے زیادہ نظر آیا وطن موج

جان کھائی ہے میری ان پوچھنے والوں نے اور
کیا کہوں کہنے کے قابل ماجرائے دل نہیں

....

خدام حشر اپنے گریباں کریں گے چاک
یونہی چلو گے واں بھی جو دامن سنبھال کے

....

چہرہ سفید آج ہے تنویر خیر ہے
سچ تو کہو کہ غم میں ہو کس مہ جمال کے

حیاتؔ

محمد حیات خان ولد احمد یار خان قوم افغان ساکن رام پور (مقیم میرٹھ) مرد کریم الاخلاق عمیم الاشفاق ہے۔ اگرچہ بیشتر افادہ روشن شاہ روشنؔ سے کیا تھا لیکن نواب مرحوم الٰہی بخش خاں معروف غفر اللہ لہ سے بعد شرف بیعت کے گاہ گاہ فن سخن میں بھی مستفید ہوا۔ تین برس سے

پرمٹ کے محکمہ میں گرداوری کے عہدہ پر مامور ہے۔ یہ دو شعر نتائج افکار سے ہیں:-

ہم اور بلبل و پروانہ بزم الفت میں — ازل سے کھائے ہوئے دل پہ داغ ہیں دو تین
تیرے بسمل کی یہ حالت ہو تہ خنجر ناز — سر جدا، ہاتھ جدا، پانوٗ جدا وجد کرے

خاصؔ

محمد حیدر خاں ولد الٰہی بخش خان باشندہ شاہجہاں آباد، نوجوان نیک اطوار، پلٹن سپاہیاں شاہی میں منشی گیری کے عہدہ سے ممتاز ہے۔ یہ اشعار اس کے [illegible]ب ہیں:-

تھی جدائی گرچہ پہلو میں مرے وہ یار تھا — ناز تھا، آزردگی تھی، رنج تھا، انکار تھا
کاوشیں جھیلیں نہ کیا کیا یادِ مژگاں میں تری — گاہ نشتر تھا جگر میں، گاہ دل میں خار تھا
دیکھ لے نقشہ اگر وہ عالمِ تصویر کا — تو تو کیا زاہد دل آوے اس پہ تیرے پیر کا
سخت مشکل ہے کہ ہے وہ شوخ تو نازک دماغ — اور نالہ ہے شعار اپنے دلِ دلگیر کا
ماہِ نو دیکھ کر ابرو کو دیکھا چاہیے — دیکھنا منظور ہو اے دل اگر شمشیر کا
کیوں تقاضائے خلش ہردم نفس کے ساتھ ہے — دل میں شاید رہ گیا ہے کوئی پیکاں تیر کا

خاکیؔ

خاں جہاں افغان ساکن شاہجہاں پور شاگرد مولوی عبداللہ خان علوی، ذہن سلیم اور طبع قویم رکھتا تھا، گاہ گاہ شعر فارسی کہتا اور مرحوم سے اصلاح لیتا۔ یہ شعر اس کا یاد ہے۔

آنکہ بر ستیم انکار بہ بیجا می کرد — چشم میگوں ترا کاش تماشای کرد

صفحہ ۲۱۳

دولہ

جہانگیر محمد خاں والی بھوپال۔

پھولوں میں بھی میرے وہ گل اندام نہ آیا
مرنا بھی مرا ہائے مرے کام نہ آیا

دل جلوں کے بعد مرنے کے بھی لگ جاتے ہیں پر
راکھ ہو کر اڑ گیا دیکھو پر پروانہ آج

رہے وہ سبز قدم سرخرو نہ ہووے کبھی
حنا تیرے سر انگشت پر آ کر نہ لگے

راسخ

سعادت علی خان شاگرد مومن، مرد نیک نہاد، خوش اخلاق، تیز فکر ہے، ہر چند شعر گوئی کا اتفاق کم ہوتا ہے لیکن جس قدر ہے خالی لطف سے نہیں ہے۔

ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر
سرمہ ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں

میں بنائے جہاں سہی لیکن
جب کہ ناپائیدار ہوں کیا ہوں

رہا

غلام محمد خاں قوم افغان ساکن اکبرآباد شاگرد خلیفہ سید گلزار علی اسیر جد بزرگوار اس کے والی بھرت پور میں عہدے ہائے جلیلہ سے ممتاز رہے اور اس کے پدر عالی مقام نے اس کے ایام طفلی میں شوق سلح شوری غالب تھا اور اسی سرکار میں عہدہ سپہ گری کثرت اعتبار سے ابنائے روزگار میں امتیاز بہم پہنچائی، کہتے ہیں کہ اس کامل خرد نے مولوی محمد کامل علیہ الرحمۃ سے کہ نجوم وہیئت

وہندسہ میں یگانہ روزگار اور وحید قروں اور ادوار تھے، تمام کتب درسیہ ابتدا سے انتہا تک پڑھیں۔ ریختہ میں زبان شستگی اور فکر بلندی سے خالی نہیں۔ یہ چند شعر اس کے مرقوم ہوئے۔

کیوں قافیہ یہاں تنگ نہ ہو اہلِ سخن کا — مضموں ہے میرے شعر میں تنگی دہن کا

اللہ ری بناوٹ کہ بگڑنے لگے سن کر — کچھ وصف کیا میں نے جو بیساختہ پن کا

عریاں تنی کے لطف اٹھیں گے شب وصال — اس ماہ نے کیا ہے لباسِ کتاں پسند

دل لگ چلا ہے اس کا بھی شاید کسی طرف — آنے لگا جو کچھ مرے غم کا بیاں پسند

پھرتے ہیں یوں دل چھپائے ہم ہوائے دہر سے
جس طرح لاوے چھپا کوئی تہ دامن چراغ

اسے غیر کی بزم سے کھینچ لایا — ہم آہِ جگر کے اثر پر فدا ہیں

کی آخر کو رو رو جگہ اس کے دل میں — رہا ہم تری چشمِ تر پر فدا ہیں

کہنا ترا ہمارے سر آنکھوں پہ ناصحا — پر کیا کریں جو دل ہی نہ ہو اختیار میں

بو آج کس کی زلف معنبر کی لے اڑی — یہ بوئے عطر بیز جو باد سحر میں ہے

دریا رواں ہو گر میں نچوڑوں اسے رہا — عالم سحاب کا مرے دامانِ تر میں ہے

سپہر

شتاب خاں جادۂ اخلاص میں گرم رفتار اور دعوی صداقت میں راست گفتار، شائستگی ایک خلقت ہے۔ اس کی قامت احوال پر راست فکر اور سلاست طبع دور گردی خیال کے اوصاف کا بیاں زباں خامہ چرب گفتار کی مجال سے باہر ہے، اصلاح شعر صابر دلسوختہ محبت سے لیتا ہے،

اس کا کلام فرطِ شیرینی سے صفحۂ قرطاس کو کلمۂ قند اور لبِ اعتراض کو بند کرتا ہے، اس کا سخن کثرت ملاحت سے مذاقِ جانِ احباب میں لذّت رساں اور زخمِ دلِ اعدا پر نمک فشاں ہے۔ یہ چند اشعار لکھ کر محاسنِ کلام سے آگاہ کرتا ہوں۔ ؎

کیا ہوا گر دہنِ یار نے چھڑکا نہ نمک
دل تنگ ظرف کا شرمندہ احساں نہ ہوا

اے شورِ حشر جا کہ مجھے آگئی تھی نیند
کیوں تو نے غل کیا کہ میں بیدار ہوگیا

مے کے پینے سے خدا کا میں گنہگار رہا
محتسب تو میرے کوں درپے آزار رہا

خون ہو ہو کے بہا دل تو بلا سے لیکن
سرخ رو تجھ سے تو اے دیدۂ خونبار رہا

ہو غریقِ رحمتِ حق وہ عجب انسان تھا
میکدہ کی پہلے جو موجد ہوا تعمیر کا

حسن کی نیرنگیاں دیکھو کہ ہم صحبت تھے اور
زلف کافر ہوگئی اور رخ مسلماں ہوگیا

کیوں رنج دیا تو نے عبث آنکھ ملا کر
کہ دل کا ملانا تجھے منظور نہیں تھا

کھلے نہ ہجر میں لب وصل کی دعا پہ سپہر
بتوں کو مانگتے ناداں خدا سے کیونکر ہم

دل ہو تو خار و گل سے ہو کچھ ربط کی ہوس
اب ناتوانیوں کا ہمیں تو گلا نہیں

اس بندگی پر اپنی وہ ناآشنا مزاج
ملتا ہے ہم سے یوں کہ ذرا آشنا نہیں

تکلیف نماز اور ہمیں زاہد سے عجب ہے
بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں

ہوتا ہے کیوں تلاش بتاں میں خراب دل
چل اپنے گھر میں بیٹھ کے یاد خدا کریں

سعید

محمد سعید الدین خاں خلف رشید مولوی محمد اساس الدین ابن سرکردہ اربابِ کمال ظاہری و باطنی حافظ ابوالموید خاں مرحوم اسکنہ اللہ فی الجنان الخلود ہر چند وطن قدیم سرزمین

بدایوں ہے، فن سخن میں نواب زین العابدین مرحوم عارفؔ سے استفادہ کیا ہے۔ یہ چند شعراس کے ہیں۔

اندام صاف یار میں موی کمر نہیں ــــ اس آئینہ میں بال کا ہرگز اثر نہیں

ان روزوں بے خودی میری کم ہے ذرا ــــ اے ساکنان کنج خرابات چاہیئے

گو لامکاں تلک تو رسائی ہے آہ کی ــــ پر کیا ہے گر بتوں ہی کے دل میں نہ راہ کی

سکندرؔ

سکندر خاں ساکن شاہجہاں پور طالب علمی کے دنوں میں چند سال شاہجہاں آباد میں قیام کیا۔ شعر ریختہ کہتا اور مومنؔ خاں سے اصلاح لیتا، ایک روز اس شعر میں استاد سے مباحثہ کیا۔

دم لینے میں ہے مجھ کو تو آئینہ کا لحاظ ــــ اور یار یہ سمجھتے ہیں مجھ میں ہے دم نہیں

مومنؔ خاں اس شعر کو مہمل جانتے تھے اور وہ معنی شعری کو کرسی لفظ پر بٹھاتا تھا جب ان کی طرف سے اس شعر میں مبالغہ حد سے گزر گیا تو اس نے مشورہ ترک کر کے اپنے کلام میں خود ہی اصلاح شروع کردی۔ یہ اشعار اس کے ہیں۔

ہوش کھوئے ترے نظارہ نے ایسے کہ سحر ــــ آئینہ اپنی ہی حیرانی پہ حیراں نہ ہوا

کس کا نام اس کے لبوں پر تھا کہ اس نفرت پر ــــ حرف ناصح سے دماغ اپنا پریشاں نہ ہوا

شہیدؔ

مولوی فخر الدین خاں اصل وطن شاہجہاں پور لیکن شاہجہاں آباد میں آباد ہوگئے اور اسی کو وطن بنالیا۔ صاحب اخلاق حمیدہ و پسندیدہ تھا۔ علم فارسی میں یگانہ اور فن انشاء میں یکتائے

زمانہ۔ یہ چند اشعار بطور یادگار درج کیے جاتے ہیں۔

سینہ ہے آئینہ مرا اس میں ترا خیال — دل نے تیری شکل کا اِک دوسرا پیدا کیا

شب تاریک سے اپنی فروغِ صبح پیدا ہے — تصور مجھ کو رہتا ہے جو اس کے روئے افشاں کا

نہ چھوٹے گا کبھی وحشت نے ایسا اس کو الجھایا — یہ جسم زار اپنا خار ہے صحرا کے دامن کا

روئے تاباں کو میں تیرے رخِ روشن سمجھا — خطِ رخسار کو اِک ماہ کا خرمن سمجھا

مرغِ دل چہرۂ گلفام کو گلشن سمجھا — حلقۂ کاکلِ پیچاں کو نشیمن سمجھا

تھا خیالِ رخِ جاناں پسِ مردن جو مجھے — شمع کو اپنی لحد تیرہ میں روشن سمجھا

رخِ دلدار ہے بوسہ کے تصور سے کبود — میں سمن زار میں پھولا گل سوسن سمجھا

صاحب

شیر زماں خاں نبیرہ یکتائے روزگا حافظ عبدالرحمٰن خاں احسانؔ مرحوم، اصلاح مرحوم سے ان کی حیات بھر لیتا رہا، ان کی موت کے بعد ذوقؔ سے استفادہ کیا۔

شرمندہ ہے ناکامیٔ فرہاد سے اتنا — ہرگز کبھی تیشہ کا سر اوپر نہیں ہوتا

کس کس کو میں بتاؤں کہ بارِ غمِ فراق — دل پر نہیں، جگر پہ نہیں، جان پر نہیں

ذرا آنکھوں میں رکھنا اس کو صاحب — کہیں یہ طفل اشک ابتر نہ ہووے

صادقؔ

محمد عزیز الدین خاں ولد مولوی اساس الدین خاں نبیرہ حافظ عبدالموید خاں مرحوم برادر حقیقی محمد سعید الدین سعید بدایونی۔

اس تنگناے دہر میں ہم جس کو اے عزیز
دلدار سمجھے تھے وہ دل آزار ہو گیا

رہے تا بعد مردن بھی علامت جذب کی باقی
بنانا سنگ مقناطیس سے صادق کے مدفن کو

لے گئی دل اک نگہ میں اُس کی چشم نیم خواب
مست ہم سمجھے تھے اس کو پر بہت ہشیار ہے

ایک نگاہِ ناز سے ہے کام یاں اپنا تمام
قتل کرنے کو مرے کیا تیر و پیکاں چاہیے

طاہر

محمد طاہر قندھاری زبان فارسی میں بہت ہی سلاست کے ساتھ تکلم کرتا ہے۔ عروض و قافیہ سے بھی واقف ہے۔ صرف ونحو عربی میں استعداد کامل۔ اہل ہند سے زبان اردو صاف اور طرز ریختہ دلچسپ ہے۔

ناز کرتی ہوئی ہم پر جو صبا آتی ہے
کوچہ زلف سے اس شوخ کے کیا آتی ہے؟

عشق

حکیم عزت اللہ خاں خلف رشید حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، صاحب دیوانِ ریختہ ہے۔ متانت الفاظ اور رزانت تراکیب سے اشعار خالی نہیں۔

قفس سے تجھ کو اور زلفِ بتاں کے دام سے مجھ کو
خدا کس رنگ سے اب دیکھئے بلبل نکالے گا

برنگ نکہت گل خانہ بردوش آہ بیٹھے ہیں
یہ آئی ہم بھی اے بادِ بہاری تک ٹھہر جانا

زنجیر بپا دست بسر داغ بدل ہائے
اے شوخ یہ ہے تیرے گنہگاری کی صورت

کیونکر آوے نہ مجھے اب کمر یار پسند | فکر باریک ہے اور معنی دشوار پسند
رسوائے خلق تونے محبت کیا مجھے | میرا نہ جانتا تھا کوئی نام اب تلک

غم

محمد الف خاں خلف اصالت خاں رسالہ دار ساکن عرب سرا۔ شاہجہاں آباد سے تین کوس کے فاصلہ پر۔ مدت دراز سے قصبہ کول ضلع علی گڑھ میں محمد فیض احمد خاں کی سرکار میں ملازم ہے۔ جودت فکر اور رسائی ذہن اس کے کلام سے ظاہر ہے۔

ایک جھگڑا ہے چکتا ہی کسی طرح نہیں | دم الجھتا ہے تری شوخیٔ بیجا سے مرا
غم ترے اتنے تغافل سے موا جاتا ہے | تو اگر آئے تو اس میں ترا کیا جاتا ہے
نزع کے وقت زبس شوق ہے نظارہ کا | دم سمٹ کر مری آنکھوں میں کھنچا جاتا ہے

فخر

محمد فخر الدین خاں متوطن شاہجہان پور، اربابِ اعتبار اور صاحبانِ اقتدار میں محسوب اور حسنِ اخلاق اور عموم وفاق سے طبائع احباب میں مرغوب ہے، شیرینی سخن کو نمکِ ظرافت سے ترکیب دے کر مذاقِ ارباب وفاق کو لذت تازہ بخشتا ہے۔

ہم سے کچھ اور ہی ہے دل میں کدورت تجھ کو
یوں تو کہنے کو اے شوخ کسی کا نہ ہوا

فراقؔ

حکیم جالینوس فطرت بقراط فطنت حکیم ثناء اللہ خاں حق یہ ہے کہ سخن کو طرز بخشی اور معنی کو بلندی تازہ عطا کی۔ صاحبِ دیوان، انواعِ سخن پر قادر اور اصنافِ کلام پر مقتدر تھے۔ اگر بہ اعتبار صفائی عقیدہ اور کمالات باطنی اور رقت قلب اور دلداری آشنا و بیگانہ اور اجرائی کار مردم اور اعلائی کلمۃ الحق کے زمرہ اولیاء و اصفیاء میں شمار کریں تو عجب نہیں۔ دیوانِ بلاغت عنوان سے یہ شعر منتخب ہوئے۔ ؎

جو کچھ کہ دیکھنا منہ پر ہی صاف کہہ دینا　　فراقؔ بندہ ہوں آئینہ کی صفائی کا

برنگ آئینہ رہتا ہوں روز و شب حیراں　　خدا ہی جانے کہ ہوں محو کس کی صورت کا

جہانِ نظر کی ہر اک نوک خار ہے پر خوں　　یہ کون دشت میں ایسا برہنہ پا گزرا

جوں ریگ رواں خاک نشیں ہوں ازل سے

نے قصد وطن کا، نہ ارادہ ہے سفر کا

بعد مرنے کے بھی اک گردش رہی ہم کو مدام　　مشت خاک اپنی رہی تھی کچھ تو پیمانہ بنا

دل تھامتا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ　　ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

چمن کی سیر کو آجاتے ہیں کبھو گلچیں　　دماغ کس کو یہاں آشیاں بنانے کا

یہ غم ہے ساغر و مینا مجھے کہ میرے بعد　　ذرا بھی تم کو کوئی منہ نہیں لگانے کا

مت آنکھ لڑا اس سے فراقؔ اب یہ کہا مان　　کہتا ہوں تجھے میں مجھے الزام نہ دینا

زلفوں کا بناتا ہی رہے جس کو سدا یاد　　پھر ہم سے غریبوں کو کرے اس کی بلا یاد

تھا دل میں کچھ کہوں گا پہ جاتے ہی روبرو　　میری زبان ہوگئی بے اختیار بند

کس زلف کا شیدا ہے مرا دل نہیں معلوم
کس چشم کا زخمی ہے یہ بسمل نہیں معلوم

یہ دل ہی ہے ہمارا جو اس کے ہو مقابل
منہ دیکھ آئینہ کا جو ہو اس کے روبرو

کبھو تو زلف میں لے جائے ہے کبھو خط میں
پھرے ہے ساتھ لئے دل کہاں کہاں مجھ کو

ٹھوکر کے سوا چلتے نہیں ان کی بلا سے
پامال کوئی شخص ہو برباد ہو کوئی

گلرو تو کسی طرح نہیں ہوتے ہیں اپنے
کاہے کو فراق ان کے لئے خوار ہو کوئی

فرحتؔ

محمود علی خاں خلف نواب حکیم نصر اللہ خاں وصالؔ ابن ثناء اللہ خاں (یادگار شعراء) نوجوان خوش اسلوب اور وجاہت ظاہری سے بہرہ مند، تحصیل علم کی طرف متوجہ، کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔ یہ چند اشعار ان کے ہیں۔

اس نے تو نامہ بر کو کیا قتل اور مجھے
ہر لحظہ انتظار ہے خط کے جواب کا

میں نے ہی بزمِ غیر میں کی شب کو مے کشی
میری ہی آنکھوں میں تو نشہ ہے شراب کا

لے جلد تو خبر کہ کچھ اب شام سے ہی آج
ہے حال بے طرح ترے خانہ خراب کا

عاشق تو سبھی ہوتے ہیں دنیا میں عزیزو
پر میری طرح سے کوئی رسوا نہیں ہوتا

قلقؔ

سلطان خان قوم افغان، علوم رسمی میں استعداد تمام اور فنون متداولہ میں دستگاہ مالا کلام کتب فارسی کو بہت تحقیق اور تدقیق کے ساتھ پڑھاتا ہے۔ اکثر فنون کو جناب مولوی امام بخش

صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ سے حاصل کیا، خصوصا فن فارسی گاہ گاہ شعر ریختہ بھی آشنائے زبان گوہر فشاں ہوتا ہے۔ یہی شعر یاد تھا۔

مر کے بھی اس کے نظارہ کی تمنا نہ کئے کون سا سبزہ کہ وہ نرگسِ شہلا نہ ہوا

قمؔر

محمد قمر الدین خاں اکبر آبادی افاغنہ یوسف زی ابتدا میں منشی محمد مصلح الدین فتحپوری سے تلمذ اختیار کیا اور پھر حاجی مولوی محمد مہدی بریلوی خوش باش فتح پور سیکری سے کتبیہ فارسیہ کو تحصیل کیا۔ یہ دو شعر لکھے ہیں۔

مجھ سے کو مرید کرلیا دم میں قمؔر
یہ خانہ خراب عشق مرشد نکلا
کسی کے عشق سے پابند صد رنج و تعب ہم ہیں
ہزاروں آفتیں ہیں ایک ہم میں کچھ عجب ہم ہیں

گرؔم

مظفر خاں خوش طبع ظریف مزاج متوطن رام پور ذوقؔ کے شاگرد۔

حالِ عاشق کبھی پوچھے نہ ملائے تو چشم آنکھیں کیا چرنے گئی ہیں تری اے آہو چشم
نہ رہی ہائے تصور کو ترے جا خالی بسکہ لختِ جگر و دل سے ہوئی مملو چشم
چاہ میں اک بتِ ہر جائی کی در بدر ناصیہ فرسائی کی

گویاؔ

فقیر محمد خاں۔ شاگرد ناسخ، سخن اس کا الفاظ فصیح اور معانی غریب اور نکات برجستہ اور اشارات دلچسپ سے مملو ہے۔

نہیں ہے علمِ جاں بازی میں کچھ حاجت معلم کی
تڑپنا آپ ہی استاد ہے تعلیمِ بسمل کا

قیامت کے منکر جو ہیں اے ستمگر
تیرے قدوقامت کو دیکھا نہ ہوگا

وہ ایسا نہیں چپ رہے بات سن کر
کوئی اور ہووے گا گویاؔ نہ ہوگا

ہے جو مضمون فتنہ انگیز اس میں تیری چال کا
اب زمین شعر میں بھی خوف ہے بھونچال کا

کب تلک ان بتوں کے ظلم سہوں
اے خدا دل نہیں ہے پتھر کا

مصرعِ ابرو مکرر لکھ دیا استاد نے
اس سے بہتر دوسرا مصرع نہ جب موزوں ہوا

نہ رہی بعد میرے نامہ و پیغام کی رسم
خاک اڑاتی پھری کلیوں میں صبا میرے بعد

منہ دکھانا تو کہاں باتیں تھیں اس کی مجھ تک
لن ترانی کی بھی آئی نہ صدا میرے بعد

سنگ مدفن کی جگہ رکھ دیا مدفن پہ مرے
کوہِ غم جب کہ کسی سے نہ اٹھا میرے بعد

انتخاب زریں سرراس مسعود، بی۔اے

پھر یہ دل شیشۂ زلف پریشاں ہوگا
پھر مرا جوشِ جنوں سلسلہ جنباں ہوگا

اے جنوں پھر مجھے خوش آنے لگی عریانی
پھر نہ دامن ہی رہے گا، نہ گریباں ہوگا

پھر ہوا شوقِ شہادت مجھے، پھر ہوں گا شہید
پھر گلا میرا تہ خنجر براں ہوگا

پھر لگی لالہ رخوں سے مجھے الفت ہوگی
سینہ پھر داغوں سے مانندِ گلستاں ہوگا

گھر میں دل پھر مرا گھبرانے لگا آپ سے آپ
اے جنوں پھر یہ مکاں خانۂ زنداں ہوگا

پھر ہوا جوشِ، جنوں جاؤں گا پھر صحرا
پھر ہر اک آبلہ میں خارِ مغیلاں ہوگا

پھر طبیعت مری آنے لگے اک کافر پر
پھر نہ دل ہوگا، نہ دیں ہوگا، نہ ایماں ہوگا

محمودؔ

محمود علی خاں، برادرزادہ نواب اعظم الدولہ سرورؔ، جوان خوش مزاج، بلند فکر، تیز طبع، ہر چند اس کی ذہانت اور ذکاوت میں شک نہیں لیکن کم استعدادی اور موزونی طبع کی نخوت سے اس کا ثمرۃ الفواد خام بخت رہا اور اپنی خوش فکری کے خیال سے سراپائے سخن کو خلعت اصلاح سے آرائش دینا اس پر مزید ہوا۔ اس کے دیوان سے یہ چند اشعار انتخاب ہوئے۔

افسوس ہوا حشر میں کیا بے کسی کا
قاتل جو ہمیں سر بہ گریباں نظر آیا

جام مے سے کیا کھلے اسرارِ عرفاں شیخ پر
ہو چراغ اصلا نہ رہبر دیدۂ بے نور کا

دیکھ گلزار میں جاوے نہ بھڑک آگ کہیں
بلبلِ سوختہ جاں کھینچ نہ افغاں گستاخ

چشم سے خوں نہ جاری رہے ہر دم کسطرح
خارِ غم دل میں خلیدہ ہی رہا ایک نہ ایک

مروتؔ

میر باز خان، حالات معلوم نہیں۔ یہ شعر ہے۔

کی بہت تدبیر لیکن کیا کروں
دل کو ہمدم چین آتا ہے نہیں

مست

سرمست خاں افغان، حالات معلوم نہ ہو سکے۔

نہ وہ بانکوں میں گنا جائے، نہ ٹیڑھوں میں یہ کیوں
خانہ جنگی تمہیں رہتی ہے سدا مست کے ساتھ

وجاہت

احمد علی خاں ولد احمد نور خاں مرحوم، قوم افغان، مرد خوش خلق اور نیک تھا، صاحب طبع حلیم و ذہین مستقیم ہے۔ یہ اشعار اس کے افکار ہیں۔

ہے وجاہت یہ زیست نقش برآب
کیا یقیں آئے نقش باطل کا

دل ہوا جائے ہے خوں ابروئے خمدار کو دیکھ
تیر لگتا ہے جگر میں مژۂ یار کو دیکھ

وحشت

غلام علی خاں مرادآبادی ابن فرحت اللہ خاں شاگرد مومن۔ حلم و بردباری اور مروت میں بے عدیل اور ایجاد معانی و ابداع سخن اور جودت فکر میں بے نظیر، خوش فکری کو حد کمال تک پہنچایا۔

آیتیں حرمت صہبا کی سناتا ہوں اسے
ذکر سن سن کے رقیبوں کی مے آشامی کا

دل میں عدو کی بڑھ گئی کیا الفت آپ کے
کچھ ان دنوں میں پہلے سے لطف و کرم نہیں

بے تکلف آئے وہ بہر تماشا وقتِ نزع
کام آساں ہو گیا یاں مردنِ دشوار سے

نالہ میرا روز و شب سن سن کے عادت ہو گئی
اہل عالم اب نہیں مرنے کے بانگ دور سے (مور)

وصلؔ

محمد علی خان خلف حکیم نصر اللہ خان وصالؔ، خوش اخلاق، سلیم طبع، علوم رسمی سے فارغ التحصیل، فن طب سے بھی بہرہ مند، فن شعر میں اپنے والد ماجد سے مشورہ کیا ہے۔

کیا مزہ اس دلِ مجروح کو ہوتا حاصل
اس کی شمشیر کے گر ساتھ نمکداں ہوتا

دشتِ پرخار میں جب ہم رہے بے دامن و جیب
چاک چاک اپنا نہ کیونکر تن عریاں ہوگا

گر لکھوں حال دیدۂ تر کا
مثل دریا ہو حال دفتر کا

حیف جس میں کہ نامہ باندھا تھا
گر پڑا وہ ہی پر کبوتر کا

ظلم اس ستم گر کے سب کہ سہے
بن گیا اپنا دل بھی پتھر کا

ناتوانی سے میں حیران ہوں بیٹھا اس طرح
جیسے دیوار سے جاوے کوئی تصویر لگا

بوسے تو اپنے لب کے ہمیں پانچ چار دے
ساتھ اس کے گالیاں بھی اگرچہ ہزار دے

محفلِ اغیار میں مجھ کو بلایا آپ نے
فتنہ کیا بیٹھے بٹھائے یہ اٹھایا آپ نے

یادگار شعراء

شاہ اودھ کے کتب خانوں کی فہرست

مرتبۂ اشپرنگر

شعرائے ریختہ کے حالات کا ترجمہ

طفیل احمد، بی۔ اے۔ ۱۹۴۳ء

آسی رام پوری

یہ رام پور افغانی نسل شاعر ہیں

آشفتہ

عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں، یہ پٹھان نسل کے ہیں، مائل کے شاگرد۔

آگاہ

نور خاں، یہ پٹھان اور ہوشیار قصہ گو ہیں۔ (تذکرہ علی ابراہیم)

اشک

یہ رام پور افغانی نسل شاعر ہیں (تذکرہ جات سرورؔ روزؔ کا)

اعظم

اعظم خاں، یہ افغانی نسل کے شاعر ہیں۔ دہلی میں رہتے ہیں۔ شاہ محمد نصیر کے شاگرد ہیں۔ (تذکرہ جات سرورؔ روزؔ کا)

افغان

امام علی خاں، ساکن لکھنوٴ (تذکرہ جات سرور روز کا وطبقات سخن) علی ابراہیم کے خیال میں ان کا نام الفت خاں تھا اور نہایت عسرت کی زندگی گزارتے تھے۔

امیر

نواب محمد یار خاں ولد نواب علی محمد خاں، یہ افغانی نسل کے تھے۔ ان کو موسیقی میں اچھی دسترس تھی اور ٹانڈہ میں رہا کرتے تھے، جب ان کا رجحان ریختہ کی شاعری کی طرف ہوا تو انہوں نے سوز اور سودا کو اپنے پاس بلایا لیکن انہوں نے ان کی دعوت قبول نہیں کی، پھر محمد قائم کو بلایا جو اس وقت بسونی میں رہتے تھے۔ ان کو سو روپیہ تنخواہ پر رکھا۔ قائم کے علاوہ اپنے پاس دوسرے شعراء کو جمع کیا۔ مثلاً مصحفی، نعیم، پروانہ، مرادآبادی عشرت اور حکیم کبیر سنبھل، یہ مصوری کے بھی دلدادہ تھے۔ انہوں نے عاقل خاں کو تمام مشہور شعراء کی تصویریں بنانے کا حکم دیا اور ان کا ایک البم بنایا۔ شاہ عالم اور مرہٹوں کے ضابطہ خاں کی شکست نے ان کے خوشگوار حالات کا خاتمہ کر دیا اور ۱۱۸۸ھ کے بعد انتقال کر گئے۔ (تذکرہ مصحفی)

اسد

اسد یار خاں، ان کا خطاب اسد الدولہ تھا، جنگجو کے نام سے مشہور تھے۔

برکت

برکت اللہ خاں، زیب النساء بیگم سے پنشن پاتے تھے۔

بیتاب

عباس علی خاں ساکن رام پور ولد نواب علی خاں، عرصہ سے لکھنؤ میں رہتے ہیں لیکن اب کچھ مدت سے دہلی میں رہنے لگے ہیں (تذکرہ ذکا و گلشنِ بے خار)

بے جاںؔ

زور آور خاں ساکن کوئل (تذکرہ سرور) بیجان عزیز خان۔ یہ روہیلہ تھے، مصحفی سے ان کی آنولہ میں ملاقات ہوئی۔

بیرنگؔ

دلاور خاں پیشہ سوداگری۔ یہ یکرنگؔ کے شاگرد تھے اور پہلے ہمرنگؔ تخلص کرتے تھے۔

تحسینؔ

منشی حسین عطا خاں، اٹاوہ میں رہتے ہیں۔

تسلیمؔ

محمد کبیر خاں، یہ رام پور کے افغان تھے اور خلیفہ غلام محمد عباس دہلوی (بریلوی تذکرہ سرور) کے شاگرد تھے (تذکرہ ذکاؔ و طبقات سخن)

تمنّاؔ

محمد اسحاق خان، دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور کشمیر کے رہنے والے تھے، بنارس چلے گئے اور مرزا جہاندار شاہ کے یہاں ملازم ہو گئے وہیں انتقال کیا۔ (تذکرہ سرور)

ثابتؔ

اصالت خاں، (اجابت خاں گلشن بے خار۔ اجابت علی خاں گلشن بے خزاں) یہ افغان نسل کے تھے اور فدوی کے شاگرد تھے، عرصہ تک پٹنہ میں رہے اور ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔ (تذکرہ عشقی)

ثابتؔ

شجاعت اللہ خاں ساکن پانی پت (تذکرہ علی ابراہیم) شاگرد صغیر علی حسرتؔ، لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ (تذکرہ قاسم)

ثناءؔ

ثناءالدین خاں ساکن فرخ آباد، یہ کوئل میں مجسٹریٹ کی عدالت میں سرشتہ دار ہیں اور وہیں صاحب گلشنِ بے خزاں نے اپنا تذکرہ لکھنے سے پانچ سال پہلے ملاقات کی۔

جانؔ

فرخ آباد کی شاعرہ کا نام اور تخلص ہے۔ (گلشنِ بے خزاں)

حسینؔ

نواب غلام حسین خاں، یہ افغانی نسل کے ہیں، شاہجہاں پور میں رہتے ہیں (تذکرہ ذکاؔ)

حکیمؔ

حکیم محمد اشرف خاں، ساکن دہلی۔ (گلشنِ بے خار)

حیرانؔ

حافظ بقاالله خاں ولد خوشنویس حافظ ابراہیم خاں، دہلی میں رہتے ہیں۔ (تذکرہ ذکاؔ)

خانؔ

محمدی خاں پٹھان، شاگرد رنگینؔ، یہ دکن میں رہتے ہیں۔ (تذکرہ ذکاؔ)

خودؔ

فخر الدین خاں ولد نواب شرف الدین محمد خاں، یہ صاحب گلشنِ بے خار کے رشتہ دار ہیں۔

خستہؔ

محمد عبدالله خاں معروف بہ میاں جیوں، ساکن دہلی ولد سعد الله خاں جو آقایار خاں کہلاتے ہیں، کشمیری تھے، دہلی میں پیدا ہوئے، فراقؔ کے شاگرد تھے۔ (تذکرہ جات ذکاؔ و سرورؔ)

دلسوزؔ

خیراتی خاں، یہ افغان نسل کے اور فراقؔ کے شاگرد تھے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے

جے پور میں انتقال کیا۔ (گلشنِ بے خار) دلسوز پہلے بڑے شراب خوار تھے لیکن اب اسے چھوڑ دیا ہے۔ (طبقات سخن)

دلگیر

میر حمایت اللہ خاں ولد عالم خاں، رمل کے استاد اور نجوم کے ماہر (گلشنِ بے خار)

ذاکر

فضل علی۔ یہ فاضل شخص ہیں۔ ان کے بزرگ افغانستان کے تھے۔ اب پٹنہ میں رہتے ہیں (تذکرہ جات ذکا و سرور)

ذکا

ذکاء اللہ خاں ساکن لکھنؤ۔ نواب جحت خاں ابن حافظ رحمت خاں کی اولاد میں سے یا ان کے بیٹے تھے۔ (گلشنِ بے خار)

ذکی

جعفر علی خاں۔ پہلے حکومت کی بڑی جگہ پر مامور تھے، ان کا پنج ہزاری کا عہدہ تھا لیکن اب پریشانی میں پڑ گئے ہیں (تذکرہ گردیزی) ایک مثنوی چھوڑ گئے ہیں۔ (تذکرہ علی ابراہیم) یہ مثنوی بحکم محمد شاہ تصنیف کی تھی۔ اس کی شہرت بہت زیادہ ہوئی۔ (تذکرہ شوق)

راسخ

ظفریاب خاں۔ساکن بریلی (گلشن بے خار)

راغب

محمد جعفر ساکن دہلی۔نواب لطف اللہ خاں صادق ساکن پانی پت کے رشتہ دار ہیں زیادہ تر فارسی میں شعر کہتے ہیں (تذکرہ علی ابراہیم) پٹنہ میں انتقال کیا۔ایک فارسی اور دو ریختہ کا دیوان چھوڑ گئے (تذکرہ عشقی)

رحمت

قاضی القضاۃ رحمت اللہ خاں ساکن دہلی۔فارسی کا ایک دیوان چھوڑا ہے۔(تذکرہ ذکا)

رستم

رستم علی خاں، احتشام الدولہ عام طور سے نواب بہادر کہلاتے تھے، دہلی کے رہنے والے نواب اشرف خاں کے بیٹے تھے۔۱۱۹۴ھ میں شاعری کے نمونے علی ابراہیم کو دیئے، سرور کے دوست تھے۔

رشکی

محمد حسن خاں ساکن پٹنہ ولد خادم حسین خاں خادمؔ، یہ علم دوست اور نوجوان شخص ہیں۔

رضاؔ

حمیدالدین خاں ساکن اعظم پور ولد حکیم مولوی کلو ساکن چاند پور (تذکرہ ذکا و گلشن بے خار)

رضاؔ

غلام محمد خاں ساکن دہلی برادر عنایت حسین خاں، مشیر و شاگرد گلزار علی خاں اسیرؔ (گلشن بے خار)

رفیعؔ

رفیع الدین خاں۔ یہ مراد آباد کے پٹھان ہیں اور مکہ ہو آئے (تذکرہ ذکا)

رندؔ

مہرباں خاں۔ یہ موسیقی، کبت اور دوہا وغیرہ کہنے میں ماہر کہے جاتے ہیں، فرخ آباد میں رہتے ہیں۔ (تذکرہ علی ابراہیم)

زارؔ

برہان الدین خاں۔ ساکن دہلی، یہ خوشنویس ہیں اور بادشاہ کی ملازمت میں ہیں، عربی فارسی جانتے ہیں اور اردو میں شعر کہتے ہیں۔ (تذکرہ مصحفی)

سِرّ

محمد خلیل خاں۔ساکن دکن (تذکرہ قائم)

سعد

قاضی سعید الدین خاں ساکن کاکوری ولد قاضی نجم الدین خاں کلکتہ ۱۸۲۲ء میں سعید دہلی آئے تھے، نابینا تھے۔(گلشن بے خار)

سلام

نجم الدین علی خاں ساکن دہلی (ساکن آگرہ تذکرہ جات ذکا وقاسم) ولد شرف الدین علی خاں پیامؔ، اپنے والد کے شاگرد ہیں۔(تذکرہ گردیزی) صفدر جنگ کی فوج کے ساتھ اودھ چلے گئے۔(تذکرہ قائم)

سلطان

نواب نصر اللہ خاں بہادر، یہ افغان نسل کے ہیں۔رام پور کے جاگیردار ہیں۔(تذکرہ ذکا) انتقال ہو چکا ہے۔(گلشن بے خار)

سلیمان

سلیمان خاں ساکن دہلی۔شاگرد اشرف علی خاں فغاںؔ (تذکرہ شوق) پٹنہ میں رہتے

تھے لیکن معلوم نہیں اب کہاں ہیں۔ (تذکرہ عشقی)

شفاؔ

حکیم محمد حسن خاں ساکن دہلی، جوان آدمی ہیں۔ (ذکا)

شوقؔ

حسن علی (حسن خاں پٹھان، گلشن بے خار) حسن علی خاں سرور دہلوی شاگرد آرزو (گردیزی وشورش) سپاہی تھے، نواب عماد الملک کی ملازمت میں تھے۔ (علی ابراہیم وعشقی) ایک دیوان یادگار ہے۔

شہرتؔ

افتخار الدین خاں۔ برادر واثق علی خاں ۱۸۱۴ء میں کلکتہ میں رہا کرتے تھے۔ بنی نرائن نے ان کا ذکر کیا ہے۔

شہرتؔ

امیر بخش خاں، دہلی کے کشمیری اور فراقؔ کے شاگرد دہلی میں رہتے ہیں۔ (ذکا) دکن چلے گئے تھے (قاسم) جوانی میں انتقال کیا۔ (گلشن بے خار)

شیفتہ

احمد خاں دہلوی، شاگرد اسیر، صاحب گلشن بے خزاں کے دوست۔

طرہ

طرہ باز خاں بنارسی۔(گلشن بے خار)

عاشق

محمد خاں ساکن صوبہ زور (سرور و گلشن بے خار)

عاصی

عاصی رامپوری۔(ذکا و گلشن بے خار)

عبرت

عبرت رامپوری۔(ذکا و سرور)

علی

علی محمد خاں۔مراد آباد کے افغان تھے۔(ذکا)

غافلؔ

منور خاں لکھنوی افغان تھے۔ مصحفی کے شاگرد۔ (سرور)

غالبؔ

غالب خاں "غالب علی خاں" (بے خزاں) افغاں سردار دوندے خاں کے پوتے تھے۔ (ذکا)

فراقؔ

ثناء اللہ خاں دہلوی کے بھتیجے۔

کریمؔ

کریم اللہ خاں ہیں۔ حال میں شعر کہنا شروع کیا ہے۔ (ذکا)

کمتریںؔ

کمتریںؔ (پیر خاں) افغان ہیں، قبیلہ "ترین" میں سے اسی مناسبت سے کم ترین تخلص کیا۔ (قائم) ہزل گو ہیں۔ زیادہ تر دہلی میں رہتے ہیں۔ ۱۱۶۸ھ میں انتقال کیا۔ (قائم گردیزی علی ابراہیم) شام کے وقت چوک میں بیٹھ کر اپنی نظمیں فروخت کیا کرتے تھے جن کو کاغذ کے پرزوں پر لکھ لیا کرتے تھے (ذکاؔ) زیادہ تر ہزل کہتے تھے۔ (سرورؔ)

مجید

مجید الدین خاں ابن مفتی معین الدین خاں کشمیری۔

محبت

(محبت اللہ خاں قاسم) ابن حافظ رحمت خاں۔

محشر

اکرام اللہ خاں بدایونی۔ ان کے کچھ شاگرد ہیں۔ (ذکا وطبقات سخن) بدایوں کے مشاہیر میں سے ہیں۔ (گلشن بے خار)

محمد شاہ خاں

محمد شاہ خاں ہاپوڑی۔ کبھی کبھی شعر کہتے ہیں۔ (ذکا)

محو

حسین علی خاں ساکن آگرہ۔ برطانی حکومت میں ملازم ہیں۔ (سرور، ذکا، گلشن بے خار)

محو

رحم علی خاں دہلوی۔ ابن لطف النبی خاں پٹنہ میں رہتے ہیں۔ (شورش)

مخلصؔ

بدیع الزماں خاں۔ نواب شجاع الدولہ کی ملازمت میں تھے۔ (علی ابراہیم) اور شاہ واقف کے شاگرد تھے۔ (عشقی)

مشتاقؔ

عبداللہ خاں۔ بادشاہ نے مشتاق علی خاں کا خطاب دیا۔ یہ ابوالحسن خاں حسنؔ کے بیٹے ہیں۔ ان کے دادا یوسف الدین خاں سیفیؔ یوسف زئی افغان تھے اور بہادر شاہ کے معلم تھے۔ مشتاق کو پانچ سو کا منصب ہے اور ایک جاگیر۔ (مصحفی)

منصفؔ

منصف علی خاں پٹنوی افغانی النسل شاگرد نظام خاں موجز، ذی علم تھے۔ فارسی کا اچھا علم تھا، دلی میں انتقال کیا۔ (گلشن بے خار)

منعمؔ

قاضی محمد منعم خاں ساکن تھانہ ضلع سہارنپور، ایک دیوان فارسی اور ایک ریختہ کا چھوڑا۔ (ذکا)

مہر

نواب منصور خاں ابن نواب محبت خاں۔ (بے خزاں)

والہ

رحمت خاں۔ دلی کے کشمیری، لکھنؤ اور دلی میں انگریزی سرکار کے نوکر تھے۔ فارسی میں ثاقب تخلص کرتے تھے۔ (سرور، قاسم، ذکا، گلشن بے خار)

والہ

محمد خاں۔ شاہزادہ جہاں دار کے ہاں نوکر تھے۔

وحید

حکیم محمد وحید الدین خاں۔ بدایونی۔ ذی علم شخص ہیں، راجہ بھرت پور کے یہاں حکیم ہیں۔ (گلشن بے خار)

وسعت

مستقیم خاں رام پوری۔ شاگرد شوق (عشقی)

وصالؔ

نصر اللہ خان دہلوی ابن ثنا اللہ خان فراقؔ۔ اچھے طبیب ہیں (ذکا، گلشن بے خار)

ہدایتؔ

ہدایت اللہ خاں (''ہدایت خان'' مصحفی) دہلوی افغانی نسل کے تھے، میر دردؔ کے شاگرد تھے۔ (قائم، گردیزی، شورش) ایک دیوان اور ایک مثنوی کہی ہے جس میں بنارس کا بیان ہے۔ (علی ابراہیم) ان کی عمر سو برس سے زیادہ ہے۔ (مصحفی) ثناء اللہ فراق کے چچا تھے۔ تخمیناً نو ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا۔ نیز کچھ مثنویاں اور ایک رسالہ مسمی بہ چراغ ہدایت (قاسم)

عہدِ عثمانی کے اردو شعراء کا تذکرہ

سخنورانِ دکن

مرتبہ: تسکین عابدی

اثرؔ

احمد علی خاں۔ حضرت عیشؔ سے تلمذ ہے۔ حیدرآباد کے رہنے والے ہیں۔

بس گئی جب سے ستم گر تری صورت دل میں
چٹکیاں لیتی ہے دن رات محبت دل میں

مجھ کو مرنا ہے تو مرجاؤں ترے کوچہ میں
کچھ اگر ہے بھی تو بس ہے یہی حسرت دل میں

کب تری چال زمانہ کی دورنگی سے ہے کم
تیری باتوں میں محبت ہے، عداوت دل میں

اعجازؔ

محمد یعقوب خاں۔ بیدر وطن، ابتدا کسی مدرسہ میں مدرس تھے اب کامیاب وکیل ہیں۔ وسیع المعلومات اور قابل بزرگ ہیں۔ گلدستۂ نعت اور اقوال ملی کے نام سے دو کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔

اِدھر دل ہو گیا بیتاب لب پر، جاں اُدھر آئی
تری فرقت میں یہ نوبت مری اے سیمبر آئی

حرم سے دیر کو آیا تو کیا بے جا ہوا زاہد
طبیعت ہی طبیعت ہے جدھر آئی، ادھر آئی

وصالِ یار کی آخر ہوئی شب تو کہا دل نے
مصیبت کی گھڑی آئی، قیامت کی سحر آئی

دکھا بہار چمن کا ذرا سماں صیاد
دلِ حزیں ہو مرا کچھ تو شادماں صیاد

سناؤں کیا کہ نہیں طاقتِ بیاں صیاد
بہت ہے درد بھری میری داستاں صیاد

جو کیفیت تھی بہارِ چمن کی پیش نظر
وہ بات کنجِ قفس میں ہے اب کہاں صیاد

اقبالؔ

ملک عبدالوحید خاں۔ نظام کالج کے قدیم طالب علم آج کل فوج میں باقاعدہ لفٹنٹ ہیں۔ جوان عمر شاعر ہیں۔ نظم خوب کہتے ہیں۔

حسن سے ہوتا ہے دل میں ایک ہی محشر بپا
کوئی دُنیا میں تو ملتی ہی نہیں اس کی دوا

حسن ہی ہے جو دلِ پر درد کی تسکین ہے
عشق کیا ہے؟ حسن کی چھوٹی سی اک تلقین ہے

حسن کیا ہے؟ یہ یدِ قدرت کا اک اعجاز ہے
اور حسینوں کی ادا، قدرت کی اک آواز ہے

اس ادا میں کچھ کسی کو اور ہی منظور ہے
یہ وہ جلوہ ہے جو کوہ طور میں مستور ہے

ایجاد

غلام محمد خاں۔ حضور بندگاں عالی کی پیشی مبارک کے عرائض خواں ہیں۔

اُمید کیا ہو مہر کی اُس سے جفا کے بعد — آئے نہ رحم کچھ بھی جسے التجا کے بعد
قیدِ حیات گر نہ رہے گی قضا کے بعد — پائیں گے بندِ غم سے خلاصی فنا کے بعد
آئیں گے تعزیت کو ہماری وہ بعدِ مرگ — ماریں گے آشنائی کا دم آشنا کے بعد
آہ رسا مری سرِ گردوں پہنچ گئی — برسے گی کیوں نہ بارشِ رحمت خدا کے بعد

حکیم

حیدر علی خاں ابن قاسم علی خاں، منصب دار خویشگی پٹھان تھے۔ استاد ظہیر سے تلمذ تھا۔ اچھے طبیب تھے، مطب خوب چلتا تھا۔ اچھے شعر کہتے تھے۔ ۱۳۲۵ھ میں انتقال ہوا۔

حسین، شوخ، طرحدار، مہ لقا کوئی — نہیں ہے آپ سا دنیا میں دوسرا کوئی
بلا میں، قہر میں، آفت میں مبتلا کوئی — نہ ہوگا مجھ سا زمانے میں یا خدا کوئی
خطا معاف مجھی کو تو لوگ کہتے ہیں — ستم شعار کوئی اور بے وفا کوئی
نگاہ لڑتے ہی دونوں کا دل ہوا مائل — قصور اس میں نہ میرا، نہ آپ کا کوئی

رباعی

سب اہلِ جہاں سے مری دوری ہو جائے — دربار میں احمد کے حضوری ہو جائے
دم روضۂ اقدس پہ نکل جائے حکیم — یارب یہ تمنّا مری پوری ہو جائے

رہبرؔ

غلام دستگیر خاں۔ مندوزئی گھرانے کے پٹھان ہیں۔ نواب الف خاں کرنولی کے خاندان سے اور ابراہیم علی خاں عیش کرنولی کے پوتے ہیں۔ استاد جلیل سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔ شعر اچھے کہتے ہیں۔

علاجِ دردِ دل سرکار طیبہ ہی سے ہو تو ہو
مسیحا سے تو یہ بیمار اچھا ہو نہیں سکتا

تجلیٰ رخِ روشن کو پوچھے کوئی موسیٰ سے
قمر نقشِ کفِ پا کا بھی نقشا ہو نہیں سکتا

بلا لیجئے طیبہ میں شاہ مدینہ
ہے مرنے سے بدتر یہ فرقت کا جینا

در دولت پہ زمانے سے صدا دیتا ہوں
کچھ مرے دردِ جگر کی بھی دوا ہو جائے

سرمدؔ

عظمت اللہ خاں سکندر آباد کے رہنے والے تھے۔ ابتداً حضرت واصفی کو کلام دکھاتے تھے۔ بعد میں استاد جلیلؔ سے مشورہ کرنے لگے تھے۔ حیدر آباد کے موجودہ شعراء میں اچھا کہنے والے تھے۔ عاشق مزاج تھے۔ دل چوٹ کھایا ہوا تھا، پڑھنے کا انداز بھی دلکش تھا۔ حیدر آباد کے بچے بچے کی زبان پر ان کے شعر تھے، فغانِ سرمد کے نام سے دیوان چھپا تھا۔ دوسرا دیوان نالہ سرمد چھپ رہا تھا کہ نمونیہ میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ طبیعت میں متانت اور سنجیدگی تھی۔

دعا ہے رہ جائے حشر میں بھی بھرم گنہ گارِ آرزو کا
کہ سر جھکائے خدا کے آگے خیال ہے تیری جستجو کا

خدا ہی جانے دیارِ دل میں بھٹکتی ہوگی کہاں کہاں یہ
بہت ہی دشوار ہے لگانا سراغ ناکام آرزو کا
یہی تو شمعِ حرم ہے سرمدؔ، ہے اس سے روشن غریب خانہ
جو دل میں ناسور ہے ہمارے، چراغ ہے چشمِ آرزو کا

دل کا مرے غبار پڑا اس ہوا کے بعد
نظارہ باز آنکھ کھلی ہے قضا کے بعد
مانگا تھا ان کو، ان کی بلائیں گلے پڑیں
الٹا اثر دعا کا یہ دیکھا دعا کے بعد
ان بُلبلوں کو خوب ملا پھل بہار کا
اب خاک اُڑ رہی ہے چمن میں صبا کے بعد
غنا رہِ فنا میں وفا کا ثبوت ہے
سرمد صلہ ملے گا وفا کا فنا کے بعد
گرہ کا جشن شہِ تاجدار کو دیکھو
چمن کے ساتھ چمن کی بہار کو دیکھو
دکن ہے میکدہ، ساقی حضور، ہم میکش
نزول رحمتِ پروردگار کو دیکھو
خوشا نصیب کہ پھر موسمِ بہار آیا
وہ شام عیش کی، وہ روزِ وصلِ یار آیا
بہار آئی ہے ساقی کی نذر کو زاہد
کہ ٹکڑے توبہ کے لے لے کے بادہ خوار آیا

شؔرر

دولت خاں۔ حیدرآباد کے رہنے والے۔

رقاصۂ فلک کا مرا حال کیوں ہے آج
بکھرے ہوئے ہیں کس لئے گیسوئے عنبری
چپ چاپ ہیں پروں کو پھلائے ہوئے پرند
طاؤس کی کہاں ہے وہ رفتار دلبری
نرگس کی آنکھ کس لئے خونبار آج ہے
کیوں ہے خمیدہ باغ میں شاخِ صنوبری
ساقی وہ اب کہاں ہے، کہاں ہیں وہ بادہ خوار
وہ لطف دورِ ساغرِ صہبائے احمری

ضیغم

محمد عبداللہ خاں۔نواب محمد صلاح خاں کے فرزند ہیں۔ان کے اجداد کابلی تھے۔عہد شاہی میں لکھنؤ آ کر خدمات جلیلہ سے سرفراز ہوئے۔لکھنؤ کا قندھاری (بازار) ان ہی کا بسایا ہوا تھا جو غدر میں برباد ہو گیا۔۱۲۹۱ھ میں صلاح خاں صاحب کے انتقال کے بعد ضیغم نے لکھنؤ چھوڑا اور حیدر آباد آ رہے اور اپنے خالو آنریبل نواب سر شرف اللہ خاں کے سی۔ایس۔آئی۔کی صاحبزادی سے شادی کر لی۔سرکار عالی سے منصب جاری ہوا اور انھوں نے حیدر آباد کو وطن بنایا۔۱۳۰۱ھ سے عباس علی خاں ششدرؔ کی صحبتوں میں شعر گوئی شروع کی۔۱۳۰۹ھ تک نیاز احمد ہوشؔ بریلوی سے مشورہ کرتے رہے۔ان کے انتقال کے بعد محمد باقر لکھنوی سے تلمذ اختیار کیا۔دیوان مکمل اور مردف ہے۔ایک تذکرہ "یادگارِ ضیغم" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔اسی (۸۰) سال کے قریب عمر ہے۔شعر خوب کہتے ہیں، مدت تک مشاعرہ بھی کرتے رہے، بڑی خوبیوں کے بزرگ ہیں۔

گلوں پر اشکِ شبنم دیکھ کر بلبل یہ نالے ہیں
مرا دل دیکھ تو وہ بھی کوئی چھالوں میں چھالے ہیں

مرے پر بھی رہی یادِ مژہ کی رخنہ اندازی
مرے سنگ لحد میں سیکڑوں سوراخ ڈالے ہیں

گدا ہر چند ہوں کہتی ہے یہ چیں جبیں اپنی
فقیری میں بھی شانِ تمکنت جاتی نہیں اپنی

تصور رنگِ وحدت کا سما جاتا ہے جب دل میں
تو صورت آئینہ میں دیکھ لیتے ہیں ہمیں اپنی

تن بدن میں اپنے روشن داغ سوزاں ہو گئے
ہم سراپا صورتِ سرو چراغاں ہو گئے

عاؔلی

محمد اسماعیل خاں۔ خورجہ ضلع بلند شہر کے رہنے والے۔ مدت سے حیدرآباد میں ہیں۔

کیا کہوں میں حالِ دل کہنے کے یہ قابل نہیں
جب سے دیکھا ہے تمہیں، قابو میں میرے دل نہیں

کیا سناؤں دردِ دل کی میں کہانی آپ کو
آپ کے سننے سنانے کے تو یہ قابل نہیں

دوستوں آنے دو آئی ہے اگر فصلِ بہار
اب کہاں وہ ولولے، وہ ہم نہیں، وہ دل نہیں

دیکھو گر چشمِ بصیرت سے تو کھل جائے ابھی
میرے ان کے درمیاں پردہ کوئی حائل نہیں

فاؔنی

شوکت علی خاں

فرحؔت

محمد امان خاں۔ یوپی کے رہنے والے، مدت سے حیدرآباد میں ہیں، محکمۂ آبکاری کے انسپکٹر ہیں، نظم اچھی کہتے ہیں۔

"فیشن پرست بہنوں سے خطاب"

اِک حسن کی دیوی ہو، ہو حسن کی شہرت بھی
بی۔اے کی سند بھی ہو، ہو حسنِ لیاقت بھی

رہنے کے لئے اچھا بنگلہ بھی ہو جنگل میں
ہو سیر کو موٹر بھی اور خرچ کو دولت بھی

ماں باپ کی پروا ہو، نہ پاس ہو شوہر کا
خود آنکھ چراتے ہوں سب اہلِ قرابت بھی

پردے کا تصور تک اِک بار نہ ہو دل پر
اس نام کے آتے ہی تغیر ہو حالت بھی

زیبا ہے فقط ایسی خوش باشوں کو اے فرحت
فیشن کا نکھرنا بھی، فیشن کی قیادت بھی

(انتخاب زریں۔ مسعود راس بی۔اے)

شہیدیؔ

کرامت علی خاں ولد عبدالرسول خاں شاگرد مصحفیؔ و نصیر دہلوی، فقیرانہ لباس پہنتے تھے۔ عرصۂ دراز تک بریلی میں رہے تھے، ان کا نعتیہ اور عاشقانہ کلام مستانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ دیوان چھپ چکا ہے۔

۱۲۵۳ھ میں جس وقت مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور روضۂ مبارک کو دیکھا تو فرطِ اشتیاق میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور یہ شعر مقبول ہو گیا۔

تمنا ہے کہ وہ اُڑ کر ترے روضے پہ جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

....

سنگ گر سینے میں اس کے عوضِ دل ہوتا
کارِ عشاق نہ اس مرتبہ مشکل ہوتا

گھر سے جب سیر کو صحرا سے نکلتی لیلیٰ نجد کے رُخ پہ اُٹھا پردۂ محمل ہوتا
بیٹھ جاتا لبِ فرش آ کے اگر ایک گدا اس میں نقصان ترا صاحبِ محفل ہوتا
اس کی بدھی کے لئے پھول میں چنتا پھرتا ہاتھ اس کا مری گردن میں حمائل ہوتا
عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پر تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

....

غضب ہے جس بتِ کافر پہ اپنا دَم نکلتا ہے نیا تابوت اس کے کوچے سے ہر دم نکلتا ہے
نہ رکھ آنکھوں پہ میری آستینِ لطف اے ہمدم کہ اشک سرخ کے ہمراہ دل کا غم نکلتا ہے
دکھا کر اپنی آرائش پری مجھ کو نہ دھوکا دے کسی کے سادہ پن میں اور ہی عالم نکلتا ہے
وہ کب خاطر میں لاتا ہے مرے آزردہ ہونے کو سمجھ رکھا ہے ظالم نے پھنسا دل کم نکلتا ہے
سمجھ کر اجنبی میں جس سے دل کا راز کہتا ہوں تجل ہوتا ہے کیا کیا جب ترا محرم نکلتا ہے
بنا دیتا ہے کوچہ فقر کا ٹیڑھے کو بھی سیدھا کھنچا جب جنتری میں تار کا سب خم نکلتا ہے
شہیدؔی سے نہیں واقف مگر اتنا تو واقف ہے
کہ راتوں کو کوئی کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

عزیزؔ

حافظ رحمت خاں کے پوتے۔ ایک کتاب مجالس العلوم کے نام سے چھپی ہے جس میں تمام علوم وفنون کا بیان ہے۔ ۱۸۹۳ء میں اردو فارسی دیوان چھپا تھا۔ ۵۸ برس کی عمر پائی۔ ۱۸۹۳ء میں وفات پائی۔

یا خدا دل میں غمِ یار کی مہمانی ہے شرم رکھ لے کہ بہت بے سروسامانی ہے

عشق کا بھید چھپانے کو بنا ہوں مجنوں
پردۂ رازِ محبت تری عریانی ہے

رشکِ گلنار کی ہے عشق کے بازار میں قید
قیمتی ہے وہی یاقوت جو رمانی ہے

راستے اور بھی ہیں ملکِ عدم کے لیکن
تیغ کے گھاٹ اتر جانے میں آسانی ہے

نقدِ جاں ہو دلِ مجروح میں کیونکر محفوظ
زخم کے چور سے دشوار نگہبانی ہے

عشق سینے میں بنا سوز تو آنکھوں میں سرشک
طرفہ شے ہے کہ کہیں آگ، کہیں پانی ہے

صدمہ پہنچا تپشِ دل سے تنِ نازک کو
وصل کی شب مجھے یہ ان سے پشیمانی ہے

خرمنِ غنچۂ گل سینۂ بلبل ہے عزیز
کثرتِ زخم ہے تو چھالوں کی فراوانی ہے

احمدی

نواب غلام احمد خاں صاحب احمدی یکم جنوری ۱۸۳۹ء کو بمقام کنجپورہ ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔ خاندان کنجپورہ جن کے موصوف ایک ممتاز رکن تھے پنجاب کے تاریخی خاندانوں میں ہے۔ موصوف کے مورث اعلیٰ غروب نجابت خاں صاحب تھے جو ۱۷۳۰ء کے قریب افغانستان سے آئے تھے اور انہوں نے ضلع کرنال اور انبالہ میں ایک علاقہ پر قابض ہو کر کنج پورہ کو آباد کیا تھا۔

نواب غلام احمد خاں صاحب کو شروع ہی سے علمی ذوق تھا اور بچپن ہی سے شعر و شاعری سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ دس برس کی عمر میں انہوں نے ایک قصہ بنام ''قصہ کرشن'' نظم میں لکھا تھا۔ عربی و فارسی کی تکمیل کے بعد مدت تک سیر و سیاحت کرتے رہے۔ اس کے بعد ریاست ٹونک میں معزز عہدوں پر رہے۔ ۱۸۷۴ء میں ریاست گوالیار میں ملازم ہوئے اور

مہاراجہ جیاجی راؤ نے ضلع عیسیٰ گڑھ کا انتظام سپرد کیا جس کی یاد آج تک وہاں کے باشندوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ مہاراجہ کی وفات کے بعد اول صیغہ جوڈیشنل اور بعد کو صیغہ تعلیم بھی ان کے ذمہ ہوا۔ ان کی یہ خدمات آج تک ریاست میں مشہور ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر خیر کے کاموں میں لگے رہے۔ ۱۶/اپریل ۱۹۰۰ء میں انتقال ہوا۔

علمی مشاغل برابر جاری رہے۔ خدوخال کی شاعری جوانی ہی میں ترک کر دی تھی۔ توحید، اخلاق اور سوشل مضامین پر نظمیں اور نثر میں تصانیف ہیں جن میں مثنوی ہفت راز، اثباتِ حق اور صبحِ نور کو خاص شہرت حاصل ہے۔

نشاں کیا کیا دکھائے تو نے یارب بے نشاں ہو کر
عیاں کیا کچھ کیا ہے تو نے اے خالق نہاں ہو کر

تمنا ہے ترے دریوزہ گر کی تجھ کو پہچانے
ترے در تک پہنچ جائے غبارِ جسم و جاں ہو کر

گلستاں میں گلوں کے کان ہیں آواز پر تیری
ترا ذکرِ خفی کرتا ہے ہر پتہ زباں ہو کر

ترا جوشِ کرم رفعت اگر دے اہلِ پستی کو
مہِ رخ پر زمیں سایہ فگن ہو آسماں ہو کر

تمنا ہے سراپا محوِ ذکرِ ذاتِ باری ہوں
مرا ہر موئے تن سرگرم مدحت ہو زبان ہو کر

تماشوں میں تری قدرت کی آنکھیں محو حیرت ہیں
نرالا رنگ ہے پیشِ نظر گزرا جناں ہو کر

صحبت طفلی میں صرف بازی چوگان و گو پایا
وہی محوِ خود آرائی نظر آئے جواں ہو کر

تنِ عریاں کو ملبوسِ عنایت کی تمنا ہے
لباس جسم پھٹ جائے گا اک دن دھجیاں ہو کر

کہاں کا ضبط کیسا ننگ جوشِ یاد باری میں
دل بیتاب پہلو سے نکل بھاگا فغاں ہو کر

زباں کو میری گویا کر الٰہی اپنی مدحت میں
کروں مردہ دلوں کو زندہ دل معجز بیاں ہو کر

ترے آثارِ قدرت پر کروں دلچسپ تقریریں
جھکاؤں گردنیں پیران پیکر کی جواں ہو کر

کمر کستا ہوں تیرے نام پر تو مجھ کو ہمت دے
سہارے پر ترے اٹھتا ہوں تیرا مدح خواں ہو کر

جہاں بھولوں بتا، جس جا بہک جاؤں ہدایت کر جو ہو لغزش تو مجھ کو تھام میرا مہرباں ہو کر
بھروسے پر تری امداد کے بیڑا اٹھایا ہے فلک کے بوجھ اٹھانے پر تلا ہوں ناتواں ہو کر

ترے در پر جبینِ احمدؔی سرگرم سجدہ ہے
تمنا ہے یہیں رہ جائے خاکِ آستاں ہو کر

احساںؔ

منشی احسان علی خانصاحب خلف منشی قاسم علی خاں۔ متوطن شاہجہاں پور ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں ولادت ہوئی۔ جلالؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ شاہجہاںپور میں مختاری کا پیشہ کرتے تھے۔ ایک اردو ماہوار رسالہ ارمغان کے نام سے جاری کیا تھا۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ دیوان اور رسالہ شبیہ یار یادگار چھوڑے۔

اس کو نہ سوچئے کہ ستم یا کرم ہوا خنجر اٹھایئے سرِ تسلیم خم ہوا
توڑا ہمارے دل کو بتوں نے ستم ہوا وہ بھی انہی کا قول ہم ان ہی کی قسم ہوا
اپنی گلی میں دیکھ کے ہم ہو رہے ہیں خوش نقشِ امیدیار کا نقشِ قدم ہوا
کیسا مری وفا نے پشیمان کر دیا آنکھیں بھی ان کی جھک گئیں، غصہ بھی کم ہوا
دونوں طرف ہے جب وہی دل ایک، جان ایک مجھ پر ستم ہوا تو تمہی پر ستم ہوا
محرومِ عیش میری طرح دوسرا کہاں دل میں سرورِ وصل بھی آیا تو غم ہوا

احساںؔ ضبط کرنے سے اخفائے رازِ عشق
دل سے بہت ہوا مگر آنکھوں سے کم ہوا

تذکرہ فرخ بخش

شوکت

یار محمد خاں، بن تمیز سے ہی علم وفنون کی طرف طبیعت راغب تھی۔ اربابِ کمال کی صحبت میں فنونِ سیف وقلم حاصل کیے۔

مولوی سید عبداللہ جامع فضائل صوری ومعنوی، اخوند منشی احمد علی سید علی اکبر خاں، مولانا محمد عباس شروانی خسرو ملک سخن ماہر زبان دری وپہلوی مرزا غالب، جناب والد ماجد رفیع القدر عظیم الشان امیر کبیر فوجدار محمد خاں صاحب جنت مکاں وغیرہا چند اہلِ کمال کی بدولت موصوف نے جملہ علوم فنون حاصل کیے۔

مست ہر شخص اپنے رنگ میں ہے　　شیخ تسبیح رند بنگ میں ہے
خال ہے اُس کے روئے تاباں پر　　حبشی جلوہ گر فرنگ میں ہے
دل سے کرتے ہو جلوہ آنکھوں میں　　راہ در پردہ کیا سرنگ میں ہے
ہست اور نیست میں ہے سب کو کلام　　عقل حیراں وہانِ تنگ میں ہے
دیکھیے کس کا خون ہوتا ہے　　آج تلوار اس کی جنگ میں ہے

گورے کالوں پہ کون مرتا ہے　　زندگی حسنِ سبزہ رنگ میں ہے
وہ بھی کچھ کم نہیں ہے رستم سے　　نشۂ زر کی جو ترنگ میں ہے
تیر مژگاں کا جو اثر دیکھا　　توڑ ایسا کہاں خدنگ میں ہے
نہیں جاتی کدورتِ خاطر　　حیف آئینہ اپنا زنگ میں ہے
عشق میں کس کو رنجِ رسوائی　　کب کوئی فکرِ نام و ننگ میں ہے

خوب کہتے ہو شعر اے شوکتؔ
طرزِ تازہ تمہارے ڈھنگ میں ہے

کیا جوش پہ یہ دیدۂ پرآب ہے واللہ　　سیلاب ہے، سیلاب ہے، سیلاب ہے واللہ
فرہاد کا خوں دامنِ کہسار میں کیا خوب　　سنجاب ہے، سنجاب ہے، سنجاب ہے واللہ
ہر لختِ جگر اشک کے دریا میں ہمارے　　سرخاب ہے، سرخاب ہے، سرخاب ہے واللہ
کیونکر نہ ادب ہو مجھے ابروئے صنم کا　　محراب ہے، محراب ہے، محراب ہے واللہ
وہ رشکِ کتاں دل تجھے کہتا ہے لبِ بام　　مہتاب ہے، مہتاب ہے، مہتاب ہے واللہ
مت کاکلِ پُرتاب کو دے پیچ بہت دل　　بیتاب ہے، بیتاب ہے، بیتاب ہے واللہ
کہتے ہیں درِ اشک کو شوکتؔ ترے اب لوگ　　خوش آب ہے، خوش آب ہے، خوش آب ہے واللہ

''خم کدۂ سخن''

غیر مطبوعہ

از محمد علی خاں آثر مرحوم

مملوکۂ شوق اثری رام پوری

لطیف

مولوی لطیف احمد خاں ولد مولوی مقبول احمد خاں، خلف مولوی غلام حضرت خانصاحب رام پور کے محلہ لال مسجد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ عربی تعلیم مدرسہ عالیہ رام پور میں حاصل کی اور حدیث کی سند لی۔ ان کے والد بڑے دیانت دار مشہور تھے، شاعری میں صاحبزادہ شیر علی خاں کے شاگرد۔ غزل اور رباعی سے فطری لگاؤ ہے۔ عمر ستاون (۵۷) سال کے قریب ہے۔

میانہ قد، چھریرا بدن، رنگ گورا، داڑھی بحد شرع، کم سخن، پابند شرع، مہذب، بااخلاق، ستودہ کردار، لباس خالص قومی، وضع قطع مولویانہ۔

نمونۂ کلام

بھولی ہوئی پھر یاد کہانی آئی　　　پھر گرم ہوا خون، روانی آئی

پھر دل میں وہ پہلی سی امنگیں اٹھیں		پھر عشق کے ہمراہ جوانی آئی

صدائیں غیبی ہیں یہ مسافر سمجھ نہ نالے انھیں جرس کے

سفر ہے درپیش تحت منزل کمر کو اب باندھ لے تو کس کے

دل وجگر جو سلگ رہے تھے الٰہی کیا ان میں آگ بھڑکی

شرارے منہ سے نکل رہے ہیں جو ساتھ ہیں آج ہر نفس کے

فراق کا کون روگ پالے کہیں سے تو آج زہر کھالیں

ہے ایسے جینے سے موت بہتر جیے بھی تو کیا ترس ترس کے

رقیب لائیں تو شاید آ کر دہ ہمنشیں مجھ کو دیکھ جائیں

نہ تجھ سے آئیں، نہ مجھ سے آئیں، نہ میرے بس کے، نہ تیرے بس کے

وہاں نکھر جائیں گے یہ سارے، بنیں گے محشر میں چاند تارے

تمہارے عاشق جو اب ہیں کالے تپِ الم سے جھلس جھلس کے

ہیں سبز جنگل میں لہلہاتے، بہار کے اب مزے ہیں آتے

ہرے کئے دشت سارے غم کی گھٹا نے اب کے برس برس کے

جو چھوٹ سکتا تو چھوڑ دیتا مگر نہ واعظ کے طعنے سنتا

لطیف نادم ہوں دل میں کیسا زبان لے کے لگائے چسکے

دیکھا نہ پھر کسی کو وہ رخسار دیکھ کر		کھو بیٹھے آنکھیں تابِ رخِ یار دیکھ کر

دیکھو گے کیا مریضِ محبت کا حال تم		رونے لگو گے حالتِ بیمار دیکھ کر

گھبرائیں کیا وہ ظلم سے تجھ پر مٹے ہیں جو　　تجھ کو ستم شکار ستمگار دیکھ کر
تھی کیا خبر لطیفؔ عدو کا مکان ہے　　بیٹھا تھا میں تو سایۂ دیوار دیکھ کر

لطیفؔ

منشی لطیف الرحمٰن خانصاحب ولد الطاف الرحمٰن خانصاحب ۱۸۸۶ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن افغانستان ہے۔ اُن کا خاندان نواب سید فضل اللہ صاحب والئ رام پور کے ابتدائی عہد میں رام پور آیا۔ اردو اور فارسی کی تعلیم مختلف اساتذہ سے پائی۔ فوجی ملازمت کا شوق ہوا۔ اس وقت اُن کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔ پہلے رسالہ میں تقرر رہا پھر ۱۹۰۳ء میں ملٹری میں تبدیل ہوئے، ذاتی قابلیت اور ذہانت سے کچھ ہی مدت میں حولدار میجر ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد سیکنڈ انفنٹری میں صوبیدار ہو گئے۔

شعر سے فطری ذوق تھا، قدرت علی خاں قدرتؔ رامپوری کی صحبت رہی۔ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے، ان ہی کی کوششوں سے احسان علی خانصاحب احسانؔ رامپوری شاگرد داغؔ سے تلمذ ہوا اس کے بعد مرزا حیاؔ دہلوی سے اصلاح لی۔ کچھ دنوں بزمؔ اکبر آبادی سے منشی احمد علی شوقؔ قدوائی کو کلام دکھایا، آخری استاد نشترؔ سکندر آبادی تھے۔ ان کو نعت سے خاص لگاؤ تھا اور اسی کو ذریعہ نجات بنایا۔

میانہ قد چھریرا بدن، رنگ گورا۔ آنکھیں بڑی، ناک ستواں، بدن سڈول، خوش اخلاق، احباب نواز، ظریف الطبع اور ذہین و متین انسان تھے۔

نمونۂ کلام

ادھر بھی اک نظر اے سیّد ابرار ہو جائے　　کہ بیڑا بحرِ غم سے عاصیوں کا پار ہو جائے

خداوندا قضا آنے سے پہلے یہ تمنا ہے
شہنشاہِ مدینہ کو سلام اک بار ہوجائے

مدینہ زائرو پہنچو تو کہنا میری جانب سے
کبھی مجھ غمزدہ کی یاد بھی سرکار ہوجائے

الٰہی حبّ دنیا کا نکل کر طوق گردن سے
ترے محبوب کی الفت گلے کا ہار ہوجائے

بلاتے ہو مدینہ جب نہ مایوسِ تمنا کو
تو حضرت خواب میں ہی پھر اسے دیدار ہوجائے

اگر اپنے کرم سے تم کرم کی اک نظر ڈالو
تو یہ دنیا لطیفؔ خستہ کی گلزار ہوجائے

خدا کو کیا پسند آئے اسے زاہد خدا جانے
مرے اشک ندامت یا تری تسبیح کے دانے

میکشؔ

محمد یامین خاں حشمت علی خانصاحب مرحوم۔ ۱۹۳۲ء بمقام رامپور پیدا ہوئے۔ والد ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ بارہ دری میں ماسٹر ضیاء الدین خانصاحب سے حاصل کی۔ اس کے بعد حامد ہائی اسکول میں داخل ہوئے اسکول کی تعلیم ہی کے زمانہ میں شاعری کا شوق پیدا ہوا جو یہاں تک بڑھا کہ کئی بار فیل ہوگئے۔ اس کے بعد شاہجہاں پور کے اسکول میں داخل ہوئے لیکن کچھ دنوں بعد اسکول چھوڑنا پڑا۔ احباب اور بھائیوں کے مشورہ سے ٹوپیوں کا کام شروع کردیا جو جاری ہے۔ سینما، ہاکی اور شاعری سے ذوق ہے۔

نمونہ کلام

بگاڑیں گے کیا ان کا طوفاں کے دھارے
جو چلتے رہیں گے کنارے کنارے

ذرا شیخ صاحب سے بچتے ہی رہنا
کہ قائم ہیں دنیا پہ ان کے اجارے

زمانہ میں سب کچھ ہوا اور ہوگا
مگر غالباً تم نہ ہوگے ہمارے

دیکھئے کیا دل پہ گزرے سنگِ دل کے سامنے
آج آئینے کو ہم پتھر سے ٹکرانے چلے

بھا نہیں سکتا تھا پروانوں کو یہ رنگ دوئی
شمع کی الفت میں خود ہی شمع بن جانے چلے

قدیر

عبدالقدیر خاں ولد عبدالمجید خاں صاحب۔ ۱۹۳۱ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ والد کا ذریعہ معاش ٹھیکیداری تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد اسکول میں داخل ہوئے، لیکن اقتصادی حالات کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ رضا ٹیکسٹائل میں نوکری کر لی۔ شاعری کا ذوق تھا، شاعری میں تلمذ ابرار حسنی گنوری سے ہے۔

نمونہ کلام

چمن سے جاتے ہوئے جانبِ جہانِ قفس
نگاہِ یاس سے تکتا ہوں آشیانے کو

ان مست اداؤں سے گلشن میں کوئی آیا
ہر شاخِ گلِ تر نے گھبرا کے لی انگڑائی

روندنے والے گلوں کو پاؤں سے
عندلیبوں کا ذرا کہرام دیکھ

بساطِ مظالم پہ بستی ہے دنیا
کہ امن و سکوں کو ترستی ہے دنیا

کلی کا خاک میں مل کر یہ کہنا کیا قیامت تھا
مآل خندۂ گل سے نہ تھی کچھ آگہی مجھ کو

ہنگامہ ہائے زیست کی رونق ان ہی سے ہے
پلکوں کی اوٹ میں جو ستارے اداس ہیں

وہ میرے مقابل ہیں، جنت ہے نگاہوں میں
آغاز تو دلکش ہے، انجام خدا جانے

ابھی ستاروں میں کچھ کچھ ہے روشنی باقی
مریضِ ہجر ابھی اتنا بے قرار نہ ہو

سنا گیا ہے کہ ہر سمت ہے وطن میں خوشی
مری نظر میں ہے لیکن غمِ جہاں اب تک

مری ہمتیں، مرے حوصلے کوئی ہے چمن میں جوداد دے
جہاں بجلیوں کی ہوں یورشیں وہیں آشیاں کی تلاش ہے

ہے ماہتاب اور کہیں آفتاب ہے　　پردوں کے باوجود بھی تو بے نقاب ہے
جفاؤں پہ ان کو حجاب آرہا ہے　　الٰہی یہ کیا انقلاب آرہا ہے

صبا

جمیل الرحمٰن خاں افغانی ولد حبیب الرحمٰن رسالدار، ساکن گھیر قلندر خاں، رامپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، انگریزی تعلیم آٹھویں تک پائی۔ نانا شیر زماں خانصاحب مرحوم تھے جو ڈائریکٹر تعلیمات تھے، اس کے بعد ڈسٹرکٹ وسیشن جج ہوئے۔ خدمات کے صلہ میں تین سو روپیہ ماہانہ تنخواہ کے علاوہ ملتا تھا جوان کے ورثا کو بعد کو بھی ملتا رہا، فن شعر میں سید شرف زیدی سے تلمذ ہے۔ ۱۹۵۳ء میں عمر ۳۲ سال تھی، فلم کمپنی کے گانے نظم کرتے ہیں۔

نمونۂ کلام

یہ کیا راز ہے ساقی مست و بیخود کہ اب تو نے چشمِ عنایت ہٹالی
وہی میکدہ ہے مگر سونا سونا، وہی جام و مینا مگر خالی خالی
گلوں سے لطافت، ستاروں سے تابش، گھٹاؤں سے مستی، کلی سے حیالی
غرض اس طرح کر کے اجزا فراہم تصور میں ہم نے قیامت بُلالی
وہ خلدِ نظر اُن کے پرنور عارض، وہ گیسوئے مشکیں گھٹا جیسے کالی
وہ بدمست، مدہوش مخمور آنکھیں کہ شیشوں نے جیسے گلابی اچھالی

نظر سہمی سہمی، قدم ڈگمگائے، وہ فتنے جگاتے چلے آ رہے ہیں
سلامت رہے ان کی محشر خرامی، مبارک ہو اے دل تجھے پائمالی
نگاہوں کا ہوتے ہی ان سے تصادم یکا یک ہواؤں میں گونجا ترنم
ادھر عشق نے بربطِ دل کو چھیڑا، ادھر حسن نے اپنی پائل سنبھالی
یہ کون آج آتا ہے سوئے گلستاں، معطر معطر، خراماں خراماں
بہاریں ہیں کیوں اپنی قسمت پہ نازاں، یہ کیوں وجد میں ہے صباؔ ڈالی ڈالی

محبت جتانے کو جی چاہتا ہے
انھیں بھی رلانے کو جی چاہتا ہے
چھلکنے کو ہیں چشم پرنم سے آنسو
مگر مسکرانے کو جی چاہتا ہے
وہ کیوں یاد آئے چلے جا رہے ہیں
جنھیں بھول جانے کو جی چاہتا ہے
ہو خودداریوں کی مری خیر یارب
انھیں پھر منانے کو جی چاہتا ہے
صباؔ دیکھ کر برق و باراں کو اکثر
نشیمن بنانے کو جی چاہتا ہے

ماہرؔ رجسٹرار

حصول صحبت منعم سے جز ضرر کیا ہو
کہ چاک باعثِ گوہر شکم صدف کا ہو
نہ تندرست ہوں نازک نفس دوائی سے
شکست جائے نہ چینی کی مومیائی سے

مجذوب

مولوی محمد شفیع خاں ولد مولوی شاہ نواز خاں قوم احمد زئی۔ (محمد علی خاں اثر کے والد تھے) ۲۹ رصفر ۱۲۸۵ھ کو اتوار کے دن رام پور میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تکمیل اپنے والد اور ایک افغانی مولوی سے کی۔ عربی جوانی میں حضرت شاہ محمد شیر پیلی بھیتی سے پڑھی۔ ابتدائی ملازمت فوج میں کی۔ اس کے بعد تدریس کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ فارسی اور اُردو کے مغلق اشعار حل کرنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے بہت سے شاگرد معزز عہدوں پر فائز ہیں۔ پوری عمر زہد وتقویٰ، خدمتِ خلق، عبادت اور ذکرِ الٰہی میں گزری۔ بیعت کے بعد رات کے پچھلے حصہ میں ذکر و گریہ ہمیشہ جاری رہا۔ دُنیا کی نمائشی چیزیں ان کی نگاہوں میں ہیچ تھیں۔ کسی امیر یا وزیر کی تعظیم کو نہ کھڑے ہوتے، بات ہمیشہ صاف اور سچی کہتے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ جو کچھ کہتے جذبۂ حال کے تحت کہتے۔ ۹ را کتوبر ۱۹۴۰ء کو ۷۴ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ بیماری کے دنوں میں جب سب کو رنجیدہ دیکھا تو بولے فکر کی بات کیا ہے میں تو ایک عظیم الشان میزبان کے پاس جا رہا ہوں اور مجھے قوی اُمید ہے کہ وہ مہمان کے حقیر ہونے کے باوجود اپنی شان میزبانی کے مطابق سلوک فرمائے گا۔

عادات کے لحاظ سے خوش مزاج، مرنجاں مرنج اور صادق القول تھے۔ کسی کی دل شکنی گوارا نہ تھی۔ اختلافی مسائل پر خاموش رہتے۔ سرخ و سفید رنگ، لمبا قد، کتابی چہرہ، کشادہ ابرو، فراخ پیشانی، داڑھی یک مشت، چھریرا بدن، کرتا اچکن، گول ٹوپی اور ڈھیلا پائجامہ استعمال کرتے تھے۔

حافظ جمیل جلیلؔ مانک پوری استاد نظام دکن نے تاریخ وفات کہی۔

زدہر گشت محمد شفیع خاں راہی   بسوئے خلد کہ آں ملک جاوداں باشد

ہمیں دعا و ہمیں سل رحلت است جلیل　　بہ لطف پاک محمد شفیع شاں باشد

۱۳۵۹ھ

....

وہ محبوبِ حق کا نرالا ہوا ہے　　تمام انبیا سے جو بالا ہوا ہے

کبھی کاش ہم دیکھتے اس کا نقشہ　　جو قدرت کے سانچے میں ڈھالا ہوا ہے

نہیں آج سے بلکہ روزِ ازل سے　　یہ عشقِ نبی دل میں ڈالا ہوا ہے

نہیں ان کا ہمسر کوئی دو جہاں میں　　خدا کے جو نازوں کا پالا ہوا ہے

....

دین و دنیا میں ہے چرچا شہِ ذیشاں تیرا　　یوسفِ مصر بھی ہے تابعِ فرماں تیرا

سیر کو میری فقط داغِ جگر کافی ہے　　باغباں تجھ کو مبارک ہو گلستاں تیرا

غمِ کونین ہیں تیری ہی بدولت دل میں　　کیوں نہ ممنون ہوں میں اے غمِ جاناں تیرا

چھوڑ دے جنتِ فردوس اسی دم رضواں　　ہاتھ آجائے اگر گوشۂ داماں تیرا

نہ رہے کافر و مسلم کوئی دوزخ میں کبھی　　گر ہلے بہر شفاعت لبِ خنداں تیرا

....

کیا تعجب گر کریں رحم اس دلِ مجذوب پر　　جان و دل سے چاہنے والا ہے غوثِ پاک کا

خدا سے مل گیا وہ جو ملا ہے ذاتِ عالی سے　　کلیدِ گنجِ وحدت ہو مرے محبوبِ سبحانی

عشق نے دیر و حرم دل سے مٹایا بالکل　　کفر و ایماں سے الگ راہ بنائی تو نے

وہ دل کے پردے میں آ رہا ہے　　جو چپکے چپکے جلا رہا ہے

مجرد

وزیر خاں ہزل گو۔ رام پور کے محلّہ گویا تالاب میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اُردو اور فارسی کی تھی، ابتدائی ملازمت سرکاری باورچی خانہ میں ہوئی، اس کے بعد تاحیات سرکاری اصطبل کے داروغہ رہے۔ پابند صوم وصلوٰۃ اور تہجد گزار تھے، صاحب ریش، تسبیح ہاتھ میں رہتی۔ میانہ قد، رنگ سانولا، ۱۹۱۸ء میں وفات پائی۔ یہیں دفن ہوئے۔ مشاعرہ میں جب غزل پڑھتے تو محفلِ مشاعرہ دیوارِ قہقہہ بن جاتی لیکن خود سنجیدگی اور متانت کا پیکر بنے رہتے۔ ایک مرتبہ کسی مجلس میں کھیر کی کلیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ کسی ظریف نے ان کو ایسی کلیا دی جس میں کھیر بہت کم تھی اس پر فی البدیہہ یہ شعر کہا ۔

ابرِ رحمت سے بھرے جاتے ہیں دریا خالی	اس بھرے گھر میں لئے جاتے ہیں کلیا خالی

مہتمم نے یہ سن کر دو کلیاں دیدیں اور آئندہ کے لئے دو کلیاں ہمیشہ کے لئے مقرر ہو گئیں۔

نمونۂ کلام

آ اس جمائے بیٹھے جو اس کے تھان پر ہیں	سلطانِ ہفت کشور اس کے فلان پر ہیں
ایسا دھکا میں لگاؤں کہ تو یاد رہے	چیختی نائکہ سر پیٹتا استاد رہے
نہ ہوگا کوئی مجرد وزیر خاں کی طرح	کہ پیر ہو کے بھی لیتے ہیں وہ جواں کی طرح

محشر عنایتی

صابر رضا خانصاحب ولد احمد رضا خانصاحب سلسلہ نسب حضرت اخوند درویزہ بابا قدس سرہ سے ملتا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ صاحبہ حضرت مولانا حافظ عنایت

اللہ خانصاحب نقشبندی مجددی رامپور کے مشہور بزرگ کی پوتی ہیں اسی لئے تخلص کے ساتھ عنایتی لگاتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم مختلف استادوں سے حاصل کی۔ زیادہ مدت مولانا عبدالوہاب خانصاحب کے حلقۂ تدریس میں گزری، عربی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا۔ شاعری کا ذوق فطری ہے، گیارہ سال کی عمر میں چھوٹے بھائی کو مخاطب کر کے شعر موزوں کیا۔

شاکر ترے ہوتے ہوئے پانی کو میں ترسوں　　　اے جانِ برادر تجھے غیرت نہیں آتی

۱۶ برس کی عمر میں رشید رام پوری کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں اردو شاعری نے ایک نئی کروٹ لی۔ فطری رجحانات اور مشاہدات کی طرف شاعری زبان کے چٹخاروں کو چھوڑ کر جانا چاہتی تھی، استاد سے رنگِ شاعری پر اختلاف پیدا ہوا اور محمود رامپوری سے اصلاح شروع کردی لیکن دو غزلوں کی اصلاح کے بعد قاضی حافظ الدین احمد نشتر جو قصبہ سکندرآباد ضلع بلند شہر کے باشندے اور حیات بخش رسا سکندرآبادی کے بھتیجے اور شاگرد تھے اصلاح کا سلسلہ شروع کیا جن سے فن کے معاملہ میں زیادہ فائدہ پہنچا۔

(۱۹۲۸ء کے بعد کا کلام) طبعاً خوش مزاج، مہمان نواز ہیں۔

میں تجدیدِ جنوں کی رسم کو کچھ عام کردیتا　　　سلیقے سے اگر دامن کو آتا دھجیاں ہونا
جلووں سے بے خودی سرِ محفل کدھر نہیں　　　اب غالباً مجھے بھی تمہاری خبر نہیں
نہیں قسمت میں گر صبحِ بہارِ باغ تو یارب　　　قفس تک جاتے جاتے زندگی کی شام ہو جائے
جا پڑی تھی یونہی دامن پہ نگاہِ وحشت　　　میں نے یہ تو نہ کہا تھا کہ گریباں ہو جائے
اچھا نویدِ بخششِ پیہم بھی دے کوئی　　　لیکن ذرا مذاقِ گنہ گار دیکھ کر

مجھے تقدیر کی بیگانگی کا ہے گلہ محشر
کہ میں نے پھول پر بھی ہاتھ ڈالا ہے تو خار آیا

کیا واقعی ہوئی ہیں حجابوں کو جنبشیں
یا کچھ فریب دینے لگی ہے نظر مجھے

اسباب یہ کہ ہوش سنبھالوں تو قید میں
حالات یہ کہ سونپ دیئے بال و پر مجھے

یہاں کی اصطلاحیں ساری دنیا سے نرالی ہیں
قفس میں جس کو رہنا ہو زباں سیکھے، بیاں سمجھے

نگہباں قید کے حالات کچھ رنگیں بناتا ہیں
اجازت ہو تو مل بیٹھا کریں دو چار دیوانے

محبت اختیاری شے نہیں ہے
محبت کی نہیں جاتی کسی سے

یہ طے کر کے نکلنے کی جسارت کی ہے زنداں سے
کہ مجھ کو گل نہیں کچھ خار چننا ہیں گلستاں سے

ذرا یہ فیصلہ کرلوں کہ مجھ کو ڈوبنا ہوگا
پہنچ سکتا ہوں ساحل تک، گزر سکتا ہوں طوفاں سے

جو خطا نہ کر سکے ہیں سرِ حشر وہ نہ آئیں
یہ خطائیں کم نہیں ہیں کہ نہ کی گئیں خطائیں

اگر مجبوریاں حائل نہ ہوتیں حدِ امکاں کی
تو یہ بھی دیکھتی دنیا کہاں منزل ہے انساں کی

اب سوچتا ہوں جبکہ وہ اٹھ کر چلے گئے
دل کیوں دھڑک رہا تھا، نظر کیوں جمی رہی

چاندنی راتیں مہک پھولوں کی، ہر جانب سکوت
اب بتاؤ کس کو کس کے پاس ہونا چاہئے

یہ پہلے سوچنے کا ہے جو گلشن میں بہار آئے
تو کلیوں کے تبسم پر ترس آئے کہ پیار آئے

ہاں بظاہر کوئی تکلیف تو زنداں میں نہیں
دھیان ان باتوں کا آتا ہے جو امکاں میں نہیں

موت ہاں موت تو آساں ہے مگر مشکل ہے
زندگی جس کا سلیقہ ابھی انساں میں نہیں

آگ میں کودے جو انساں تو گلستاں ہو جائے
خطرہ ساحل پہ نظر آتا ہے جو امکاں میں نہیں

بہارِ باغ پہ حق چاہتے ہو خیر مناؤ
بچا ہوا ہے نشیمن ہی کم سے کم اب تک

یہ جان کر کہ پھول نہیں اختیار کے
کانٹے چنے ہیں میں نے چمن میں بہار کے

ہر اک جنبش پہ ڈر کر دیکھ لیتا ہوں نگہباں کو   ابھی میں مدتوں زنداں ہی سمجھوں گا گلستاں کو

رباعی

الزام ہیں صدہا تو ہزاروں بہتان   بدنام بہر طور ہوا ہے شیطان
شیطان کو مردود سمجھنے والو   شیطان تو شیطان ہے لیکن انسان؟

مسافرِ حیات

یہ ٹھگ، یہ دزدِ روز و شب، یہ راہزن، یہ بھیڑیئے   نئے نرالے روپ میں وہ جا رہے ہیں سامنے
بچے بچے، کھنچے کھنچے، دبے دبے، چھپے چھپے   بتا دے بڑھ کے دور داؤ پیچ کا چلا گیا
مسافرِ حیات اٹھ! سفر کا وقت آ گیا

وہ ننھی ننھی بچیوں کے چہرہ ہائے زرد زرد   وہ نوجواں بہادروں کے عزم ہائے سرد سرد
وہ بوڑھے والدین کی نظر اُداس، دل میں درد درد   سماج انھیں تباہیوں کے غار میں گرا گیا
مسافرِ حیات اٹھ! سفر کا وقت آ گیا

وہ دیکھ آفتاب کی چمک رہی ہیں سرخیاں   نظر اٹھا، ہمالہ کی دمک رہی ہیں چوٹیاں
وہ دیکھ گوشے گوشے پہ کڑک رہی ہیں بجلیاں   فلک سے لے کے تا زمیں تمام نور چھا گیا
مسافرِ حیات اٹھ! سفر کا وقت آ گیا

نئے نئے سے رہنماؤں کا نیا خیال دیکھ   نئی نئی حکومتوں کا رنگِ بے مثال دیکھ
یہ تحکمانہ شان دیکھ، یہ شاطرانہ چال دیکھ   یہ خود غرض گروہ شمعِ ارتقا بجھا گیا
مسافرِ حیات اٹھ! سفر کا وقت آ گیا

سارے دوانے نگہباں ایک سے ہوتے نہیں
چھوٹ کر کچھ بیٹھ بھی جائیں گے زنداں کے قریب

وہ دیوانہ کبھی جو کہہ بھی دیتا ہے ٹھکانے کی
کہیں ایسا نہ ہو فطرت بیاں کر دے زمانے کی

بہارِ باغ کا منہ چومتی ہے میری بربادی
کہ پھولوں پر پڑی ہے خاک میرے آشیانے کی

....

ترے سلوکِ تغافل سے ہوئے سودائی
چلا ہوں میں تو کچھ آگے چلی ہے رسوائی

طبیعتوں میں بڑا اختلاف ہوتا ہے
مجھے تو عرضِ تمنا پہ شرم سی آئی

جو آج ذکر چلا آستیں کے سانپوں کا
تو مجھ کو اپنے کئی دوستوں کی یاد آئی

تمام عمر میں پہنچا ہوں اس نتیجے پر
نشاطِ بزم سے بہتر ہے دردِ تنہائی

بڑے بھولے، بڑے سیدھے کہیں کے
ذرا دھبے تو دیکھو آستیں کے

چلو پابند ہی رہنا کسی کے
مگر یہ بل بھی جائیں گے جبیں کے

محمود

محمود علی خاں ولد مولوی اشرف علی خاں۔ ۱۸۶۵ء میں رام پور میں پیدا ہوئے، آپ کے مورث اعلیٰ شاہان مغلیہ دربار میں باعزت جگہ پر تھے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی عبدالرحمٰن سے حاصل کی۔ عربی میاں حسن شاہ محدث سے پڑھی، سید منصور علی منصور و علیٰ تخلص سے تاریخ میں شاگردی اختیار کی، یہ درویش تھے۔ ان ہی کے معتقدین میں بھی داخل ہو گئے، خوشنویسی مولوی احمد خانصاحب سے سیکھی۔ شاعری میں داغؔ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ ان کا کلام استاد کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، شوخیٔ بیان محاوروں کی بے تکلفی اور صفائی بیان کلام میں موجود ہیں۔ بعض غزلوں پر داغؔ نے اپنے قلم سے بے ساختہ تعریف لکھی ہے۔ ''محمود! تمہاری

غزل پر مجھے رشک آتا ہے، کوئی دوسرا ایسی غزل کہے تو جانوں"۔ حسنِ کلام اور حسنِ سیرت کے علاوہ حسنِ صورت بھی عطا ہوا تھا۔

میانہ قد، کتابی چہرہ، گھونگھریالے بال، رنگ سرخ وسفید، کسرتی بدن، بھرے بھرے بازو، گفتگو میں دلکشی، مزاج میں انکساری، نام ونمود سے نفرت، نہ امراء کی شان میں قصائد لکھے اور نہ قوالوں کو غزلیں دیں، شاگردوں کی تعداد رام پور اور بیرونِ رام پور پائی جاتی ہے۔ آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ ۲۱ر شعبان ۱۳۵۳ء مطابق ۳۰ر نومبر ۱۹۳۴ء، ۷۰ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ شاہ بغدادی صاحب کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ غزل تحت اللفظ میں پڑھتے تھے مگر طرزِ ادا قابل دید تھا۔

اُن کے شاگرد رشید احمد خاں صاحب رشیدؔ رامپوری نے قطعہ تاریخ کہا۔

وہ لطف زباں دانی نہ رہا، وہ شوق غزل خوانی نہ رہا
استاد جہاں سے کیا اٹھے سب ختم ہوئے آدابِ سخن
سن عیسوی اور ہجری میں نے لکھے ہیں رشید اک مصرع میں
اٹھا حیف زمانہ سے تاجِ کرم، بجھا آج چراغ بابِ سخن

۱۳۵۳ھ ۱۹۳۴ء

نمونہ کلام

دست وحشت کبھی غارت گرِ ساماں نہ ہوا دو گریباں ہوئے جب ایک گریباں نہ ہوا
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ہم وحشت میں ہائے دامن نہ ہوا، ہائے گریباں نہ ہوا
دشمن اچھے ہیں جو دم دم کی خبر پوچھتے ہیں دوست اتنا بھی مرے حال کا پرساں نہ ہوا

....

میں کچھ اس طرح ترے در سے پلٹ کر آیا — کہ مجھے دیکھ کے دشمن کا بھی جی بھر آیا

تو نکل جا مرے پہلو سے تڑپ کر دن میں — پھر وہی رات کا وقت اے دلِ مضطر آیا

ماہ رو، ماہ لقا تجھ کو کہوں میں کیونکر — تو کسی رات، کسی روز مرے گھر آیا

اس نے زانو سے دبایا تو ملا یہ آرام — کہ مجھے نیند کا جھونکا تہِ خنجر آیا

....

اس قدر خوف ہے کیوں آپ کو رسوائی کا — کون ہے دیکھنے والا دلِ شیدائی کا

نزع میں ہونے لگی غیر کی مجھ سے تعریف — جب یہ دیکھا اسے یارا نہیں گویائی کا

کاش یہ دھیان تمہارا جو پلٹ کر جاتا — اس سے تم پوچھتے قصہ مری تنہائی کا

....

جب کہا اس نے آج کیوں چپ ہو — پھر شکایت کا حوصلہ نہ ہوا

....

تیر جب اُس کمان سے نکلا — شکر میری زبان سے نکلا

....

مرنے کا میرے خاک بھی اُن کو نہ غم ہوا — بولے کہ ایک چاہنے والا تو کم ہوا

....

اس نے تنہا جو مجھے وقتِ سحر چھوڑ دیا — میری فریاد سے گھر والوں نے گھر چھوڑ دیا

یہ تلوّن ہو تو کیا لطفِ اسیری صیّاد — کہ اِدھر قید کیا اور اُدھر چھوڑ دیا

چپکے چپکے مرے بالیں پہ وہ فرماتے ہیں — موت نے کچھ نہ کیا اس کو اگر چھوڑ دیا

....

آنسو بھرے ہیں آنکھ میں اس مستِ حسن کے — لبریز کس کی عمر کا پیمانہ ہو گیا

ہوگیا پیکاں سے اظہارِ بیانِ دردِ دل ‏ تیر کھا کر کھل گئی گویا زبانِ دردِ دل

لوگ کہتے ہیں دمِ نزع بلا لو ان کو ‏ اپنا یہ قول کہ مرتے ہیں۔اس احسان سے ہم

تصور میں بھی وہ کیا کیا ہمیں حیران کرتے ہیں

عدو کے دھیان میں ہوتے ہیں جب ہم دھیان کرتے ہیں

میرا شروع عشق تمہارا شباب تھا ‏ میرا جواب تھا نہ تمہارا جواب تھا

تلون کے سبب تم آدمی کیا ہو، تماشا ہو ‏ ابھی خوش تھے، ابھی ناخوش، ابھی کیا تھے، ابھی کیا ہو

کس واسطے مقتل سے لئے جاتے ہو گھر کو ‏ کیا اور کسی تن پر دھرو گے مرے سر کو

دیکھنے والوں کے ہاتھوں ناک میں دم آگیا ‏ تھک گیا یہ آپ کا بیمار اُٹھتے بیٹھتے

کی غیر کی شکایت میں نے تو بولے جل کے ‏ گر جائے یاالٰہی ایسی زبان گل کے

فتنہ کوئی اٹھاؤ گے گھر سے ذرا نکل کے ‏ پھر حشر بھی اُٹھے گا کچھ تھوڑی دور چل کے

....

قدم قدم رہِ اُلفت میں ہے محال مجھے ‏ کہ اپنے سایہ سے کہتا ہوں تو سنبھال مجھے

اِدھر اُدھر کے غم و رنج کھائے جاتے ہیں ‏ خصوصاً اپنا تو کچھ بھی نہیں خیال مجھے

نگاہِ شرم سے ظاہر ہے شب کی بیداری ‏ کچھ اور بھی ابھی ہونے ہیں احتمال مجھے

زاہد صراحی لے کے طاقت ہے توڑ ڈالے ‏ ہر ایک مست اُٹھ کر گردن مروڑ ڈالے

ہزاروں گالیاں وہ دے رہے تھے بے خطا مجھ کو

جو پوچھا بات کیا ہے جل کے بولے بات کیا ہوتی

تمہاری آنکھوں میں کس نے یہ شوخیاں بھر دیں ‏ کہ اب جگہ نہیں باقی حیا کے آنے کی

انھیں یہ ضد کہ شب ہجر یہ رہے تنہا ‏ یہاں امید بلا کے پر بلا آنے کی

اب کیا بھلا کسی کی اطاعت کریں گے ہم
مدت ہوئی ہے آپ کا بندہ بنے ہوئے

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دُنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

ہم سے ہوتا ہے کوئی دم میں زمانہ خالی
ایسے ویسے ہیں جو کان آپ کے بھرنے کے لئے

وہ مرا حال جو پوچھیں تو یہ کہنا قاصد
ابھی جیتا ہے مگر مرنے کی تدبیر میں ہے

پڑے ہیں غش میں بسمل کا تڑپنا دیکھنے والے
تماشا بن گئے ہیں خود تماشا دیکھنے والے

نکلتے میکدہ سے اور زاہد ساتھ تو ہوتا
ہمارے ہاتھ میں ساغر، ترے سر پر سبو ہوتا

محمود

محمود شاہ خانصاحب وکیل ولد مسعود شاہ خانصاحب برادر زادۂ مولوی منصور شاہ خانصاحب رامپور۔ ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم رامپور میں، علی گڑھ کالج سے بی۔ اے۔ اور ایل۔ ایل۔ بی۔ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ کچھ دنوں خیر پور سندھ میں ملازمت کی۔ اس کے بعد علی گڑھ میں وکالت شروع کی اور کامیاب رہے۔ اس کے بعد رضا علی خانصاحب والی رام پور نے ریاست میں بلا کر مجسٹریٹ مقرر کیا۔ اس کے بعد سیشن جج ہو کر کورٹ کے جسٹس ہوئے۔ ۵/جنوری ۱۹۴۶ء میں انتقال ہوا۔ احاطہ مزار شاہ ولی اللہ صاحب میں دفن ہوئے۔ فن شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ مشرقی اور مغربی دونوں علوم میں قابلیت رکھتے تھے۔ مقدمات کے فیصلے بے لاگ کرتے تھے۔ نہایت خوش اخلاق، ظریف الطبع، مرنجاں مرنج، منکسر المزاج اور حلیم الطبع انسان تھے۔ لمبا قد، رنگ گندمی، چھریرا بدن، داڑھی مختصر، مخملی ٹوپی، شیروانی، بڑے پائنچے کا پاجامہ اور بوٹ جوتا استعمال کرتے تھے۔ ایک مختصر مجموعۂ کلام

''جوئے شیریں'' ۱۹۲۱ء میں طبع ہو چکا ہے جس میں نظم ونثر کے ایک منبع سے چار مختلف بحروں کے مضامین کی نظمیں نکلتی ہیں۔

ٹوٹ جاتا ہے ذرا سی دیر میں تارِ حیات
محوِ ہستی ہو نہ جانا او سبکسارِ حیات

منزلِ مقصود پر پہنچا فنا کا قافلہ
رہ گیا رستے میں ٹھوکر کھا کے رہوارِ حیات

مجھ سے گر پوچھو تو مرگ وزیست دونوں ایک ہیں
دستِ معمارِ قضا ہے دستِ معمارِ حیات

کشمکش یونہی رہی بزمِ عناصر میں اگر
ٹوٹ جائے گا کوئی دم میں مرا تارِ حیات

پابرہنہ ننگے سر روتا ہوا آیا کوئی
غور سے دیکھا تو تھا اک نو گرفتارِ حیات

رہ نوردی کردہ ام اول بمیدان عدم
آمدم زاں پس بسیر باغ و بازارِ حیات

ہوئی سب بزم برہم اب نہ ساقی ہے نہ صہبا ہے
دھواں اِک شمع افسردہ کا ہاں کچھ کچھ نکلتا ہے

بنایا جان دے کر بھی نشانِ بادہ ومینا
کسی بدمست کی قسمت کو یوں بھی تم نے دیکھا ہے

مجھے محرومی قسمت پہ رونے سے کہاں فرصت
کرے وہ صبر کی تلقین واعظ کون سنتا ہے

طرحی غزل

شاد باش اے شامِ ہجراں آج پھر تیرے لئے
ارمغاں میں لائے ہیں کچھ اشکِ گوہر بار ہم

کچھ تو پہلے جا چکے اور آج کچھ جانے کو ہیں
کل کو یہ بھی جائیں گے باقی جو ہیں دو چار ہم

بموقع جنگ بلقان

یارب دلِ غمگیں کو پھر ذوقِ تماشا دے
پھر خوگرِ وحشت کو آزادیٔ صحرا دے

وہ زور عطا کر دے پھر اپنے گداؤں کو
جو موج کو لرزا دے اور برق کو شرما دے

پھر جان کے کھونے کا وہ شوق عنایت کر — جو تیرے شہیدوں کو پھر خون میں نہلا دے
پھر گونج اُٹھے دنیا توحید کے نغمے سے — تکبیر کا آوازہ رہبانِ کلیسا دے
اسلام کا نقارہ یورپ میں لگے بجنے — تثلیث کا کفارہ پھر قوم مسیحا دے
اسلام کی پھر آندھی یورپ میں لگے چلنے — پھر دورِ صلاح الدیں یہ گنبدِ مینا دے
اے مونس بیماراں، اے داورِ بیماراں — بگڑے ہوئے ترکوں کو سالاری دُنیا دے

جنگ یورپ ۱۹۱۴ء

پھر جوشِ وحشت تازہ ہوا ہے — پھر پائے زخمی کوسوں پھرا ہے
فتنے ترے اے خارِ یورپ — دور ہلاکو شرما دیا ہے
انساں ہوا ہے سالارِ نخوت — ابلیسِ ملعون سر پیٹتا ہے
مرتی ہے کٹ کر اولادِ آدم — قانونِ عیسیٰ بے دست و پا ہے
اے خاکِ یورپ لعنت ہو تجھ پر — لالچ نے تجھ کو اندھا کیا ہے

تصدق احمد خانصاحب شیروانی کی گرفتاری ماہ اگست ۱۹۲۱ء کے موقع پر

رسید از عالمِ قدسی بشہر ماچنیں بادی — کہ سرو ماروان شد از گلستان ہمچو آزادی
فروغ رونق مقتل فسردہ شد بچشما نم — کہ خونِ بیگنا ہے خندہ زد بر تیغ جلادی
بسی دیدم دبستانہا بسی گشتم بزندان — رموزِ عشق بازی راندیدم چون تو استادی
تصدق بر تو جانم اے نگار خانہ یوسف — کہ از اشک زلیخا کردۂ تعمیر بنیادی
مبغشاں اشک راتادر شود آہستہ آہستہ — شکیبائی سزد محمود مارا تا بہ میعادی

مشتاق

حکیم مولوی محمد مشتاق ولد حکیم محمد اسحاق خاں، تحصیل بلاس پور ضلع رامپور، فارسی اور عربی اچھی جانتے تھے، تعلیم گھر ہی پر اپنے بزرگوں سے حاصل کی۔ عہد جوانی میں ہی راجپوتانہ جا کر جوناگڑھ میں طبابت شروع کی۔ طبیب حاذق تھے۔ شاعری کا بھی ذوق تھا، فن شاعری میں حکیم محمد یوسف خاں کے شاگرد تھے، صاحب دیوان تھے، نعت سے خاص لگاؤ تھا۔ ۱۹۴۶ء میں جوناگڑھ میں انتقال ہوا۔

نعت

تمہارا اِک تبسّم نو بہارِ باغِ امکاں ہے — عنادل کا ترنم، گُل کا حسنِ خوش ادا تم ہو
دلِ مشتاق کو پرنور کردو نورِ عرفاں سے — کہ ہے والشمس وصف روئے انور، والضحےٰ تم ہو

....

محمد سے ہوا آغازِ ہستی — محمد نے بسائی حق کی بستی
کہا پوجو خدا کو، ہم نے پوجا — اطاعت ان کی ہے یزداں پرستی
اگر ہوتا نہ شامل اُن کا فیضاں — گھٹا کیا خاک گلشن پر برستی
محمد رحمۃ للعالمین ہیں — ہے جنسِ رحمتِ حق کتنی سستی
طبیعت انقلابی ہے جہاں کی — بلندی کے لئے لازم ہے پستی
غمِ دُنیا و عقبیٰ میں پھنسا ہوں — کہاں مجھ کو دماغِ عیش و مستی
ہے مشتاق آپ کا پابندِ آلام — کرم اے باعثِ ایجادِ ہستی

مضطرؔ

مولوی غلام حضرت خاں ولد غلام جیلانی خاں خلف میاں علی سید قندھاری نواب فیض اللہ خاں کے عہد میں رام پور آئے۔ غلام حضرت خاں شاعر ہونے کے علاوہ پیری مریدی بھی کرتے ہیں۔ مکان محلہ نالا پار میں ہے۔

مولوی مقبول احمد خاں منصرم کے والد۔ فارسی کے مشہور استاد تھے۔ قد لمبا، قوی الجثہ، رنگ سانولا۔ ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء میں ۷۷ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ نمونہ کلام

بنود بہ کعبہ مسکن نہ سزد کنشت مارا — تو بہر کجا نشانی بودآں بہشت مارا
بنوشت نامہ آں بت، ہمہ راز وصل دردا — نہ پیامِ دادگاہی نہ خطی نوشت مارا
چو نصیب مانبا شد ز نشاط وعیش ایزد — مگر از برائے درد وغم وہم سرشت مارا
چہ زنی تو طعنہ زاہد چہ کنی غرور زہدت — چہ نوشتہ است دانی خطِ سرنوشت مارا

چہ بگوید از جفائے بتِ شعلہ خوئے مضطرؔ
کہ ز داغ ہجر ہمدم بچساں برشت مارا

مظہرؔ

مظہر علی خاں ولد اسد علی خانصاحب گھیر ملکان میں رہتے تھے۔ رام پور میں پیدا ہوئے۔ ضروری تعلیم فارسی کی پائی، خط نسخ میں کمال تھا، ناخن سے اس طرح لکھتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ پریس کردیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے دو نام ناخن سے لکھے جس پر نواب حامد علی خاں نے انعام سے نوازا۔ ۸۰ سال کی عمر میں ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا، قدرت علی

خاں قدرت کے شاگرد تھے۔

نمونہ کلام قطعہ تاریخ مسجد موضع اجیت پور ضلع رام پور

دعا و عجز و تفرع جناب باری میں
بہ حرف حرف سدا نسخۂ نیاز پڑھو
مقام شکر خدا ہے اٹھو چلو مظہر
بنا بزرگ عبادت کا گھر، نماز پڑھو

۱۳۱۶ھ

غزل

برگ گل کے سایہ سے جھکتا ہے وہ
اس گلِ کی نزاکت کیا کہوں
فکر کے قابل نہیں اے ہمنشیں
غیر ہے وہ اپنی حالت کیا کہوں
جا بجا وہ ہوں جو اے مظہر علی
عشق کی ہے یہ بدولت کیا کہوں

بسمل

محمد علی خاں ولد نیاز علی خاں۔ رام پور میں پیدا ہوئے۔ بسمل صاحب ابتداً سرشتہ نقل میں ملازم ہوئے۔ اس کے بعد ضلع مجسٹریٹ کے دفتر میں اہلمد ہوگئے۔ آخری دنوں میں محافظ خانہ فوجداری میں تبدیل ہوگئے اور تاحیات وہیں کام کیا۔ شاعری میں داغ کے شاگرد تھے۔ شادی صرف ایک کی تھی، خام سنکھیا کا استعمال کرتے تھے۔ سردی کے موسم میں ململ کا کرتا اور انگرکھا پہنتے تھے۔ ستر برس کی عمر میں ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔ لمبا قد، دہرا بدن، بھرے بھرے بازو، کسرتی جسم، گورا رنگ، لمبی آنکھیں، سیدھے سادے مسلمان اور اکھڑ پٹھان، مزاج کے خلاف بات سنتے ہی پیشانی پر بل اور آواز میں بھراہٹ پیدا ہوجاتی تھی۔

نمونہ کلام

گل خجل ہوکر ہوئے سب سرنگوں
تیری صورت، تیری رنگت کیا کہوں

میں ہوا بدنام، تم رسوا ہوئے
کوبکو کیسی ہے شہرت کیا کہوں

....

اثر آہ نہیں نالۂ شب گیر کے ساتھ
بس ذرا بھی نہیں چلتا فلکِ پیر کے ساتھ
لائی کیا بادِ سحر یار کی خوشبو بسمل
مشغلہ کیوں یہ نہ ہو پاؤں کی زنجیر کے ساتھ

....

شہیدِ خنجرِ تیغ ادا ہوں ناز جاناں کا
اسیر کاکل پیچاں ہوں اک زلفِ پریشاں کا
غضب کی چال دکھلا کر مجھے پامال کر جانا
مجھی پر امتحان کر آج ظالم تیغ بَراں کا
تجلی رُخ روشن نے کیا جلوہ دکھایا ہے
کہ اک عالم نظر آیا مجھے ہر سو چراغاں کا
بتوں کی صورتِ زیبا نے یہ نقشہ جمایا ہے
حریمِ کعبہ دل پر گماں ہے کافرستاں کا
زمیں سے آسماں تک نور کا عالم نظر آیا
بسا آنکھوں میں جلوہ ہے کسی کے روئے رخشاں کا
بڑی مشکل ہے بسمل اپنے پہلو میں نگار آئے
نشاں پایا نہیں ہرگز کسی نے کوئے جاناں کا
نازکی سے خنجرِ جاناں نکل کر رہ گیا
آج ارماں دل میں اپنے ہاتھ مل کر رہ گیا
غیر نے باتیں بنائیں خوب بزمِ یار میں
ذکر میرا محفلِ جاناں میں چل کر رہ گیا
قتل گاہِ عام ہے بسمل مقام کوئے یار
کوئی تڑپا دو قدم، کوئی سنبھل کر رہ گیا

معظّم

معظّم علی خانصاحب ولد عظمت علی خانصاحب خلف اصغر علی خانصاحب سابق وائس پرنسپل علی گڑھ کالج۔ اندور میں جج بھی رہے۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں پائی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی لندن سے بیرسٹری کی ڈگری لی۔ ۱۹۰۶ء میں بانکی پور میں پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء

تک گورنمنٹ کالج پٹنہ میں لکچرار رہے۔ ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ کالج میں وائس پرنسپل اور پولیٹکس کی پروفیسری پر مامور ہوئے، اس کے بعد پھر اندور میں ایڈوکیٹ جنرل کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں نواب یوسف علی نے رام پور کے ہائی کورٹ میں پہلے جج کی حیثیت سے مقرر کیا اور چیف جسٹس کے عہدہ تک ترقی کی۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے رام پور سے سبکدوش ہوکر اندور چلے گئے۔ ۱۰ راگست ۱۹۴۱ء میں اندور ہی میں قلب کی حرکت بند ہوجانے سے انتقال ہوا۔

طرحی مشاعرہ رام پور کی غزل

مجھ کو کچھ ربط بھی اس شوخ سے کرنے نہ دیا
اتنا بھی وقت مجھے دردِ جگر نے نہ دیا

خاک صحرا کی ترے عشق میں چھانی لیکن
کچھ بھی پھل ہم کو محبت کے شجر نے نہ دیا

کاش وہ روتے، مجھے دیکھ کے ہنس ہی دیتے
اتنا پانی بھی مجھے دیدۂ تر نے نہ دیا

ڈوب کر عشق کے دریا میں نہ اُچھلا میں کبھی
اس محبت کا بُرا ہو کہ اُبھرنے نہ دیا

وصل ممکن نہ ہوا تم کو معظم اس کا
کچھ بھی کرنے فلکِ شعبدہ گر نے نہ دیا

....

ہے حکم قتل اُن کا گنہگار کے لئے
اور وہ بھی کس کو مجھ سے خطا وار کے لئے

تو لاکھ بار بگڑے مگر میں تو جانِ من
سو بار آؤں گا ترے دیدار کے لئے

یاں بات منہ سے نکلی، وہاں ہوگئی خبر
گویا کہ ڈاک بھیجی ہے اخبار کے لئے

کیونکر نہ تنگ ہو کہ معظم وہ روز وشب
روتے ہیں پھوٹ پھوٹ کے اغیار کے لئے

بشیر

محمد بشیر خاں ولد مولوی جمال شاہ خاں۔ ورزش کے فنون سے دلچسپی رکھتے تھے، تیراکی کے ماہر تھے۔ کھڑی پیرائی میں یکتا تھے، جنرل اعظم خاں جب زخمی ہوئے تو بشیر ہی کے

سہارے سے وہ مولوی شفیع احمد پیشکار کے مکان تک پہنچے تھے۔ فنِ شاعری میں نظام رامپوری کے شاگرد تھے۔ آخر میں داغ دہلوی سے تعلقات کی وجہ سے حیدرآباد چلے گئے تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ (۱۹۰۹ء میں) امیر مینائی نے ۱۸۷۲ء میں ان کی عمر ۳۰ سال لکھی ہے۔ موت کے وقت تقریباً ۶۶ برس کے تھے۔

حسرت نے آ کے اپنی بھی مٹی خراب کی | خاک اُڑ رہی تھی اس دلِ خانہ خراب میں
پتھر کا دل بھی کیوں نہ دیا اے خدا مجھے | اس بت کا عشق میری ہی قسمت میں تھا اگر

آج کیا حال ہے ہم سے تو چھپاؤ نہ بشیرؔ
دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے کیوں دل آئے

جھوم جاتے ہیں ہزاروں دیکھ کر اے مستِ ناز
ایک تیری چشمِ میگوں لاکھ ساغر کا جواب

ممتازؔ

مولوی احمد علی خاں ولد اختر بلند خاں خلف خاں، ان کے دادا خاں عالم خاں سب سے پہلے رام پور آئے اور امور مذہبی کے نگراں مقرر ہوئے۔ مولانا مہدی علی خاں ممتازؔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر کچھ عرصہ فوج میں ملازم رہے لیکن جلد ہی اسے چھوڑ کر علمی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ریاست میں مدارس کے انسپکٹر بنے، نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے زمانہ میں مولانا کے علمی ذوق کا لحاظ کر کے ریاست کے کتب خانہ کی خدمات بھی ان ہی کو سونپ دی گئی اور اپنا خاص منشی بھی مقرر کیا۔ ذاتی خطوط وغیرہ کی کتابت ان ہی کے ذمہ تھی، درباری بھی ہوئے۔

امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ مولانا کی تصنیفات و تالیفات غیر مطبوعہ رضا لائبریری

میں موجود ہیں۔فہرست دواوین نواب۔عقد ثریا، جام جام، کہکشاں، قاضی حاجات، مہر نبوت، ارشاد فانی، راز و نیاز، محبوب کبریا، بیاض عثمانی ۵ جلد۔انجمن مناظرہ، سلک گہر، تاریخ لطیف، انتخاب اشعار، مجموعہ رباعیات وغیرہ۔تخلص آرام بھی فرماتے تھے۔۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ۹۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔نمونہ کلام

درد ہی کا جسے مزا نہ ہوا ہے برابر وہ دل ہوا نہ ہوا
خواب بھی کیا خیال تھا اُس کا کہ شب غم سے آشنا نہ ہوا
آ ہی جاتا کبھی اس قاتل بیدرد کو رحم بسملوں کو تہ شمشیر پڑا رہنا تھا
یہ دفعتہً اِدھر آیا اُدھر گیا ممتاز بہار کا کوئی جھونکا تھا یہ شباب نہ تھا
شام وصال آتے ہی آتے سحر ہوئی نوبت بھی آ سکی نہ سوال و جواب کی

سہرا شادی نواب حامد علی خاں

رخ انور کو ترے تھا یہی زیبا سہرا چاند چہرہ ہے تو ہے عقد ثریا سہرا
آنکھ حیرت سے ٹھہرتی نہیں نظارے میں سر سے ہے تا بہ قدم نور کا بقعہ سہرا
ساری دنیا میں ہے اس جشن کی دھوم اے ممتاز جمع ہے دیکھنے کو ایک زمانہ سہرا

....

رفتہ رفتہ عشق میں اس درجہ رسوائی ہوئی ہم تماشہ ہو گئے، خلقت تماشائی ہوئی
یہ تڑپ، یہ بے قراری کہتی ہے ممتاز صاف برق بھی ان کی نگہ کی چوٹ ہے کھائی ہوئی

رباعیات

حمد

بھرتا ہوں میں دم اے مرے غفار ترا دل میں بھی، زباں پر بھی ہے اقرار ترا
تو ہے نازاں کہ نام تیرا ہے غفور میں ہوں نازاں کہ ہوں گنہگار ترا

نعت

جس نے شہنشاہِ عرب کو پایا
رب کو پایا، حبیب رب کو پایا
پھر نہیں اور نعمتوں کی حاجت
ان کو پایا تو کہیے سب کو پایا

جوانی

وہ لطف کے دن، وہ شادمانی افسوس
وہ راحت دل، وہ کامرانی افسوس
تو کیا گئی سب کچھ مرے ہاتھوں سے گیا
افسوس افسوس اے جوانی افسوس

شرم گنہ

خجلت زدہ ہوں، امیدوار آیا ہوں
پانی پانی ہوں، اشکبار آیا ہوں
اے ربِّ کریم بخش دے مرے گناہ
میں اپنے کیے سے شرمسار آیا ہوں

عشق ومحبت

الفت میں نہ ہم قیدِ بلا سے چھوٹے
غم کے پنجے میں پڑ کے چھکے چھوٹے
دی جاں ہم نے تو ہوا چھٹکارا
اب چھوٹے تو خیر سستے چھوٹے

جوانی

اس عشق میں خوار زندگانی دیکھی
اپنی آنکھوں کی خوں فشانی دیکھی
بچپن میں تو سرخرو رہے ہم آرامؔ
کالک لگی منہ کو جب جوانی دیکھی

....

کچھ بھی نہ بہارِ زندگانی دیکھی
دیکھی بھی کبھی جو چیز ہم نے فانی دیکھی
کل تھی وہ مگر آج نہیں اے آرامؔ
دیکھا کوئی خواب یا جوانی دیکھی

ہوشؔ

حیدر علی خاں ولد حافظ مبارک علی خانصاحب خلف چہارم محمد علی بخش خانصاحب ۱۳/اپریل ۱۸۹۱ء مطابق ۳/رمضان ۱۳۰۸ھ کو جنرل اعظم الدین خاں مقتول کی رفاقت و اعانت میں شہید ہوئے۔ "حافظ شہید" تاریخ شہادت ہے، مولانا جمال الدین قدس سرۂ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ جناب ہوشؔ اکثر عربی لباس پہنتے تھے، طبابت بھی کرتے تھے، زیادہ قیام بمبئی میں رہتا تھا۔ بیس برس ہوئے کہ ان کا انتقال بمبئی میں ہی ہوا۔ شاعری میں پہلے سید عابد حسین موجؔ رامپوری کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد تسلیمؔ لکھنوی سے استفادہ کیا۔ نمونہ کلام

علی منصور میں، نورِ نبی ہوں، مظہرِ کل ہوں　　خدا کی شان ہوں، گلدستہ توحید کا گل ہوں

مدینے کی جو محفل تھی اور اس محفل میں تھا ساقی　　میں اس ساقی کے شیشے کی صدائے شورِ قلقل ہوں

غزل نواب خلد آشیاں کی پہلی برسی پر

وہ نہ متوالے نہ وہ گل، ہائے کیا تھا۔ کیا ہوا　　بزم مینا ہے نہ قلقل، ہائے کیا، تھا کیا ہوا

اس خزاں کا ہو برا، کیسی بہاریں لٹ گئیں　　گل، نہ نسریں ہے، نہ سنبل، ہائے کیا تھا، کیا ہوا

شورِ قلقل جن کی محفل میں کہ کل تھا ہمنشیں　　آج ان کا ہو گیا قل، ہائے کیا تھا، کیا ہوا

یا بہاریں تھیں یہاں، یا رب مزاریں ہو گئیں　　ہم اسی غم میں گئے گھل، ہائے کیا تھا، کیا ہوا

اب غزل خواں ہے، نہ محفل ہے، نہ ساقی ہے نہ جام　　اور نہ مینا ہے، نہ قلقل، ہائے کیا تھا، کیا ہوا

وہ تماشا اور نہ سولی، وہ نہ منصور اور ہجوم　　اور اناالحق کا نہ وہ غل، ہائے کیا تھا، کیا ہوا

تصوف

میں کہ ایسا مٹا کہ تو نہ رہے　　پھر یہ میں تو کی گفتگو نہ رہے

پہ تجھ کو دکھائے نیرنگی ‏ ‏ رنگ کی جبکہ تجھ میں بو نہ رہے

دو جہاں سے پرے ہے گھر اس کا ‏ ‏ چل وہاں تک کہ چارسو نہ رہے

ہم ہیں ساقی کے دیکھنے والے

نہ رہے ساغر و سبو، نہ رہے

بزم کی بزم اٹھی، ایک بھی ساماں نہ رہا ‏ ‏ دور ساقی نہ رہا، شورِ غزل خواں نہ رہا

لٹ گیا آہ چمن کا چمن آئی جو خزاں ‏ ‏ اڑ گیا بلبلِ نالاں، گلِ خنداں نہ رہا

گل، نہ بلبل، نہ سہی، سرو نہ قمری ہے ‏ ‏ کوئی شبنم کے سوا باغ میں گریاں نہ رہا

تجھ کو اتنے سے تجمل پہ ہے تکیہ غافل ‏ ‏ مسند جم نہ رہی تختِ، سلیماں نہ رہا

اٹھ گئے دیکھتے ہی دیکھتے منہ سب خود بیں ‏ ‏ انجمن میں بجز آئینہ حیراں نہ رہا

غزل

لے اُڑا گل چاک دامانی مری ‏ ‏ آ رہی ہے بوئے عریانی مری

کوئے جاناں میں بھی دل لگتا نہیں ‏ ‏ کس بلا کی ہے پریشانی مری

دوست اپنا دشمن آئینہ ہوا ‏ ‏ اس کو دکھلاتا ہے حیرانی مری

کھا رہا ہوں ٹھوکریں گلیوں میں مَیں ‏ ‏ خوب کی وحشت نے مہمانی مری

بلبل اور منصور، یہ شور و فغاں

لے اُڑی ہے کیا غزل خوانی مری

منظؔر

مولوی مشتاق احمد خانصاحب ولد علی حسین خانصاحب، ۱۸۹۴ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۹ء مدرسہ عالیہ رام پور میں منشی میں کامیاب ہوئے ۱۹۱۲ء میں منشی عالم اور ۱۹۱۵ء

میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ کامل ایڈوانس الہ آباد اور انٹرنس پنجاب کے امتحانات پاس کیے۔ اس کے علاوہ مولوی عبدالرزاق خانصاحب استاذ فارسی سے بھی فارسی کی مزید تعلیم حاصل کی، سپرنٹنڈنٹ رامپور کے دفتر میں ڈھائی سال تک ڈاک کے محرر رہے اس کے دھرم سبھا ہائی اسکول لکھیم پور میں ہیڈ مولوی ہوئے۔ پھر گورنمنٹ ہائی اسکول میں تقرر رہا۔ لکھنؤ، نیلی گال اور پیلی بھیت میں تبادلے ہوتے رہے۔ زیادہ زمانہ انٹر کالج مراد آباد میں بسر ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ اجداد کا مکاں بڑے پیر صاحب کے جھنڈے پر تھا۔ شاعری میں مظہر لکھنوی سے اصلاح لی۔ اکثر نظمیں افسران تعلیم کی آمد پر لکھیں۔ غزل کہنے کا موقع کم ملا۔

نمونہ کلام

جان لی اب اس دلِ بیتاب کی کم مائیگی — خون کی اک بوند وقف نوکِ پیکاں دیکھ کر
ہائے منظر، وہ گناہ بے گناہی کا فریب — دل لرزتا ہے مرا زاہد کو نازاں دیکھ کر
حسن کی شہرت کا باعث عشق کے جذبات ہیں — اس کہانی کا سرا بھی میرے افسانہ میں ہے
ناز تو اک اک اٹھالیں، کاش! یہ معلوم ہو — حسن کی تفریح بس اک ناز اٹھوانے میں ہے
زاہدِ دیں پناہ تو بزم سے دور ہی رہا — رندِ خراب مے پرست محرمِ یار ہوگیا
عقل و دیں دوش پہ ملا کے لدے رہنے دو — درد مل جائے تو ایماں سے پیارا سمجھو

بتقریب ٹریسی ڈے ۱۵/ جنوری ۱۹۳۹ء

علم کی تحصیل کا سودا اگر ہو جائے گا — سب سے اونچا دیکھ لینا اپنا گھر ہو جائے گا
دیس کی قسمت کا تارا بڑھ کے ہوگا آفتاب — باخبر جب علم سے ہر بے خبر ہو جائے گا
علم حاصل کرلیا تو کیمیا کیا چیز ہے — سنگریزہ ہاتھ میں لے گا تو زر ہو جائے گا

دشمنوں کے واسطے ہوگا قلم تیر خدنگ　　　اس کی ہر اک شاخ کا پتہ تبر ہو جائے گا

قصیدہ بتقریب جلسہ تقسیم انعامات ہائی اسکول پیلی بھیت ۱۹۴۴ء

نمودِ صبح سے روشن ہوا جب چرخِ مینائی　　　چلی بادِ صبا مستانہ وش اِک چال اٹھلائی

طلسم خامشی توڑا ہواؤں کے تموج نے　　　نظام دہر میں اِک زندگی کی لہر دوڑائی

نئے سرے سے ہوئی صحنِ چمن کی آئینہ بندی　　　ہر اِک ذرّہ ہوا مصروف نظمِ مجلس آرائی

کلکٹر ہو کے حضرت شہر میں جب آنے والے تھے

تو سن کر نام نامی خوب پیلی بھیت اِترائی

منصورؔ

مولوی منصور شاہ خانصاحب ولد فتح شاہ خانصاحب ۱۴رشوال ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۳راگست ۱۸۰۱ء کو بروز بدھ پیدا ہوئے۔ صوبۂ سرحد کے مشہور بزرگ اخوند درویزہ باباؒ کی اولاد سے ہیں اس لئے یہ خاندان اخوند خیل کہلاتا ہے۔ رامپور میں جہاں موصوف کے اجداد آ کر آباد ہوئے وہ بھی اخوند خیلان کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کے دادا مبارک شاہ خان بریلی کے روساء میں تھے، زمیندار اور صاحب جائیداد تھے، شہری جائیداد کے مالک تھے، ایک عالیشان محل اور دیوان خانہ محلہ کٹرہ مان رائے میں بھی تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء میں مبارک شاہ خان نے انگریزوں کے خلاف بڑی سرگرمی سے حصہ لیا جس کی تفصیل گورنمنٹ گزیٹیر میں موجود ہے، غدر کے بعد عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر ان کے والد دادا اور خاندان کے تمام افراد

کو جو بریلی میں موجود تھے انگریزوں نے پھانسی دے دی تھی اور جائیداد ضبط کرلی تھی، اِس سے
اُن کی والدہ تمام افراد کو لے کر رام پور چلی آئی تھیں اور اپنے آبائی مکان اخوند خیلان میں رہنے
لگی تھیں۔ موصوف کی ابتدائی تعلیم رام پور ہی میں ہوئی تھی۔ فارسی مولوی حسن شاہ خاں اور عربی
کی مکمل تعلیم کئی اساتذہ سے حاصل کی، علوم دینی، تفسیر اور حدیث اور فقہ وغیرہ کی تکمیل مفتی سعد
اللہ، مولوی ارشاد حسین، مولانا عالم علی مراد آباد اور مفتی عبدالقادر خانصاحب سے کی۔

اُن کے والد مرحوم سے سرسید کے گہرے تعلقات تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سرسید
نے ان کو اور دونوں بھائیوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور موصوف کو قانون پڑھنے کا مشورہ دیا۔

وہ کنبہ پرور تھے، غریبوں کی بھی امداد کرتے تھے، چند مساجد بھی تعمیر کرائیں اور عربی
کے طلباء کی ہمیشہ امداد کی۔ ان کی زندگی نہایت دیندارنہ گزری، تہجد کے پابند رہے۔ روزہ نماز
کبھی قضا نہ ہوئے۔ انتہائی مخیّر تھے، طبیعت صلح کامل تھی۔ کبھی حاکم کے سلام کو نہ گئے۔ آخر عمر
تک ورزش کرتے رہے۔ انتہائی خوش مزاج اور سیر چشم تھے، داڑھی بحد شرع، مچھلی کے شکار کے
بھی شوقین تھے۔

اردو فارسی اور ہندی تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ شروع میں منیرؔ شکوہ آبادی سے
اصلاح لی۔ ایرانی شاعر قاآنی نے اُن کے فارسی نوحہ جس کا قافیہ ریز دتھا سن کر کہا تھا کہ یہ غیر
ایرانی کا کلام نہیں ہوسکتا۔ جب کہا گیا کہ یہ ہندی شاعر ہے تو جواب دیا کہ یہ شاعر شیعہ ہے،
جواب ملا نہیں سنّی ہے۔ تو کہا یہ سنی مجھ شیعہ سے بدرجہا بہتر ہے، اُن کی مثنوی فارسی میں ایک
ہزار اشعار کی ہے جس میں پند و نصائح اور تہذیب نفس کے مضامین ایک قصیدہ نعتیہ ہے جس کے
۸۲ شعر ہیں۔ اُن کا مجموعہ کلام کسی بدباطن نے چرا لیا۔ انتقال ۱۴ر جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ
مطابق ۱۱ر اگست ۱۹۳۸ء کو رام پور میں ہوا، آخری سانس تک ہوش و حواس درست تھے۔ زبان

پر اللہ کا نام جاری تھا، تسبیح سینہ پر تھی۔ خاندانی قبرستان اخوند خیلاں میں دفن ہوئے۔

نمونۂ کلام

لحد کو جب اُٹھاؤں سر پہ میں گرمِ فغاں ہوکر
قیامت ہو، زمیں چکر میں آئے آسماں ہوکر
ملے ذاتِ حقیقت سے مٹا کر نقشِ ہستی کو
نشاں مشکل سے پایا ہم نے اس کا بے نشاں ہوکر
کیا ہے یاد بھولے سے مگر اُس شوخ نے مجھ کو
کہ سارے یاس وحسرت دل سے نکلے ہچکیاں ہوکر
ملا ہے عشق میں یہ مرتبہ بعد از فنا مجھ کو
کہ رہتا ہوں حسینوں کی زباں پر داستاں ہوکر
گزر کر کوچہ کاکل سے پایا کعبۂ رخ کو
چلا ہوں حج بیت اللہ کو ہندوستاں ہوکر

....

سہل ہے قتل سے انکار یہاں تو لیکن — حشر میں ہوگا مرے خون کا دعویٰ کس پر
ہو چکے سب ترے جانباز تو پیوندِ زمیں — نگہ قہر ہے اے نرگسِ شہلا کس پر
چشم عیار مژہ شوخ ادا غارت گر — رکھوں الزام جفا اے ستم آرا کس پر

سمجھنا کم نہ کعبے سے مرے اجڑے ہوئے دل کو
جمالِ یار کا مسکن اسی ویران گھر میں ہے

بھلا کیونکر بجھے گی تشنگی پیکانِ قاتل کی
کہیں باقی بھی کوئی خون کا قطرہ جگر میں ہے
تصور رات دن رہتا ہے مجھ کو زُلفِ جاناں کا
دھواں اُٹھتا ہوا سا کچھ مرے فانوس سر میں ہے
بلا سے دار پر کھینچو، نہیں منصورؔ کو پروا
سمایا عشق کا سودا کچھ ایسا اس کے سر میں ہے

تمنا ایک مدت سے ہمیں ہے کوئے بطحا کی
دعا مقبول ہو یارب کہیں اس خستہ شیدا کی

الٰہی خیر ہو پھر دل ہوا بے چین سینے میں
دلا دی یاد کس نے پھر اُسے اُس روئے زیبا کی

نوحہ کے چند اشعار

فلک ہر صبح از چشمِ شفق خوں بر جہاں ریزد
زمیں برروئے خود گرد مصیبت ہر زماں ریزد

بخون وخاک افتادہ ہمہ لختِ دلِ زہرا
چو برگ لالہ نسرین بفرش بوستاں ریزد

حسین ابن علی کز کوہ تر ثابت قدم باشد
نہ جنبد از رہ حق گر بسر کوہ گراں ریزد

بہ وصف حضرت شبیر دارم طرفہ ایجازی
کہ در وقت تکلم لعل و گوہر از نہاں ریزد

یقین دارم ہمیں کز ذکر آلِ پاک پیغمبر
گناہان از سرِ منصور چوں برگِ خزاں ریزد

تاریخی قصیدہ کے چند اشعار جو ۱۶ر جنوری ۱۹۰۷ء کو امیر حبیب اللہ خان والی افغانستان کے روبرو محمڈن کالج علیگڑھ میں خود پڑھ کر سنایا جس کی امیر موصوف اور حاضرین نے بڑی تعریف کی۔

فروغِ صبح ایماں کز ازل اندر جہاں آمد
رسید از چرخ برفرق حبیب اللہ خاں آمد

بیانِ ساقی بدہ ساغر مغنی ساز را سر کن — نوید موسم اُردی بہشت از گلستاں آمد

نیم کز مدحتِ بیجا زبانِ خویش آمدیم — بحمد اللہ طریق من طریق راستاں آمد

ہمیں یک آرزو دارم کہ ازمن یک سخن بشنو — کہ گفتار نکو گوش سروراں آمد

بہ عدل وراہ ایماں جاوداں ثابت قدم باشی — کہ عدل وراہ ایماں لعلِ تاج خسرواں آمد

بعمر پنجروزہ برجہانبانی مکن غرّہ — کرا اندر جہاں ایں عمر و دولت جاوداں آمد

بترس از تلخی آنگہ کہ جانِ بیروں کنی از تن — یقین می داں کہ وقت تلخ سرّ ناگہاں آمد

نہ طمع مال وزر دارم، نہ درفن سخن شہرت
مگر منصورِ غمگیں سر گروہ شاعراں آمد

ہندی اشعار

مرے رب کا چھیلا چھبلیا قرآن کا وعظ سناوت ہے

جب پچھلے پہر کو گاوت ہے، سوتوں کو جگا کے رلاوت ہے

جب اوڑھ کملیا آوت ہے، ایشور کے بھجن وہ گاوت ہے

اور ادم سے ہم کو ملاوت ہے، غیروں سے ہمیں وہ چھڑاوت ہے

امت کا وہ بیڑا کھیوت ہے، زور سے اس کو چلاوت ہے

ہمت سے پھر اس میں مار کے بلی ندیا پار لگاوت ہے

منصورؔ بھی اس کا ہے بندہ، الفت کا گلے میں ہے پھندا

جب حشر کا ہو گورکھ دھندا اس سے ہی امیدِ شفاعت ہے

شمیم سخن

مولوی محمد عبدالحی بدایونی متخلص صفاؔ

۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء

آشفتہؔ

عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں، باشندۂ دہلی، میر محمد مائل اور فرزند علی مضمون سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ آخر عمر میں شاعری ترک کر کے کسبِ باطن میں مشغول ہوئے۔

ناخواندہ مرے خط کو اُلٹا ہی پھرا لایا — قاصد کا گلہ کیا ہے قسمت کا لکھا لایا

نبی کو خاطر اصحاب کیوں نہ ہو منظور — کہ زیب و زینت مجلس ہے چار یاروں سے

عین بے رنگی ہے آشفتہ برنگِ مختلف — آفتِ جاں اس گل رعنا کی رعنائی ہوئی

آشفتہؔ عنبر شاہ خاں رامپوری

نہ پھرا شرمِ نارسائی سے — خط میرا نامہ بر کو کھو بیٹھا

باغِ جہاں میں غنچۂ لالہ کی طرح ہائے
اپنی گرہ میں کچھ نہیں ہمدم سوائے داغ

بیخودی دیکھئے کیا دکھلائے
یارخودمستِ خود آرائی ہے

قاصد میرے نامہ کی عبارت نہیں رنگیں
ملفوف ہیں خط میں دلِ مہجور کے ٹکڑے

آشنا

مولوی عبدالکریم خاں باشندہ کشن نگر کلکتہ منشی فورٹ ولیم کالج۔

جو قطرہ خوں کا میرے دل کے داغ سے ٹپکا
تو گویا شعلۂ تر اِک چراغ سے ٹپکا

ضبطِ نالہ باعثِ چاکِ گریباں ہوگیا
کام یوں دستِ جنوں کا اپنے آساں ہوگیا

اعظم

مولوی اعظم خاں باشندہ دہلی شاگرد شاہ نصیر۔

سوزِ دل از بس طبیبوں سے نہاں رکھتے ہیں ہم شمع
آسا نبض زیرِ استخواں رکھتے ہیں ہم

اکبر

برادر خورد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، شاگرد مومن۔

عدو کے ذکر سے واں ہوش جائے، یاں موت آئے
مزاج اُن سے بھی نازک ہے کس قدر اپنا

قتل کر لاشۂ اکبر کو چھپایا گھر میں
بارے اس نے نہ مجھے جانے دیا اور کہیں

واں رسم اختلاط سے انکار وعذر تھا
یاں جان ہی نکل گئی اپنی نہیں کے ساتھ

امراؔؤ

امراؤ علی خاں متوطن کول ضلع علی گڑھ۔ اکثر اکبرآباد میں رہتے تھے۔ قوت حافظہ بلا کی اور فصاحت زبان رکھتے تھے۔ ستر برس کی عمر پائی۔

دو پھول اگر کسی نے چڑھائے، اڑا دیئے
بادِ صبا سے گورِ غریباں کو لاگ ہے

ایماؔن

شیر محمد خاں، مشاہیر شعرائے دکن، یہ شاعر نازک خیال تھا۔

روا ہے کون سے مشرب میں کہہ اے عشق نا منصف
دلِ پرویز خوش ہو، خاطرِ فرہاد محزوں ہو

مۓ گلگوں کا جس دم بزم میں ساغر جھلکتا ہے
ٹپک پڑتا ہے خونِ دل مرا ایماؔن آنکھوں سے

قدرِ یاقوت نہیں لختِ جگر کے آگے
ابر بھی پانی بھرے دیدہ تر کے آگے

جولاؔں

الف خاں عرف الف شاہ پسر نامدار خاں متوطن بدایوں۔ پاک نیت، درویش سیرت تھے۔ آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ بمقام آگرہ انتقال ہوا۔ محلّہ سرائے بدایوں الف خاں ان ہی کا بسایا ہوا ہے۔ تذکرہ گلستانِ سخن نے بریلوی لکھا ہے۔

ص ۱۱۲ کیا تحریر فرطِ شوق میں جب نام احمد کا

اُٹھاتا ہے گلی سے اس پریرو کی اگر مجھ کو — تو لے چل وحشتِ دل اب جدھر چاہے اُدھر مجھ کو

معشوق پر بھی ہوتی ہے تاثیر عشق کی — چٹکی کلی جو بلبلِ بیدل نے آہ کی

حولاں ہوس جو دل کی تھی بس دل ہی میں رہی — اپنی شبِ وصال تو باتوں میں کٹ گئی

حسینؔ

نواب غلام حسین خان ولد نواب محمد شبر خاں رئیسؔ شاہجہاں پوری، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُن کا کلام مجلس شعراء میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

میں تو تدبیر میں تھا زخمِ جگر کی مصروف — دل بھی پہلو میں تپاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

تشنہ آبِ دم خنجر ہے بسمل اور بھی — دستِ نازک کو ذرا تکلیف قاتل اور بھی

میرے اعمال میں رونے کے قابل — خدائی سالہا مجھ پر ہنسا کی

شررؔ

عبدالغفور خاں ولد محمد نور خاں ابن شاہ محمد خاں رام پور میں پیدا ہوئے۔ بندیل کھنڈ میں بعہدہ تھانیداری او تحصیلداری معمور رہے۔ ساٹھ برس کی عمر پائی ۱۲۸۶ھ میں وفات ہوئی۔

کہوں کیا شب وصل کیونکر کٹی — وہ روٹھا کیا، میں منایا کیا

ذبح ہونا خنجرِ قاتل سے مجھ ناشاد کا — ہو گیا مژدہ رقیبوں کو مبارکباد کا

ہاتھا پائی جب سے کرتا ہے وہ کافر غیر سے
ٹوٹتے ہیں رشک کے مارے ہمارے ہاتھ پاؤں

شعور

محمد سعد اللہ خاں ولد محمد اسلم خان رامپور۔ احمد خاں غفلت کے شاگرد تھے۔ ۱۲۴۰ھ میں وفات پائی۔ صاحب دیوان اردو فارسی۔

گراں ہے اپنی خاطر پر یہ بارِ زندگانی بھی — نہ پوچھو ہم سے تم عالم ہماری ناتوانی کا
کیوں منفعل ہے نرگسِ شہلا چمن میں آج — شاید وہ عشوہ گر اسے آنکھیں دکھا گیا

شہید

مولوی فخر الدین حسین خاں مولد شاہجہاں پور مسکن دہلی۔ علمِ فارسی میں یکتا۔ انشاء پردازی میں لاثانی۔ اخیر عمر میں حج کیا۔ ۱۲۷۱ھ میں وفات بمقام دہلی پائی۔

شب تاریک میں اپنی فروغِ صبح پیدا ہے — تصوّر مجھ کو رہتا ہے جو اس کے رُوئے رخشاں کا
نہ چھوٹے گا کبھی وحشت نے اس کو ایسا اُلجھایا — یہ جسمِ زار اپنا خار ہے صحرا کے داماں کا

شیدا

مولوی محمد حسن خاں ولد محمد یوسف خاں رام پوری ۱۲۲۹ھ میں بہ معیت مولوی سید احمد صاحب جہاد کیا۔ وہاں سے عازمِ بیت اللہ شریف ہوئے۔ وہاں سے وطن واپس آئے اور ۱۲۸۲ھ میں ہجرت کر کے عرب چلے گئے۔ وہیں وفات پائی۔ احمد خاں غفلت کے شاگرد تھے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔

دیکھو اُس فتنہ گر کی عیاری — ہاتھ سے لے کے دل مکر ہی گیا
سوزِ جگر نہیں ہے اغیار کی بدولت — سب کچھ ہمیں ملا ہے سرکار کی بدولت

طلعتؔ

محمد سعادت علی خاں رسالدار ولد محمد سعداللہ خاں متوطن رام پور شاگرد احمد خاں غفلتؔ۔ ۶۲ برس کی عمر پائی۔ ۱۲۷۲ھ میں فوت ہوئے۔

سدا انداز و ناز اس شوخ سے سیکھا ہے حوروں نے
نئی بات اس میں جو پائی ہے پریوں نے اُڑائی ہے
غضب ہے آپ ہی چھیڑو، خفا ہو، آپ ہی اُلٹے
تمہاری بات بھی جو ہے زمانے سے نرالی ہے

غفلتؔ

اخوند احمد خاں ولد برہان الدین خاں متوطن رام پور شاگرد قدرت اللہ شوقؔ لکھنؤ کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے۔ صاحبِ دیوان تھے۔ ۱۲۵۹ھ میں وفات پائی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے حافظ شبراتی کا شاگرد لکھا ہے۔

آیا سوادِ نجد سے جو کوئی اس طرف ‌‌ ‌ میں نے کہا کہ قیس کے کیا کیا نشاں ملے
کہنے لگا کہ لپٹے ہوئے برگِ بید سے ‌ ‌ جوں تارِ عنکبوت کئے استخواں ملے

قمرؔ

محمد قمرالدین خاں اکبر آبادی سررشتہ تعلیم میں ملازم تھے۔ شاگرد منشی محمد مصلح فتحپوری۔

کسی کے عشق سے پابند سب رنج وتعب میں ہیں
ہزاروں آفتیں ہیں ایک غم ہی کو عجب ہم ہیں

کرؔم

کرم خاں مولوی قدرت اللہ شوق کے شاگرد۔ وطن رامپور احمد خاں غفلتؔ کے رشتہ دار ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی۔

آنکھیں ذرا اٹھایئے اوپر کو اے کرؔم
مرتے تو ہیں پر ایک نظر دیکھ لیں اس کو

شب جس جگہ کہ آپ تھے کیا میں وہاں نہ تھا
اے زندگی ہم سے کوئی دم اور وفا کر

یار نے آکے دم نزع جو کی پرسشِ حال
چرخ کج باز کے حق میں مثل سیدھی ہے

بات بھی منہ سے نہ نکلی کہ زباں بند ہوئی
اونٹ اے اونٹ تری کون سی کل سیدھی ہے

لطفؔ

لطف علی خاں ساکن بریلی۔ نعتیہ کلام کہتے تھے۔ صاحب دیوان کسی کے شاگرد نہیں۔

اچھا نہ ہو یارب کبھی بیمارِ محمدؐ
کم ہو نہ کبھی خواہشِ دیدارِ محمدؐ

ہے شوق فزائے دل وجاں روئے محمدؐ
روئے دل وجاں کیوں نہ رہے سوئے محمدؐ

ہے سر میں ازل سے سرِ سودائے محمدؐ
ہے دل میں خیالِ رُخِ زیبائے محمدؐ

مبتلاؔ

مروان علی خاں۔ ولد نواب محمد علی خاں متوطن قدیم غازی پور مقیم بنارس صاحب دیوان وتذکرہ شعرائے اردوو فارسی شاگرد سوداؔ۔

بے طرح جوش پہ ہے دیدۂ گریاں میرا نوحؑ کو آنکھیں دکھانے لگا طوفاں میرا
شیشۂ دل پٹک دیا تونے سنگ دل آہ کیا کیا تونے

مصروفؔ

نواب خاں بہادر خاں ولد نواب ذوالفقار خاں ابن نواب حافظ رحمت خاں صاحب شہید والیٔ روہیل کھنڈ، خوشنویس وذی علم وصاحب دیوان۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور روہیل کھنڈ کے بعض اضلاع پر قابض ہو گئے لیکن انگریزی تسلط کے بعد ۱۸۸۹ء میں بریلی میں پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔

تا حشر اب خیال نہ میرا کرے گا دل تو اس کو مل گیا تو مجھے کیا کرے گا دل

مہرؔ

نواب منصور خاں خلف نواب محبت خاں متوطن لکھنؤ۔ شاگرد قلندر بخش جرأت۔ صاحب دیوان۔

مشکل ہے بہت آگ بجھانی مرے دل کی خورشید قیامت ہے نشانی مرے دل کی
افسانۂ الفت کے سوا شغل نہیں اور دشمن ہے یہ شب ہائے جوانی مرے دل کی

ناصرؔ

سعادت خاں ولد رسالت خان متوطن قصبہ نگینہ ضلع بجنور مرزا محمد حسن مذنب کے شاگرد۔ بمقام لکھنؤ فوت ہوئے۔ ایک تذکرہ اور پانچ دیوان یادگار ہیں۔

غصہ کی شکل یار کو کیوں کر دکھایئے | آئینہ دیجئے دمِ دشنام ہاتھ میں
اے بت ترے خیال کا احسان مند ہوں | پتلی کی طرح اس نے رفاقت کی آنکھ سے

یاسؔ

محمد ضیاء خاں خلف نواب اکبر خاں ابن حافظ رحمت خاں شہدوائی روہیل کھنڈ شاگرد احمد خاں غفلت ۱۲۶۷ھ وفات پائی۔

یاس اب تو سوائے ذاتِ خدا | ہم کسی کے، نہ کوئی اپنا ہے

یکدلؔ

شاگرد و برادر مصطفےٰ خان یکرنگ

نہیں مطلب مجھے کچھ باغباں سے | میں دیوانہ ہوں گل کی رنگ و بو کا

سلسلۂ مطبوعات کتب خانۂ رام پور ۲

اوراقِ گل

۱۹۴۴ء

مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی

اثرؔ

محمد علی خاں قوم پٹھان احمد زئی۔ پیدائش ۱۸۹۲ء ولد مولوی محمد شفیع خاں دادا کا نام شاہ نواز خاں۔

قرآن مجید اور ابتدائی تعلیم والد صاحب سے حاصل کی، فارسی کی متداول درسی کتابیں مولوی عبدالرزاق خاں طالبؔ سے پڑھیں۔ عربی میں زیادہ تر مولوی سلامت اللہ سے تلمذ رہا، منشی فاضل کا امتحان مولوی سید اولاد حسین شاداں بلگرامی سے پڑھ کر پاس کیا۔

درمیانی قد، دہرا جسم، فراخ پیشانی، خوش قطع چہرہ، سرخ و سفید رنگ، اسلامی اخلاق و شائستگی کا نمونہ، صوم و صلوٰۃ کے پابند، اہلِ علم کے قدرداں۔

ابتدائی مشق میں کسی سے مشورہ سخن نہیں لیا۔ ۱۹۳۵ء میں جلیل مانک پوری کو کلام بھیجنا شروع کیا لیکن اصلاح میں تاخیر ہوتی تھی اس لئے ۱۹۴۱ء میں آرزو لکھنوی کو چند غزلیں بھیجیں۔ رام پور اسٹیٹ کونسل کے سپرنٹنڈنٹ آفس میں ملازمت کی مشغولیت کی وجہ سے وقت کم ملتا ہے۔

وہ ان کا حجاب اور نزاکت کے نظارے
آئے وہ شبِ وعدہ تصور کے سہارے

وہ کالی گھٹا اور وہ بڑھتے ہوئے دھارے
زاہد بھی اگر دیکھے تو ساقی کو پکارے

وہ جلوہ گہ ناز، وہ مخمور نگاہیں
اب کیا کہوں یہ لمحے کہاں میں نے گزارے

بے وجہ نہیں حسن کی تنویر میں تابش
لو دیتے ہیں خاکسترِ اُلفت کے شرارے

پھر جام بکف ہوگئی ہر چیز اثرؔ آج
یاد آگئے پھر مدھ بھری آنکھوں کے اشارے

ہٹ گئی خود کہ ہٹالی گئی چہرے سے نقاب
بات کچھ ہو مگر اب تک وہ فراموش نہیں

ہجر ہے نام تصور کے فنا ہونے کا
وصل وہ ہے کہ جہاں ہوش کو بھی ہوش نہیں

کیا چھپائے گی اثرؔ حسن کے جلوے کو نقاب
برق بادل میں نہاں رہ کے بھی روپوش نہیں

ایک دیوانے کی باتوں پر نہ جا
کیا خبر کیا کہا کیا بھول گیا

تم بچ کے کہاں جاؤ گے اربابِ نظر سے
خود نقشِ قدم اُبھریں گے گزرو گے جدھر سے

کیا آبِ رواں، کیا شبِ مہ، کیا گل و لالہ
دُنیا ہے حسیں آج مرے حسنِ نظر سے

آنکھ میں ہو پرکھ تو دیکھ حسن سے پر ہے کل جہاں
تیری نظر کا ہے قصور، جلووں کی کچھ کمی نہیں

عشق میں شکوہ کفر ہے اور ہر التجا حرام
توڑ دے کاسۂ مراد عشق گداگری نہیں

ہجر کی شب گزر گئی پھر بھی اثرؔ یہ حال ہے
سامنے آفتاب ہے اور کہیں روشنی نہیں

اِک سے تکمیلِ نظر، ایک سے توہینِ نظر
حسن در پردہ جدا، حسن سرِ بام کچھ اور

پردہ غفلت کا تری آنکھوں سے جب اٹھ جائے گا
ذرے ذرے سے اثر تو درس عبرت پائے گا

اختر شیرانی

اختر خاں نام۔ ۱۹۰۵ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے، والد صاحب کا نام (حافظ) محمود خاں شیرانی ہے، دادا کا نام محمد اسماعیل خان تھا۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی جو تنقید میں جواب نہیں رکھتے اور جن کے سامنے مستشرقین بھی سرنگوں ہیں ۱۹۱۹ء میں ٹونک سے لاہور چلے گئے۔ یہیں اختر خاں نے ہوش سنبھالا۔ ۱۹۲۱ء اورینٹل کالج میں داخل ہو کر منشی فاضل پاس کیا۔ ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل کی ڈگری لی۔ اس کے بعد رسالہ ہمایوں کی ادارت میں شرکت کی، پھر ''بہارستان'' نکالا لیکن جلد ہی بند کر دیا۔ کچھ عرصہ اورینٹل کالج سے میٹرک میں شریک ہوئے۔ شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا اور لڑکپن سے شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا میں اپنے اتالیق صابر علی شاکر سے مشورہ کیا اس کے بعد ذوقِ خداداد سے مدد لیتے رہے اور دھیرے دھیرے اردو کے عظیم شاعر بن گئے۔

درمیانہ قد، سانولا رنگ، پیشانی کشادہ، چہرہ آفتابی، آواز میں دلکشی، لیکن لحن و ترنم کے ساتھ کلام نہیں پڑھتے۔ طبیعت میں شوخی و رنگینی، مناظرِ فطرت سے دلچسپی۔ شاعری سے متعلق رائے:- ''شعر سے تو بہت سے کام لئے جاسکتے ہیں مگر میرے نزدیک شاعری ایک ایسا جذبہ ہے جو عاشقانہ تنہائیوں کی پیداوار اور ان ہی کے لیے باعث مسرت ہے، میں جذباتی شاعر ہوں اور اس قسم کے اشعار کہنا پسند کرتا ہوں۔''

نمونہ کلام

اس کے عہد شباب میں جینا　　جینے والو تمہیں ہوا کیا ہے
حوریں نیکوں میں بٹ چکی ہوں گی　　باغِ رضواں میں اب دھرا کیا ہے
اِک محبت تھی مٹ چکی یارب　　تیری دُنیا میں اب رکھا کیا ہے

....

جھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی　　ساری دُنیا پر جوانی آ گئی
پارسائی کی جواں مرگی نہ پوچھ　　توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی
ساز دل کو گدگدایا عشق نے　　موت کو لے کر جوانی آ گئی
کر غرقِ مے وجام غمِ گردش ایام　　ہاں اے دلِ ناکام حکیمانہ پیے جا

....

اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں　　مستانہ ہوائیں آتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر　　گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں　　ویسے ہی دلوں کو لبھاتی ہیں

اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی　　سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو　　وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے　　کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں

اودیس سے آنے والے بتا

شاداب و شگفتہ پھولوں سے　　معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں

بازار میں مالن لاتی ہے — پھولوں کے گندھے ہار اب کہ نہیں
اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں — نوخیز خریدار اب کہ نہیں

اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر — پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر — ماتھے پر گاگر دھرتی ہیں
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے — ہنستے ہوئے چہلیں کرتی ہیں

اودیس سے آنے والے بتا

کیا آم کے اونچے پیڑوں پر — اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں؟
شاخوں کے حریری پردوں میں — نغموں کے خزانے کھولتے ہیں
ساون کے رسیلے گیتوں سے — تالاب میں امرت گھولتے ہیں

اودیس سے آنے والے بتا

ساغر نظامی

محمد یار خاں ولد احمد یار خاں مہمند یوسف زئی پٹھان۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۰۵ء علی گڑھ بالائے قلعہ پیدا ہوئے۔ خاندان کابل سے آیا۔ مورث اعلیٰ سردار شہباز خاں نواب جھجر کی فوج کے سپہ سالار تھے۔ عربی و فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی، انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ میں نویں تک پڑھی۔

شاعری میں استادی و شاگردی کے قائل نہیں۔ ۹ برس کی عمر سے شعر کا ذوق پیدا ہوا۔ ۱۳ برس کی عمر میں مشاعروں میں شریک ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے دوش بدوش شاعری نے بھی

جنم لیا۔ روایتی طور پر ابتدا میں کلام سیماب اکبر آبادی کو دکھایا۔ مزاج میں ظرافت اور شوخی ترنم سے پڑھتے ہیں۔

نمونۂ کلام

فغانِ شمی نغمۂ صبح گاہی فریب مناجات ہے اور کیا ہے

وہ ملاحتیں، وہ صباحتیں، وہ لطافتیں، وہ نزاکتیں
وہ نظر میں جب سے سمائے ہیں مجھے آنکھ اٹھانا بھی بار ہے
وہ جدھر مچل کے گزر گئے ہیں، فضائیں غرقِ بہار ہیں
وہ جہاں جھجک کے ٹھہر گئے ہیں وہیں ہجومِ بہار ہے
تو ہے جانِ گل، تو میانِ گل، تو مکینِ گل، تو مکانِ گل
ترے دَم قدم سے ہے گلستاں، ترے دَم قدم سے بہار ہے

ہم تم

وہ دور یاد ہے جب بے قرار تھے ہم تم
بہ کارِ دل ہمہ تن انتظار تھے ہم تم
وہ وقت یاد ہے جب نغمہ بار تھے ہم تم
وہ عہد یاد ہے جب کامگار تھے ہم تم
وفا نصیب محبت شعار تھے ہم تم
کلی کلی چمنستاں کو ناز تھا جس پر
روش روش پہ گلستاں کو ناز تھا جس پر
چمن کہاں کا بیاباں کو ناز تھا جس پر
جہاں میں روحِ بہاراں کو ناز تھا جس پر
نسیمِ گل کی قسم ! وہ بہار تھے ہم تم
جو میں تھا بلبل گلشن تو تم گلِ رنگیں
جو میں تھا مہر تو تم تھیں فروغِ ماہِ مبیں
ہمارے پاؤں پہ جھکتی تھی ساعتوں کی جبیں
جو میں تھا صبحِ منور تو تم شبِ زریں
جہانِ عشق کے لیل و نہار تھے ہم تم

نامہ مظفری محمد مظفر حسین خاں صاحب

تاریخ شاہ آباد (ضلع ہردوئی)

حاجی محمد حسین خان

حاجی محمد حسین خان صاحب اختیار پوری درویش سیرت اور خدا رسیدہ بزرگ تھے ریاضت اور خدا پرستی کی طرف میلان طبیعت تھا۔ پہلے حافظ[1] امام علی خانصاحب اللہ پوری کے مرید ہوئے اور ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد سید شمشیر علی عرف مینڈو شاہ کے طالب ہوئے اور شیخ کامل کی تعلیم کے مطابق سخت مجاہدہ کیا، تقریباً دس بارہ برس عالم تجرد میں ریاضت کی۔ کثرتِ ذکر سے ان کا قلب نور الٰہی سے روشن ہو گیا، اُن کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی اور اِدھر اُدھر سے لوگ اُن کی زیارت کے لئے ٹوٹ پڑے۔ ایک باغ بھی لگایا اور اس کے بلند

---

[1] حافظ صاحب زاہد اور باخدا انسان تھے، جمعیت علی خانصاحب اللہ پوری کے فرزند تھے۔

ٹیلہ پر مکان بنایا وہیں اُن کا قیام رہتا اور یادِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ باغ کا نام معلّٰی باغ رکھا اور ایک خوبصورت مسجد بنوائی۔ یہاں اہل اللہ کا جمگھٹ رہتا تھا۔ اس جگہ کی بزرگی کے لئے لوگوں کا بیان ہے کہ اس پر بزرگان دین کے انوار دکھائی دیتے ہیں۔ نواب مقصود علی خاں اور محمد علی خانصاحب نے بیان کیا۔ ''ہم لوگ موجود تھے، سید شمشیر علی صاحب عرف مینڈو شاہ صاحب باغ کی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے، رات کے ۸ یا ۹ بجے ہوں گے کہ تمام باغ دلآویز خوشبو سے مہکنے لگا۔ شاہ جو روشن ضمیر اور صاحبِ کشف تھے باادب کھڑے ہو گئے اور کوٹھے کے پوربی دروازے پر کھڑے ہو کر کچھ عرض کرتے رہے، اسی وقت بازار سے شیرینی منگائی اور فاتحہ کرائی۔ ہم لوگوں نے دریافت کیا تو شاہ صاحب نے کہا سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے انوار نمودار ہوئے تھے، حضور کی سواری مع لشکر ادھر آ نکلی تھی، حق تعالیٰ نے امام عالی مقام کو عالم ارواح و برزخ میں یہ درجہ بخشا ہے کہ آپ طبقاتِ ارض و سما کی سیر کرتے ہیں۔ اکثر صاحب باطن فقیر اُن کے پاس آ کر ٹھہرتے۔ خانصاحب کی درویشیت پر تشرع کا رنگ تھا، کسی کو مرید نہیں کیا، آخر وقت میں نکاح بھی کیا۔ پہلی بیوی حافظ یار خاں رئیس سید بخیل مرحوم کی بہن تھیں ان کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی مگر جوانی میں انتقال کر گئی اس کے بعد زوجہ کا بھی انتقال ہو گیا تو دوسرا نکاح کیا جن سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک نوجوان انتقال کر گیا۔ دوسرے بیٹے جعفر حسین خاں صاحب تھے۔ خانصاحب سرخ و سفید خوش رو انسان تھے۔ ۲ ررمضان ۱۳۱۷ھ یوم دوشنبہ وفات پائی۔ کلام کا زیادہ حصہ ضائع ہو گیا۔

نمونۂ کلام

درِ جاناں کے تصور میں کسی سے نہ رکوں	پھاند جاؤں جو اگر راہ میں دیوار پڑے
مرضِ عشق سے ہو جائے سخاوت کو شفا	اس کی تبرید میں گر شربتِ دیدار پڑے

نعت

زنجیرِ دل از حلقۂ گیسوئے محمدؐ
سجدہ گہ کونہیں ہیں ابروے محمدؐ
زیبا قدِ موزوں ہے وہ دلجوے محمدؐ
عالم ہمہ سودازدۂ موئے محمد
شیریں کی طلب ہو تجھے فرہاد مبارک
مجنوں ہی کو لیلیٰ کی رہے یاد مبارک
قمری ہو چمن میں تجھے شمشاد مبارک
زاہد بتو فردوس بریں باد مبارک
مائیم و تمنائے سر کوئے محمدؐ

منصب

مولوی محمد منصب علی خانصاحب سلیمانیؔ ولد احمد خانصاحب طبیعت سنجیدہ تھی، نہایت ذکی۔ انشاء پردازی اور موزوں طبعی دونوں قابلیتوں سے بہرہ ور تھے۔ اپنے ہم عصروں میں لائق بزرگوار اور برادر حافظ غلام علی خاں سرکار لکھنؤ میں ملازم تھے اس لئے دونوں جگہ لکھنؤ اور شاہ آباد میں تعلیم وتربیت پائی۔ ابتدائی کتابیں شاہ آباد میں مرزا جعفر علی بیگ سے پڑھیں، لکھنؤ میں مولوی امیر صاحب سے تلمذ کا شرف حاصل رہا۔ جوانی میں عربی مولوی سید سخاوت حسین صاحب بسوانی سے جو عالم درویش اور مولانا عالم علی مراد آبادی سے پڑھیں۔ خوش الحانی اور زود فہمی کے جوہر بھی پائے جاتے تھے، جسمانی طور پر مضبوط، خوبصورت اور موزوں اندام تھے۔ فقرا اور علماء کی صحبت ابتدا سے ہی پسند تھی۔ انیسؔ کے کلام سے بہت لگاؤ تھا، اکثر لکھنؤ میں علماء شعراء اور مشاہیر کی خدمت میں حاضر ہوتے جس کی وجہ سے علمی مذاق کے ساتھ ساتھ آرائش پسندی طبیعت میں پیدا ہوگئی تھی۔

ظاہری علوم کے ساتھ خدا پرستی کا جذبہ موجود تھا۔ شمشیر علی صاحب عرف مینڈو شاہ کے مرید تھے۔ تصوف کی کتابیں مطالعہ میں رہتیں۔ برادری کے جھگڑے وہ ہی طے کرتے، میلاد شریف بہت اچھا پڑھتے تھے، آواز میں درد اور سوز تھا۔

اُن کا کلام نہایت فصیح اور بندش بہت اچھی ہے، زیادہ تر غزلیں مثنویاں اور مناجاتیں وغیرہ کہی ہیں لیکن بیاض کی صورت میں جمع نہ کرنے کی وجہ سے ضائع ہوگئیں۔

مظفر سال جستم گفت ہاتف　　　بجنت روفت دانائے زمانہ

۱۳۰۴ھ سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

نمونۂ کلام

چمک دیکھی ہے جب سے ابروئے شمشیرِ قاتل کی
مری آنکھوں میں صورت پھر رہی ہے مرغِ بسمل کی
کہا ہاروت اور ماروت نے زہرہ سے الفت تھی
مہینوں سیر ہم کرتے رہے ہیں چاہِ بابل کی
سیاہی مٹ کے پہنچی روشنی چاروں طرف دل کے
حقیقت کھل گئی جب آب و آتش باد اور گل کی
طبیعت شب کو بہلی داستانِ حسن سے اپنی
چکوروں سے سنی ہم نے کہانی ماہِ کامل کی
فراقِ یار میں نغمہ نہیں اِک شورِ ماتم ہے
جگر میں چٹکیاں لیتی ہیں منقاریں عنادل کی

غزل خوانی کا چرچا حسنِ خوباں کا تماشہ ہے
بہم ہیں صحبتیں کیا ان دنوں یارانِ یک دل کی
علاقہ حور سے اس کو، نہ پریوں سے تعلق ہے
تمہارے عشق میں منصب نے یہ جاگیر حاصل کی

یہ دونوں نورِ چشمِ محمدؐ ہیں بے مثال شبر کا ہے نظیر، نہ شبیر کا جواب

مناجات

خداوندا کرم اتنا تو کر دے مرا دل شوق سے اپنے تو بھر دے
کہ تیرے عشق سے مسرور ہو جائے مرا دل نور سے معمور ہو جائے
وہ دل اپنے کرم سے تو عطا کر بھرا ہو عشق سے تیرے سراسر
مرے دل میں تپش وہ عشق کی دے کہ جس سے جل اٹھیں میرے رگ و پے
الٰہی شہرِ دل کو کر تو آباد محبت خانۂ عشق ستم زاد
دوئی کے حرف کو دل سے مٹا دے تو اپنا جام وحدت کا پلا دے
ترا جذبہ عنایت کا جو آئے تو کیا ہم بود کا نابود ہو جائے
تو گر چاہے تو بد کو نیک کر دے مرے دل کو صفائی کا اثر دے
طفیلِ مصطفےٰ میرے خدایا تو کیجو خاتمہ بالخیر میرا

دوست کی جدائی اور نیرنگیٔ زمانہ کی تصویر کشی

کچھ عجب کارگاہِ عالم ہے شادی و غم جہانِ توأم ہے
چمنِ دہر کی ہے ایسی بہار گل کے پہلو میں ہیں چھپے سو خار

کسی گلشن میں آگئی جو بہار
ساتھ اس کے خزاں بھی ہے تیار

مثلِ گل ایک دم جو کوئی ہنسا
غم و آفت میں سو طرح سے پھنسا

ہے جو رنگِ جہاں طلسمِ مثال
ساری باتیں ہیں اس کی خواب وخیال

رشک گلشن تھا کلبۂ احزاں
تیرے قدموں سے اے گلِ خنداں

چین تھا دل کو اور تسلی تھی
دن بہ دن عیش کی ترقی تھی

ایسی بدنا گہاں ہوا آئی
چمنِ وصل میں خزاں لائی

ایسے جھونکے سمومِ غم کے چلے
خشک جس سے نہال دل کے ہوئے

تھا جو نخلِ مراد خرم وشاد
صرصرِ غم نے کردیا برباد

جس سے راقم کی زندگانی تھی
عیش تھا، دل کی کامرانی تھی

مجھ کو اس گل سے کردیا معمور
جس سے رہتا تھا دل مرا مسرور

ساری رونق گئی نگار کے ساتھ
رنگ جاتا رہا بہار کے ساتھ

پاؤں وحشت نے ایسے پھیلائے
ہاتھ سودے نے اپنے دکھلائے

لشکرِ غم جو آکے ٹوٹ پڑا
سب متاعِ خرد کو لوٹ لیا

ایسا فرقت نے بے قرار کیا
جیب و داماں کو تار تار کیا

کوئی مونس سوائے یاس نہیں
جز غم و درد آس پاس نہیں

گردشِ آسماں ستاتی ہے
جان میری لبوں پہ آتی ہے

ایک مثنوی جو پیرومرشد کے حضور میں پیش کی اور جوان کی نظر میں مقبول بھی ہوئی اس کے چند اشعار دیئے جاتے ہیں۔

ہے کہاں ساقی سراپا نور جلد دے ساغرِ شرابِ طہور
ایسا دے ایک جامِ لاثانی جس کے پینے سے دل ہو نورانی
ہے حبیب آپ، آپ ہی محبوب آپ ہی طالب، آپ ہی مطلوب
چشمِ رحمت سے جو کرے وہ نظر صورتِ موم نرم ہو پتھر
دیکھ لے چشمِ قہر سے جس کو ایک دم میں وہ خاک جل کر ہو
زیستِ انساں کی پائیدار نہیں زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
منصبؔ خستہ دل کو صحت ہو الٰہی اللہ کی عنایت ہو

محمد مظفر حسین

محمد مظفر حسین خانصاحب سلیمانی ولد مولوی منشی منصبؔ علی خانصاحب۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، باپ کی توجہ خاص سے جلد ہی خطوط لکھنے پڑھنے کی استعداد پیدا ہوگئی۔ دس بارہ سال کی عمر میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، مولوی حیدر علی صاحب منشی عوض علی صاحب اور مولوی سبط حسن صاحب وغیرہ سے درسی کتب پڑھیں، علم طب کی تحصیل حکیم معالج الدولہ حاجی سید فرزند علی صاحب افسر الاطبا سے کی اور ساتھ ہی نظم ونثر کی اصلاح بھی اُن ہی سے لی۔ ابھی فن کی طب کی تکمیل نہ ہوئی تھی کہ استاد کا انتقال ہوگیا۔ پھر طب کی طرف طبیعت نہ گئی، بیکاری اور تنہائی میں دل کو وحشت ہوئی، بزرگان دین کے مزارات کو اس کا علاج جان کران پر حاضری دی لیکن جلد ہی مخلصوں کے مشورہ سے نکاح کرنا پڑا اور حالت میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔ اب اہل وعیال کی خبر گیری کرنا پڑی اور ساتھ ہی تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا۔
تصنیفات: نامۂ مظفری، حیاتِ مسیح، گنجینۂ سلیمانی، حیاتِ نصرت وغیرہ۔

موصوف کی بیٹی جو نہایت ذہین اور خوبصورت تھی آٹھ دس یوم بیمار رہ کر عالم نوجوانی میں انتقال کر گئی۔ اس کا غم قلب پر ناسور بن گیا، اس کی یاد میں موصوف نے قطعات تاریخی کہے ہیں۔ بیٹی کا نام عائشہ تھا۔

جو تھی ذی ہوش پیاری ایک میری عائشہ بیٹی
یکا یک اس نے سوئے جنت الفردوس رحلت کی
ملی وہ خاک میں ارمان سارے ہو گئے مٹی
بلائیں لیتی ہے اب دِل کی حسرت جا کے تربت کی
ٹھہرتے ہی نہیں آنکھوں میں آنسو فرطِ گریہ سے
ڈبوتی ہیں مجھے خود موجیں میرے جوشِ رقت کی
جو ڈھونڈھا اے مظفؔر سال رحلت یہ ندا آئی
کہ پائی عائشہ نے نقد دولت عیش جنت کی

۱۹۱۶ء

نوردیدہ عائشہ صد حیف از آغوش شد
درنگاہم جملہ عالم تیرہ وتاریک گشت
بود در فکرم مظفؔر سال تاریخ وفات
ہاتف غیبی بمن گفتہ گلے خوش رنگ رفت

۱۹۱۶ء

غزل

نہیں سنتا نصیحت مجمع عشاق میں کوئی
کہو ناصح سے حضرت آپ کیوں بیکار بیٹھے ہیں
پئے دیدار جب آئے تمہارے در پہ یہ دیکھا
ادھر دو چار بیٹھے ہیں، ادھر دو چار بیٹھے ہیں

اگر وہ اپنے مقابل کی جستجو کرتے
اٹھا کے آئینہ ہم ان کے روبرو کرتے
مزہ تو جب تھا گریباں کے چاک ہونے کا
کہ جن کے عشق میں پھاڑا تھا وہ رفو کرتے
جھلک جو دختر رز کی انھیں نظر آتی
تو وعظ چھوڑ کے واعظ سبو سبو کرتے

....

دغا دینا تمہارا کام ہے میرا دُعا دینا
تم ہی انصاف سے کہہ دو ذرا اچھا ہے کیا دینا
لڑاتے تم ہو آنکھیں، غیر سب آپس میں لڑتے ہیں
تمہاری بزم کا ہے مشغلہ لڑنا لڑا دینا
یہ کیا انسانیت ہے، وضعداری سیکھئے صاحب
نہیں اچھا بڑھا کر رسم اُلفت کو گھٹا دینا
سماں وہ باندھ دے ابرِ کرم گلزارِ عالم میں
کہے زاہد مجھے بھی جام اِک بہرِ خدا دینا

....

دھیان میں آتی نہیں ہستیٔ دُنیا کچھ بھی
نقش بر آب ہے یہ عالمِ امکاں دل میں
زندہ کر کے جو نکالو تو مسیحا جانوں
میرے ارمانوں کا ہے گنجِ شہیداں دل میں
ٹکڑے ٹکڑے دل کے کرتی ہے تڑپنے کی ادا
رنگ مقتولِ جفا میں بسمل و قاتل کا ہے
میں چاہتا ہوں اور کسی کو، انھیں ہے شک
وہ آجکل ہیں یار مرے رازدار کے
واعظ گنہگار کو تم گالیاں نہ دو
قائل نہیں ہو رحمت پروردگار کے

خم کدۂ سخن

عرشیؔ

مولوی علی حسین خانصاحب رام پور میں پیدا ہوئے۔مکان سرائے دروازہ پرانے بھینس خانہ کے قریب تھا، عربی اور فارسی کی تعلیم مختلف اساتذہ سے پائی، علمی قابلیت بدرجہ اتم موجود تھی، درس وتدریس ذریعہ معاش تھا، شہر کے مختلف اسکولوں میں تعینات رہے۔فن شعر میں اپنے چچا ولی محمد خاں بسملؔ کے شاگرد تھے۔۱۹۳۵ء تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ بانکے میاں کے مزار کے قریب رام پور میں دفن ہوئے۔ لمبا قد، قوی الجثہ، رنگ گورا، چہرہ گول، آنکھیں بڑی، داڑھی لمبی، لباس میں گول ٹوپی، ڈھیلے پائچوں کا پائجامہ، اچکن یا انگرکھا پہنتے

تھے۔ نیک، خوش اخلاق، پابند وضع اور احکام شریعت کے پابند تھے۔

نمونۂ کلام ۱۹۹۸ء

یارب ہے کس حسیں کی یہ شوخی زبان پر
غش برقِ طور کو ہے جو میرے بیان پر

اللہ رے رعب اس بتِ نازک مزاج کا
مطلب کی بات رُک گئی آ کر زبان پر

جب تجھ سا آفتاب ہو تاجِ سرِ جہاں
کیونکر نہ ہو دماغ زمیں آسمان پر

عرشیؔ فراقِ یار کا کچھ ماجرا نہ پوچھ
گرتی ہے برق روز دل ناتوان پر

....

یہ کیا ہے کہ مرغ چمن چیختے ہیں
سروں پر زمیں سی اٹھاتی ہے کیسی

عرشؔ

حکیم محمد نزاکت علی خاں ولد حکیم سبحان علی خاں خلف حکیم حیدر علی خاں ابن عبید شاہ خانصاحب قوم پٹھان ۷ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو محلّہ کڑہ جلال الدین خان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے مورث اعلیٰ جہانگیر خاں صوبہ سرحد سے دہلی میں رکتے ہوئے رام پور کے محلّہ فقیر آخوں خیلاں میں سکونت پذیر ہوئے اور ریاست رام پور میں سواروں کے رسالدار کے عہدہ پر فائزہ ہوئے۔ عبید شاہ خاں صاحب کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ موصوف کے مریدین کا حلقہ دہلی اور نواح دہلی کے خواص میں رہا۔ بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کے خاندان کے مرشد ہوئے۔

بڑے صاحب کشف و کرامات تھے۔ سات بار حج کیا۔ جب جلال الدین خانصاحب مالک محلّہ کڑہ میاں امیر شاہ صاحب اُن کے مرید ہوئے تو عبید شاہ خانصاحب رامپور میں مقیم

ہو گئے، جناب عرش نے مدرسۂ عالیہ رام پور میں چوتھے درجہ تک عربی کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد طب کی تعلیم اپنے والد اور حکیم محمد نبی رامپوری سے حاصل کی۔ تفسیر قرآن مجید عبدالوہاب خاں محدث و مہتمم مدرسہ جامعہ المعارف سے پڑھی۔ اُن کا ذریعہ معاش طبابت تھا۔ اُن کی ایک قلمی تصنیف ''امراضِ نسواں'' ہے۔

فن شعر میں ابتدا میں رازؔ رامپوری کے شاگرد ہوئے، چند غزلیں سید اولاد حسین شاعرؔ لکھنوی کو دکھائیں، اخبارات و رسائل میں مضامین بھی شائع ہوئے۔

دراز قد، چھریرا بدن، رنگ گورا، داڑھی صاف، چہرے پر چیچک کے ہلکے نشان، بااخلاق و مہذب۔

نمونہ کلام

ربط نہ تھا کچھ ان سے جب دل کو تھی درد کی طلب
درد بجائے دل ہے اب، دل کا کہیں نشاں نہیں

رہینِ منتِ ساقی و جام کیا ہوگا
وہ بادہ خوار جو مست مئے طہور ہوا

بلند تھی مری پرواز ہم صفیروں سے
مگر قفس سے گلستاں کا راستہ نہ ملا

چٹکتی کلیوں میں بو آئی تیری زلفوں کی
مہکتے پھولوں میں کوئی ترے سوا نہ ملا

مزاج داں بھی مجھ کو چارہ گر بھی ملے
بقدرِ وسعتِ دل کوئی آشنا نہ ملا

فکر کعبے کی، نہ کچھ خوف ہے بتخانے کا
تجھ کو پوجے یہی ایمان ہے دیوانے کا

کہنہ میکش کھڑے منہ تکتے ہیں میخانے میں
مے بھری جاتی ہے اغیار کے پیمانے میں

ساغرِ لالہ گرا، خونِ کبوتر اُچھلا
ان نگاہوں سے جو اتری مرے پیمانے میں

نہ اب زبان میں طاقت نہ اب گلے دل کے
مجھے تو نیند سی آنے لگی گلے مل کے

اسے جنون ہی سمجھو مگر میں کیا کرتا — وہ عقل جس سے نہ سلجھے معاملے دل کے
یہ عرش صاف بتاتی ہے جنبشِ چلمن — بچے تو آج ہی دیکھوگے رنگ محفل کے
میں گلشن وصحرا تو بہت دیکھ چکا ہوں — جس سے مجھے تسکیں ہو وہ دنیا بھی کہیں ہے
احباب سے وہ رنج اٹھائے ہیں کہ اے عرش — اب شکوۂ بے مہری اعداء بھی نہیں ہے

ہے جوشِ جوانی کے باعث عشاق میں روشن نام ان کا
درشن کو آئے دل والے، سڑکوں پہ ہے جلوۂ عام ان کا
دبتی ہے اقلیت تو دبے مٹتی ہے اگر ملّت تو مٹے
گر نسل کشی ہوتی ہے تو ہو عیاشی میں ہے نام ان کا

شبنم کا قطرہ جس سے کہ موتی نہ بن سکا — ایسی ہوائے صحبتِ گل کو سلام ہے
اے عرش لغزشوں سے ہے نسبت شباب کو — ورنہ حریمِ قدس میں دل کا مقام ہے

یورپ زدہ لیڈروں سے خطاب

محفلوں میں ماہرِ فنکاریِ جوشِ کلام — خلوتوں میں خوگرِ شغلِ مے ومینا وجام
ہے نماز ان کے لئے بے وقت کی اک راگنی — غیر معیاری ہے ان کی بزم میں مذہب کا نام
فرض روزہ ننگے بھوکے بے وقوفوں کے لئے — ان کے در تک آ نہیں سکتا کبھی ماہِ صیام
زائرِ لندن ہیں، امریکہ کی حسرت دل میں ہے — زحمتِ حج ان کی نظروں میں ہے اِک سودائے خام

مزدور کا حصہ خانقاہوں میں

مزدور نے گزارش کی ایک پیشوا سے — روشن ترے قدم سے ہیں اتقا کے جادے
سرمایہ دار ہم پر بیگار ڈالتے ہیں — اے رہنمائے ملّت اس رسم کو مٹا دے
حضرت نے مسکرا کر اول تو اس کو دیکھا — پھر کام یاد آیا بدلے وہی ارادے

داڑھی پہ ہاتھ پھیرا اور رُخ بدل کے بولے　　　　چل میرے ڈنگروں کا چھپر تو چل کے چھادے

خردم تھی بزم شواہد میں گم کہ چیخ اُٹھے
یہی زمان و مکاں لا الہ الا اللہ

حسنؔ

مولوی حسن علی خاں ولد سید محمد خاں، قوم پٹھان، ۱۲۴۲ھ میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ فارسی شیخ احمد علی احمد سے پڑھی، عربی دوسرے اساتذہ سے۔ متقی پرہیزگار اور شب بیدار تھے۔ محلہ بنگلہ آزاد خاں میں مکان تھا، معلمی ذریعہ معاش تھا، شہر میں شاگردوں کی تعداد کافی تھی، کبھی کبھی فارسی نظم بھی لکھتے تھے۔ شاگردوں سے تحفے قبول کرنے میں تکلف رہتا تھا۔ عیدین کو اپنی طرف سے شاگردوں کو تحائف دیتے تھے۔ آخر عمر میں درس بند کر دیا تھا۔ انتقال ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیان ہوا۔

تہنیت بواپسی نواب کلب علی خاں از سفر حجاز

نداز ہاتف غیبم بگوش جان آمد　　　　کہ از حجاز شہنشاہ انس وجان آمد
بدل خیال نمودم کہ کیست این یارب　　　　کہ بہر اوہمہ رحمت ز آسمان آمد

اشرفؔ

اشرف علی خاں نعت گو۔ فن شعر میں سید عابد حسین اوجؔ رامپوری کے شاگرد۔

خواہاں نہیں عالم میں کسی رشکِ قمر کے　　　　ہم دل سے ہیں مشتاق شہِ جن و بشر کے
دوری کی نہیں تاب، مدینے میں بلا لو　　　　مشتاق ہیں ہم بھی شہ دیں ایک نظر کے

خاکِ رہِ طیبہ سے یہ آنکھیں ہوئیں روشن
نکلے کبھی ارمان نہ اس خستہ جگر کے

اشرف یہی ارمان ہے ایسا کوئی دن ہو
ہم شاد ہوں گلزارِ مدینہ میں ٹھہر کے

مخلوق نہ تھی احمدِ مختار سے پہلے
بس ذات احد تھے شہ ابرار سے پہلے

معراج کی شب بخششِ امت کا نبی نے
اقرار لیا رحمتِ غفار سے پہلے

ہر چند میں عاصی تھا مگر لطفِ نبی سے
جنت میں گیا زاہدِ دیندار سے پہلے

شعلۂ طور کا جلوہ نظر آئے اس کو
خواب میں دیکھے جو محبوبِ خدا کی صورت

یہی ارمان ہے اشرف کہ خدا ہو جاؤں
قبر میں دیکھوں تو محبوب خدا کی صورت

بے سر و ساماں ہیں ہم طیبہ کو جا سکتے نہیں
کیا کریں تقدیر کا لکھا مٹا سکتے نہیں

دھیان ہے جب سے رخِ پُر نور احمد کا مجھے
یہ حسینانِ جہاں دل میں سما سکتے نہیں

عزیز

محمد عزیز احمد خانصاحب ولد اثر علی خاں صاحب ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی وغیرہ میں دستگاہ تھی، ابتدائی عمر سے جذبۂ فقر پیدا ہوا اور آخر تک قائم رہا۔ آغا مرزا شاغل برادر مرزا داغ کے شاگرد تھے۔ شوخ طبع تھے۔ میانہ قد، سرخ و سفید رنگ کتابی چہرہ، سر کے بال لمبے، داڑھی درمیانہ، چھریرا بدن، دانت چمکدار اور خوبصورت، آخری عمر میں شاعری کو ترک کر دیا، جوان لڑکیوں کی موت نے کمر توڑ دی، دو تین مہینہ بیمار رہ کر ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ میں وفات پائی۔ مسجد حلقہ والی رام پور میں دفن ہوئے۔ زیادہ تر کلام ضائع ہو گیا۔

نمونۂ کلام

اس کے ابرو کی صفت کی تو صلہ یہ پایا
رکھ لیا قاتلِ بے رحم نے تلواروں پر

وصل میں جب حیا کرے کوئی
پھر نہ چھیڑے تو کیا کرے کوئی

اس کے کوچہ سے نکل کر نہ پریشاں ہوں گے
خاک بھی ہوں گے تو خاکِ درِ جاناں ہوں گے

تجھ سے مایوس نہ ہم اے غمِ جاناں ہوں گے
کشتۂ یاس نہ ہوں، کشتۂ حرماں ہوں گے

آپ اس روز کے بیمار کو لیتے جائیں
نہ یہ دل ہوگا، نہ ہم طالبِ درماں ہوں گے

ہم بھی دیکھیں گے شبِ قدر کا جلوہ دن میں
تیرے گیسو جو ترے رُخ پہ پریشاں ہوں گے

نہ لگایا مرے دل پر کوئی ناوک تم نے
اس سے ثابت ہے کہ ٹوٹے ہوئے پیکاں ہوں گے

نہ ہوا اور نہ ہوا ان سا طرحدار عزیزؔ
ہاں اگر ہوں گے تو کچھ یوسفِ کنعاں ہوں گے

عالیؔ

حافظ فیروز شاہ خانصاحب ابن بہادر شاہ خانصاحب خلف جان شاہ خانصاحب ۱۳۰۸ھ میں پیدا ہوئے، اُن کے پردادا ریاست رام پور میں آکر قیام پذیر ہوئے، سپاہی آدمی تھے، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا، فارسی میں منشی فاضل تک تعلیم پائی۔ شعرو سخن سے بھی کافی ذوق تھا۔ صوفی منش انسان تھے، مکان گھیر صلابت خاں میں ہے۔ مذاق سخن صوفیانہ ہے۔ قدمیانہ چھریرا بدن، رنگ گورا، آنکھیں کنجی، داڑھی بحد شرع، متبع شریعت۔

نمونۂ کلام

عقدہ سخن اقرب کھل گیا حاصلِ سخن
پہلو میں یار آگیا بے خبر آنکھ مل کے دیکھ

طالبِ وصلِ سرمدی راز نہیں ہے گفتنی
سوزِ فراقِ یار میں مثلِ چراغ جل کے دیکھ

عمر تمام ہوگئی صرف نمود بندگی

وصل کی رات تو بیتاب نہ کر یار بہت
آؤ لگ جاؤ گلے ہو چکی تکرار بہت

جلوۂ یار ٹھہر اور سرِ طور ذرا
منتظر اور بھی ہیں طالبِ دیدار بہت

صرف منصور پہ موقوف نہیں جانبازی
ہیں سلامت ابھی چڑھنے کو سرِ دار بہت

عالمِ حیرت عجب آدم کے افسانے میں تھا
دو جہاں کا رازِ پنہاں یعنی اِک دانے میں تھا

تھا ہر اک مصروف پاداشِ عمل کی فکر میں
میں سرِ میدانِ محشر دل کے بہلانے میں تھا

اور کیا اس سے سوا حالِ شبِ فرقت کہوں
سوزشِ دل کا نشاں کچھ شمع و پروانے میں تھا

ہے چھیڑ سے مطلب نہ کوئی اس کے سوا اور
بڑھ جاتی ہے اس شوخ کی غصے میں ادا اور

مرنے کی مرے مانگتے ہیں روز دعائیں
گویا ہے زمانے میں بجز ان کے قضا اور

بگولا بن کے صحرا میں گلوں میں رنگ و بو ہو کر
تلاشِ یار کرتا ہوں سراپا جستجو ہو کر

سمجھتا ہوں نویدِ وصلِ جاناں تیغِ عریاں کو
اٹھاتا ہوں جفائے عشق میں قاتل کی خو ہو کر

....

نکلا نشورِ حشر کا یہ شاخسانہ کیا
جدّت طلب ہوا ہے ہمارا فسانہ کیا

اپنا بھی تھا ضرور کوئی معتمد علیہ
ترتیبِ فردِ جرم ہوئی غائبانہ کیا

اہوارِ زندگی ہے عجب اسپِ بادِ پا
سایہ رم کرے ہے بھلا تازیانہ کیا

قطرے نہیں لہو کے یہ اشکوں میں بے سبب
آنکھوں کے راستے ہوا یہ دل روانہ کیا

حق نے کیا ہے دولتِ قرآں سے دل غنی
تاج و سریر خسروی ملک و خزانہ کیا

سمجھتا ہے جو تو احباب کو تجھ سے رفاقت ہے
خیالِ خام ہے ناداں، یہ منہ دیکھے کی چاہت ہے

بہت بھاری ہے منزل اور رستے میں مسافر کو
پیامِ مرگ سے بڑھ کر یقیناً خوابِ غفلت ہے

نقاب اس تند خو نے جو اُلٹ دی از رہِ شوخی
مچا غل حشر میں چاروں طرف سے کیا قیامت ہے

کرشمے حسن کے دیکھو ملائک سربسجدہ ہیں
جمالِ مصحفِ عارض ہے یا سجدے کی آیت ہے

دل چاہتا ہے عزم بہ میخانہ کیجئے
پیری میں شغل بادۂ و میخانہ کیجئے

اس شوخ کا نشاں نہ ملا لامکاں تلک
کیا اعتبار کعبہ وبت خانہ کیجئے

دیکھو تو مجھ سے وعدہ کیا کس قدر غلط
وہ کہتے ہیں کہ جرأتِ ذوقِ نظر غلط

واعظ کی بات مانیے یا قولِ فلسفی
دونوں کی رائے اصل میں ہے سربسر غلط

عالیؔ دعائے آخرِ شب کرپئے نجات
جاتا نہیں ہے تیر دعائے سحر غلط

دوں گا دعائیں ان کی ادا و نظر کو میں
بے فکر جان ودل سے ہوا عمر بھر کو میں

اہلِ شرف کا شیوہ ہے مہماں نوازیاں
کس دل سے پھر نکال دوں تیرِ نظر کو میں

میں اور التفاتِ فلک، رہنے دیجئے
پہچانتا ہوں خوب فریبِ نظر کو میں

عالیؔ شبِ وصال اگر ہوتا بس مرا
تا حشر ہونے دیتا نہ بانگِ سحر کو میں

عزیزؔ

مولوی حکیم محمد عبدالعزیز ولد حکیم مولوی محمد فیاض خانصاحب رام پور کی تحصیل بلاسپور میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی خوب جانتے تھے۔ علمِ طلسمات وتسخیر ودعوات کا بہت شوق تھا۔ طبابت بھی کرتے تھے۔ علمِ کیمیا کے ماہر تھے۔ انتقال تقریباً ۱۹۱۵ء میں بلاسپور ہی میں ہوا۔
تصانیف: گلشن جفر، مجربات عزیزیہ، رسالہ رنگ سازی، گلشن اسرار عزیزی۔

نمونۂ کلام

بنامِ پاک احمد ابتدا سازم کلامے را
گرامی ترنمایم نامۂ گم کردہ نامے را

بذکر صاحبِ اسریٰ چہ پوید راہ معراج
کہ جولاند براق خامہ ام برعرش گامے را

بہم گشتند محبوب و محبّ در منزل تو بینی — بگفتندے پیامے راشفتندے سلامے را
عزیز از دردِ ہجرانِ تو جاں کند و ہمی خوانی — صبا در پیش گاہش می رساں از من پیامے را

عالیؔ

فرزند محمد خاں عرف منا میاں بڑیچ جھجر والے، دوست محمد خاں ابن غوث محمد خاں رام پور میں پیدا ہوئے، دادا ریاست جھجر میں دیوان تھے۔ کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے وطن رام پور واپس آ گئے، اولاد کو پڑھانے کا شوق تھا، انگریزی تعلیم پر کثیر رقم خرچ کی، صاحبزادے کا نام احسان محمد خاں تھا۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرائی اور رام پور میں فائنانس منسٹر کے عہدے پر رہے۔ آج کل پاکستان میں کسی بڑے سرکاری عہدے پر ہیں۔ عالیؔ صاحب فن شعر میں احمد علی صاحب شوقؔ قدوائی کے شاگرد تھے، کم گو تھے۔ طبعاً پرچشم خوددار، احباب نواز، اور مخیّر تھے۔ اُن کا انتقال ۶ ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ رام پور میں گوجر ٹولہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

میانہ قد، فربہ اندام، رنگ گورا، گول چہرہ، بڑی آنکھیں، داڑھی متوسط، پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔

نمونۂ کلام

فلک اس کا مکان ہے گویا — یہ زمیں آسمان ہے گویا
نزع میں آئیں تو کروں کچھ عرض — ابھی کچھ کچھ زبان ہے گویا
کلفتِ دہر سختیِ محشر — یہ مرا امتحان ہے گویا
اپنا ہنسنا بھی حال پر اپنے — درد کی داستان ہے گویا
ہچکیاں لے رہے ہیں مقتل میں — ابھی کشتوں میں جان ہے گویا
کیوں نہ عالیؔ کی ہو غزل عالی — مصحفیؔ کی زبان ہے گویا

کرے گی رہبری در تک کسی کی جستجو دل کی

سلامت ہے جو خضرِ رہ تو کیا پروا ہے منزل کی

تری صورت کو دیکھا دونوں عالم ہو گئے روشن

نگاہیں ملتے ہی آنکھیں سی گویا کھل گئیں دل کی

مرا منہ دیکھ کر سب حال میرا جان جاتے ہیں

تکلم آفریں گویا ہے خاموشی مری دل کی

تلاشِ زادِ رہ میں کیوں نہ سرگرداں پھروں عاؔلی

مسافر ہوں عدم کا، فکر ہے در پیش منزل کی

علی مرداؔن

علی مرداں خاں ولد محمد حرمت خاں ابن محمد یعقوب خان، خلف عالم خاں رام پور کی تحصیل بلاسپور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے پردادا افغانستان سے آ کر رام پور میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ اردو اور فارسی کی استعداد رکھتے تھے۔ ذریعہ معاش دیہات کی مستاذی تھی۔ انتقال ۹۰ سال کی عمر میں ۱۰ ررمضان [illegible]ھ میں ہوا۔ موضع ٹانڈہ مزرع بلاسپور کی مسجد کے پاس دفن ہوئے۔ چیستاں کہنے کے ماہر تھے، رباعیات اور قطعات خوب کہے ہیں۔

مہندی وسمہ

ایک بہن اور ایک ہی بھائی — الگ الگ ہیں باپ اور مائی

ان سے جو کوئی منہ لگاوے — ترت ہی منہ کالا ہوجاوے

رباعیات

مجلس ہے یہ عشرۂ محرم واللہ
اور اس میں برا کہتے ہو اصحاب کو واہ

اے بوالہوسِ بکار دنیا تا چند
غافل معاملات عقبےٰ تا چند

می دان کہ حیات ہمچو خوابے ساعت
در خواب سراب بے سروپا تا چند

کودکی وطفلگی وہم شباب
جملہ بگذ شتند چوں نقش برآب

نوبت پیر علی مرداںؔ رسید
بر کنار غرب رفتہ آفتاب

کسی کی عید ہو اور ذبح ہو خوشی میں کوئی
طریق شرع میں مشکل زباں ہلاتا ہے

خواہی کہ شود دل تو چوں آئینہ
دہ چیز بروں کن از درون سینہ

حرص وہوس وغضب دروغ وغیبت
بخل وحسد وریا وکبر وکینہ

قطعہ

دردلم نیست آرزوے مرگ
آرزوے کہ ہست ایں بجدا

درلم ماند اے علی مرداںؔ
الفتِ مصطفٰے وحب خدا

مجھ کو رو رو کر مری آنکھوں نے رسوا کردیا
ہائے رازِ دل انہی دونوں نے افشا کردیا

ہجرِ جاناں میں علی مرداں رویا یاں تلک
خونِ دل چشم نے پانی سے پتلا کردیا

عکسؔ

عنایت حسن خاں ولد غلام نبی خاں جیلر، رامپور میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی تعلیم مولوی محمد سعید الدین صاحب ودیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ عربی کی ابتدائی کتابیں حضرت مولانا سلامت

اللہ صاحب سے پڑھیں۔ محلہ تکیہ مبارک شاہ خاں میں مکان ہے، سات سال تک پلٹن میں ملازم رہے، پانچ سال توپ خانہ میں نوکری کی پھر پیلیس گارڈ میں سات برس تک تعینات رہے، ۲۵ سال محکمہ پولیس میں، تین سال علاقہ خام میں ملازم رہے۔ شاعری میں حضرت شاہ خانصاحب عاشقؔ رامپوری کے شاگرد ہیں۔ لمبا قد، چھریرا بدن، رنگ گورا، آنکھیں بڑی، داڑھی لمبی اور گھنی بااخلاق ومہذب۔

نمونہ کلام

پتلی کی طرح ہردم آنکھوں میں جو پھرتے تھے
لو دل میں بھی اب ان کی تصویر نظر آئی

کھاتا ہے غمِ جاناں خونِ دل شیدا کو
اے عکسؔ یہاں اس کی جاگیر نظر آئی

میرے ویرانے میں ٹھہریں یہ کہاں اُن کو قرار
کبھی دم بھر کو جو آئے تو ہوا کی صورت

سب زمانہ میں ہے مشہور تلوّن اُن کا
دم میں وہ رنگ بدلتے ہیں حنا کی صورت

طائرِ فکر نے سب گوشت تو کھایا اے عکسؔ
ہڈیاں کھائے نہ یہ مرغ ہما کی صورت

یہی اُلفت ہے اگر اس بتِ بے پیر کے ساتھ
جان بھی جائے گی اے جاں میری توقیر کے ساتھ

ہائے وہ صبح شبِ وصل موذن کی اذاں
رُوح تحلیل ہوئی نعرۂ تکبیر کے ساتھ

اس کا سکتہ ہے سوایا مری حسرت ہے سوا
آئینہ دیکھئے تو عکسؔ کی تصویر کے ساتھ

لاکھوں دلِ مجروح پہ کھائے ہیں جو چرکے
کیوں ناز اٹھائے ستمِ زخمِ جگر کے

آئینہ حیرت دلِ شفاف ہے اپنا
ہاں فخرِ سکندر ہیں فقیر آپ کے در کے

علی

حافظ علی احمد خانصاحب برادر قاری علی بہادر خان صدر مدرسہ غوثیہ، رامپور میں پیدا

ہوئے۔قرآن مجید حفظ کیا۔اس کے بعد فارسی کی تعلیم مختلف استادوں سے حاصل کی،نعت سے خاص لگاؤ تھا۔میلاد خوب پڑھا کرتے تھے،نعت خواں ساتھی شریعت کے پابند اور باوضو ہوتے تھے،صحت روایات کا لحاظ۔مکان پرانے گنج میں تھا جہاں منگل کی پینٹھ (بازار) لگتی ہے اس کے پاس مسجد ہے اس میں مدرسہ تھا،حافظ صاحب بھی مدرس تھے۔یہ شغل آخر عمر تک جاری رہا۔ انتقال ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں رامپور ہی میں ہوا،اس مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔شاعری میں احسانؔ رامپوری سے تلمذ تھا۔

میانہ قد، دوہرا جسم، رنگ سرخ وسفید، نہایت بااخلاق، سنجیدہ،شریعت کے پابند، احباب نواز۔

نمونہ کلام

یہ لطف، یہ کرم، یہ عنایت خدا کی ہے
مجھ پر نگاہ مہر جو اُس دلربا کی ہے

وعدہ کبھی کیا ہی نہیں اُس نے وصل کا
ادنیٰ سی اک ادا یہ بتِ بے وفا کی ہے

ہے عزم کس کے قتل کا، کیوں ہے جبیں پہ بل
کھینچی ہے تم نے کس لئے تلوار، کیا ہوا

صدمہ ہوا ہے کیا دلِ نازک پہ آپ کے
کمہلائے ہیں جو پھول سے رخسار کیا ہوا

ان کو پہلے سے زیادہ ہے مروت میری
اب کسی سے نہیں سنتے وہ شکایت میری

کوئے دلدار سے لاشہ نہ اٹھانا میرا
بعد مرنے کے بنانا یہیں تربت میری

کب وہ تشریف عیادت کے لئے لائے ہیں
ہائے جب غیر ہوئی نزع میں حالت میری

عارؔف

محمد مظہر علی خاں ولد سردار علی خانصاحب، سب انسپکٹر پولیس ۱۹۲۸ء میں رامپور میں پیدا ہوئے، اُن کے اجداد میں عظیم الدین خانصاحب عرف جنگا خان ضلع بریلی کے بڑی جاگیر دار تھے اور نواب کہلاتے تھے۔ ان کے بعد تمام جائیداد خاندانی جھگڑوں کی نذر ہوگئی۔ اُن کے پردادا یوسف علی خانصاحب نے رامپور میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہیں انتقال بھی ہوا، ابتدائی تعلیم دادا کی نگرانی میں ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں اسٹیٹ ہائی اسکول کے چھٹے درجہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں رضا انٹر کالج سے انٹرنس کا امتحان فرسٹ ڈویژن (درجہ اوّل) میں پاس کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ایم۔اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ دادا صاحب کو بھی شاعری سے ذوق تھا۔ ان کی صحبت کے اثر سے ذوقِ سخن پیدا ہوا۔ اُن کا پہلا شعر یہ ہے۔

میں نے ہمت ہی نہ ہاری، ہر مصیبت کو سہا
شکر ہی کرتا رہا جب تک کہ دم میں دم رہا

کسی کے شاگرد نہیں ہیں، مشاہیر شعرا میں غالبؔ اقبالؔ اور جوشؔ کا کلام بغور دیکھا ہے، میرؔ دمومنؔ کے بھی شیدائی ہیں لیکن غالبؔ واقبالؔ کے رنگ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ زیادہ تر نظمیں لکھتے ہیں اور نظم کی ترقی کو اردو شاعری کی وسعت وارتقاء کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، لیکن غزل کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ شعر کے ذریعہ انسانیت کی خدمت انجام دینے کے آرزومند ہیں۔

نمونہ کلام

علی گڑھ سے رُخصت

رُخصت اے یوسفِ تعلیم کے کنعاں رُخصت　　رُخصت اے جنتِ تصویر کے رضواں رُخصت
ظلمتِ جہل میں لے شمعِ فروزاں رُخصت　　اے علی گڑھ! مرے محبوب دبستاں رُخصت
ترجماں یہ غمِ پنہاں ہے یہ رخصت کا سلام　　کر قبول اپنے گرفتارِ محبت کا سلام

شرمیلی محبت

آنکھ میں جھلکے لب پہ نہ آئے، کوئی نہ سمجھے، کوئی نہ پائے
دل کو تسکیں دے، تڑپائے، آگ بجھائے، آگ لگائے

یہ دمکتے ہوئے رخسار، یہ آنکھوں کی چمک　　یہ مہکتی ہوئی زلفیں، یہ تنفس کی مہک
یوں ہم آغوش ہوا ہے تری طفلی سے شباب　　جیسے گلزار میں منہ چوم لے غنچے کا چٹک

نغمہ دلنواز میں اے دوست　　شورشِ غم سمو کے لایا ہوں
شاعری کی حسین لڑیوں میں　　اپنے آنسو پرو کے لایا ہوں

عارفؔ

ستارے

پُراز لعل و گہر ہے دامنِ فطرت ستاروں سے　　متاعِ نازِ خلاّقی ہے حسن بے مثال ان کا
منور ہے شبستانِ فلک ان نور پاروں سے　　عروسِ شب کے چہرے پر جھلکتا ہے جمال ان کا

غزلیات

نقشِ پیمانِ وفا دل سے مٹایا نہ گیا　　وہ مجھے بھول گئے، مجھ سے بھلایا نہ گیا

جان دے دی مگر اللہ ری خودداریٔ عشق
نگہِ لطف کا احسان اٹھایا نہ گیا

غضب ہے ترے ناز اٹھاتے اٹھاتے
زمانہ کے بھی ناز اٹھانے لگا ہوں

غمِ عشق نے میری فطرت بدل دی
میں صدموں میں اب مسکرانے لگا ہوں

خودی کو ڈھونڈ رہا ہوں، خدا نہیں ملتا
ملی ہے راہ گزر، رہنما نہیں ملتا

ترس گئے گل و لالہ بہارِ نغمہ کو
چمن میں ایک بھی آتش نوا نہیں ملتا

کلیوں کے لبوں پر ہے سہانا سا تبسم
کیا کہہ دیا چپکے سے نسیمِ سحری نے

زیب بہار تھی ابھی دستِ خزاں میں ہی کلی
نکھری، کھلی، سنور گئی، بکھری، گری، کچل گئی

ایسے لمحات بھی آتے ہیں غمِ فرقت میں
دل پہ کلیوں کا تبسم بھی گراں ہوتا ہے

یہ مہر وماہ، یہ انجم، یہ کہکشاں، یہ ملک
نشانِ رہ تو بنے، کوئی ہمسفر نہ ہوا

گنہگار ہوں عارف بس ایک آنسو کا
فسانۂ غمِ دل اور مختصر نہ ہوا

نگاہِ شوق اگر حسن آفریں ہو جائے
تو زندگی کی قسم موت بھی حسیں ہو جائے

اِک نظر، ایک جلوہ، ایک تڑپ
اور ہے حاصلِ محبت کیا

تری خیر اے انقلاب زمانہ
قفس کو سمجھنا بڑا آشیانہ

انجامِ پردہ داریِ زخمِ جگر نہ پوچھ
ہر سانس ہے جراحتِ پیکاں ترے بغیر

قفس میں رہ کے چمن کے لئے ترستا ہے
چمن کو دیکھ کے یاد آرہے ہیں ویرانے

جی چاہتا ہے سنتِ آدم ادا کروں
دنیا سنوار دوں کوئی ایسی خطا کروں

عارف امید ویاس کے ہاتھوں تباہ ہوں
کب تک مثالِ شمع جلا اور بجھا کروں

جولانیٔ خیال و رہِ عشق الاماں
اکثر گزر گیا ہوں تمہیں دیکھتا ہوا

ہزاروں ہیں شگوفوں کے تبسم دیکھنے والے
یہ دنیا ہے یہاں ایثارِ شبنم کون دیکھے گا

....

قومی جنگ ۱۹۶۸ء از مسیحا نظامی صاحب

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

صابؔر عارفی

فراست یار خاں پٹھان صورت، پٹھان سیرت، حافظ رحمت خاں کے قریبی عزیز، سرخ و سفید رنگ، کشیدہ قامت، متناسب جسم، بڑی بڑی آنکھیں جن میں حیا، مروت اور پرچشمی، شاعروں کی صحبت نے شعر و سخن کا ذوق پیدا کر دیا لیکن اس کی طرف دھیان نہ دیا، بچپن کے ایک ساتھی نے شاعری شروع کر دی اور حضرت شاؔد عارفی کے شاگرد بھی ہو گئے۔ بس خانصاحب نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا۔ شاد صاحب ہی کے شاگرد بھی ہوئے۔ صابؔر عارفی بن کر مشق شروع کر دی۔ اتنا کہا کہ اصلاح کے لئے استاد کے پاس وقت نکالنا دشوار ہو گیا، اسے محسوس کر کے بڑے سلیقہ اور اہتمام سے شاؔد عارفی کو راضی کر لیا کہ ان ہی کے یہاں رہائش اختیار کر لی، استاد کا احترام اتنا تھا کہ کوئی پیر کا کیا کرتا، تعلیم اچھی تھی، سوسائٹی معیاری، طبیعت موزوں، مشاہدہ تیز، قوی طبیعت میں ضد، مقابلہ نے قوتِ ارادی کو اور مستحکم کر دیا اور بڑی شاندار اٹھان ہوئی اور ان کا شمار تلامذہٗ خاص میں ہونے لگا مگر شاؔد عارفی کی تلون مزاجی کام آئی اور صابؔر عارفی جیسے مثالی خدمت گزار سے خفا ہو گئے۔ صابر عارفی نے اس عالم میں بھی استاد کو سر چڑھا کر رکھا، دوری ہوئی، حاضری حضوری بند ہوئی۔ اصلاحیں ختم ہو گئیں، بیچ والوں نے باتیں بھی لگائیں مگر صابؔر صاحب نے ان کی شان کے خلاف کچھ نہ کہا۔ صابؔر صاحب کا کلام زیادہ نہ مل سکا۔ یہ نعت ہدیہ قارئین ہے۔

اس سے پہلے کہ خود و ہم میں ڈالے ساقی   دین و ایمان کئے تیرے حوالے ساقی

بھید کوئی میری لغزش کا نہ پالے ساقی
عدل میزانِ قیامت سے بچالے ساقی

اس بھٹکنے پہ زمانہ کی عبادت قرباں
میں گروں پاؤں پہ تو مجھ کو اٹھالے ساقی

میں نے میخانہ کو اپنایا ہے اس مقصد سے
سجدۂ بت پہ جو مچلوں تو سنبھالے ساقی

کہیں طٰہٰ، کہیں یٰسین کا فرماں آیا
تجھ کو کیا کیا نہ ملا گیسوؤں والے ساقی

موقع موقع سے وہ اللہ کا اندازِ خطاب
تو نرالا ہے، ترے نام نرالے ساقی

ڈاکٹر حامد علی خاں

پتلون کے ساتھ شیروانی، صاحبِ ریش، ذی علم، صاحبِ خلوص، انگریزی، سائنس اور ڈاکٹری پڑھی، اس کو ذریعہ معاش بنایا، ڈاکٹر حامد کہلائے۔ شعروادب کی دُنیا میں آئے تو حامد رامپوری کے نام سے، سمجھ کر کہنے والے، اچھا کہنے والے، رامپور کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ مشاعروں میں بہ اصرار بلائے جاتے ہیں، حاضرین منتظر رہتے کہ کب پڑھتے ہیں۔ ہمیشہ غزل سے پہلے ایک قطعہ ضرور پڑھتے۔

قطعہ

وہ دن بھی یاد ہیں کہ نکالا گیا تھا میں
الزام لغزشِ دلِ ناداں لئے ہوئے

اب پھر وہی بہشت الٰہی تری پناہ
پھر آرہا ہوں فطرتِ انساں لئے ہوئے

او بے خبر وسعتِ درمانِ محمدؐ
کونین ہے منت کشِ فرمانِ محمدؐ

کس دل سے کریں بندگیٔ غیر گوارا
اللہ کے بندے ہیں غلامانِ محمدؐ

سر جھکتا ہے اللہ کے لئے فرض سمجھ کر
دل جھکتا ہے جب سنتا ہوں فرمانِ محمدؐ

اِک خالقِ عالم ہے تو اِک رحمتِ عالم
وہ شان خدا کی ہے تو یہ شانِ محمدؐ

استاد رشید

رشید احمد خاں چشتی نظامی ابن حافظ حیدر علی خاں، عزیز میاں بریلوی سے بیعت تھے معافی دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکاتب میں پائی۔ حکیم علی احسن قاصرؔ (دادا مسیحا نظامی سے فارسی پڑھی) حکیم محمد ابراہیم (والد صاحب سے مسیحا نظامی سے انگریزی پڑھی) ٹینس کے اچھے کھلاڑی تھے۔ محمود علی خاں محمودؔ اپنے چچا کے شاگرد تھے بعد کو اپنے چچا رام پور کے یکتائے روزگار شاعر محمودؔ رامپوری کی طرف رجوع ہوئے۔ بھتیجے کی صلاحیت سے متاثر ہو کر اسے بھی یکتائے روزگار بنا دیا۔ اللہ نے دو اولادیں دیں۔ ظفر میاں اور ایک بیٹی بدر النساء، لڑکا ۲۴ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ بیٹی کی شادی سید اشرف شاہ صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کی۔ ان کی شاعری رام پور پر چھا گئی۔ شاگردوں کا حلقہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ محشرؔ عنایتی جو شہرت کے مالک ہیں ان ہی کے شاگرد ہیں، زبان پر استاد کو پوری قدرت حاصل تھی۔

رشید ان کے سوتے میں بوسے لئے ہیں　　　جو جاگے تو لینے کے دینے پڑیں گے

پیری میں میرے ست قدم ضعف سے نہیں　　　ہوں مطمئن کہ اب میری منزل قریب ہے

یہ شعر قاسم علی خاں قاسم کا ہے جو رشید صاحب کو پسند بہت تھا۔ علامہ راوی موتی میاں صاحب

پیری نے مٹایا نہ مرے داغ جگر کو　　　سب شمع بجھا دیتے ہیں محفل میں سحر کو

کوئی تیغ کی نہ حاجت، نہ ضرورت غضب ہے　　　مرے واسطے بہت ہے وہ ہنسی جو زیر لب ہے

مرے آگے عذر کیجئے نہ جفائے پیشتر کا　　　نہ مجھے ملال جب تھا، نہ مجھے ملال اب ہے

وہ جنازے میں گر آئیں تو نہ ساتھ ساتھ جائیں
میں چلوں گا ورنہ اُٹھ کر کہ یہی رہِ ادب ہے

آئینہ دیکھ کے یہ دیکھ سنورنے والے
تجھ پہ بے جا تو نہیں مرتے ہیں مرنے والے

زور تھا بت خانہ کی ہوا کا
پھیر دیا رُخ قبلہ نما کا

سب سے زیادہ آپ کی الفت
آپ سے زیادہ نام خدا کا

نزع کا وقت ہے، اب ڈوب چکی ہیں نبضیں
بند ہوتی ہیں کتابیں مرے افسانوں کی

اس دلِ تنگ میں حد بھی کوئی ارمانوں کی
میزباں زیق میں کثرت سے ہے مہمانوں کی

کشش بھی وعدۂ دیدار کی قیامت ہے
خدائی کھنچ کے تری انجمن میں آئی ہے

جنابِ حضرتِ محمود کا ہے فیض رشیدؔ
جو شوخی آج ہمارے سخن میں آئی ہے

علامہ رازؔ یزدانی

رازؔ تخلص احمد ولی خاں نام، ناز و نعم میں پرورش ہوئی، رازؔ کے والد صاحب رامپور کے روسا میں تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، حافظ جی نے ناظرہ قرآن شریف پڑھایا اس کے بعد دینیات کے لئے اردو کا قاعدہ شروع کرادیا۔ اس کے بعد انگریزی اسکول میں داخلہ کرایا گیا جہاں سے ہائی اسکول پاس کیا۔ پھر مدرسہ عالیہ (رامپور) سے منشی اور کامل اور اردو ایڈوانس کے امتحانات پاس کیے۔ ہم سبق اور ہم مدرسہ لوگوں میں خاں جلیل نعمانی کا نام بھی شامل ہے جو رامپور کے ممتاز غزل گو شعراء میں ہیں۔

چار نو جوان شعراء ایک ساتھ اُٹھے اور پھر چھاتے چلے گئے۔ شادؔ عارفی، محشرؔ عنایتی، منے

میاں صابرؔ، اور رازؔ یزدانی اور ایک ساتھ چاروں نے ڈاکٹر ضمیر صاحب کے دادا کی شاگردی اختیار کی اور بعد کو اپنے اپنے رجحان کے مطابق مختلف نامور شعراء کے شاگرد ہو گئے اور چاروں نے مثالی ترقی کی۔ ان چاروں میں مثالی اتحاد و اتفاق، یگانگت، ہم نشینی اور ہم خیالی بھی مثالی تھی کہ کسی مزاح نگار شاعر نے عید کے موقع پر ایک غزل پڑھی اس کے مطلع کا مصرع یوں تھا۔

آ رہے ہیں شادؔ صابرؔ رازؔ محشرؔ عید ہے

رازؔ صاحب کی طبیعت غزل سے زیادہ نظم کی طرف مائل تھی۔ انہوں نے مقبول سیاسی سماجی نظمیں کہیں، بڑے وسیع المطالعہ تھے۔ ۱۹۳۰ء اخبارات میں ان کا کلام شائع ہونے لگا تھا، لاہور کے مشہور اخبار احسان میں رازؔ صاحب کی نظمیں پورے صفحہ پر شائع ہوتی تھیں۔ غزلوں کے چند اشعار دیئے جا رہے ہیں۔

تیرا کرم کہ زندگی مجھ کو عطا ہوئی مگر
لاؤں کہاں سے مانگ کر زیست کے لازمات میں

ٹھہر کے تلووں سے کانٹے نکالنے والے
یہ ہوش ہے تو جنوں کامیاب کیا ہوگا

وہ سامنے سرِ منزل چراغ جلتے ہیں
جواب پاؤں نہ دیتے تو میں کہاں ہوتا

اب امتیازِ بہار و خزاں سے کیا حاصل
حجاب ڈال چکے تم مری نظر کے لئے

پہلے میں بگڑا زمانہ کے بنانے کے لئے
اب کے بگڑے گا زمانہ کہ سنورنا ہے مجھے

ہاں بتا شوخ نگاہی ترا منشا کیا ہے
کچھ تو معلوم ہو معیارِ تمنا کیا ہے

جب کسی صورت نہ سوئے دوست دیکھا جائے ہے
اپنی ناکامی پہ مجھ کو پیار سا آ جائے ہے

فکرِ اصلاحِ زمانہ میں گھلے جاتے ہیں
اپنی ہستی کو میاں رازؔ نے سمجھا کیا ہے

اپنی صفات دیکھ کر سمجھا تری صفات میں
خالق کائنات تو شورشِ کائنات میں

مجھ کو معلوم ہے دنیا میں جو کرنا ہے مجھے
اس لئے ڈوب رہا ہوں کہ ابھرنا ہے مجھے

دھبے ہیں ماہتاب، میں داغ آفتاب میں
اب اور کس کو لائیں تمہارے جواب میں

بہار و برق کی بیداد کہہ نہیں سکتا	دلھن بنا کے جلایا ہے آشیانے کو

شاہ عبدالرزاق خاں

یارو چلیے کھائیں گے پورانے کے سنگھاڑے

کیا دے گا نہیں اس کی ہیں بہن کے سنگھاڑے

شوکت علی خاں شوکتؔ

محلہ گھر پیپل والا، کھیتی باڑی کرتے تھے، ان پڑھ تھے، پھر رکشا چلانے لگے۔

کبھی ہنس رہا ہوں، کبھی رو رہا ہوں	محبت میں اپنا بھرم کھو رہا ہوں
رقیبوں سے پوچھوں گا فرصت میں شوکتؔ	ابھی تو میں زخمِ جگر دھو رہا ہوں

امجد علی خاں امجدؔ

ولد صفدر علی خان صفدرؔ

کھینچا جو طول کشمکشِ واقعات نے	زلفوں کا ذکر چھیڑ دیا غم کی رات نے

عبدالمنان خاں خیالؔ

محلہ لال مسجد رامپور

چاند کی سمت کس نے دیکھ لیا	ڈوبا جاتا ہے شرم کے مارے
کتنا پیارا ہے وہ اندازِ نشست	جیسے اب اٹھتے ہیں جانے کے لئے
صرف تم میرے لئے ہو جاؤ	اک زمانہ ہے زمانہ کے لئے

محبت بے کسی ہو کر رہے گی غرض ان کی خوشی ہو کر رہے گی
سلام ان کو اگر کرتا رہا میں کسی دن بات بھی ہو کر رہے گی

نویدِ اذنِ خاص آئی ہے اذنِ عام سے پہلے
کہ ساقی کی نگاہیں اُٹھ گئی ہیں جام سے پہلے
وہ تو میں ناواقف تھا آئینِ گلستاں سے پہلے
اب کے نشیمن پھونک دیا ہے فصلِ بہاراں سے پہلے

علی شاہ خاں جامؔ عنایتی محلہ باغ پختہ

چھپا رہا ہوں ترے عشق کے فسانے کو اور اتفاق سے معلوم ہے زمانے کو
مانگیں وہ دل تو جام تامل نہ چاہئے اپنے ہی کام آئے گا اپنا لیا دیا

مجھے اِک جام دے کر یاد ہے ساقی کا یہ کہنا
کہ اب تو جام بھی پینے کے قابل ہوتے جاتے ہیں
دیوانے کو گا ہے گا ہے تم اب بھی یاد آ جاتے ہو
صحرا کے بھی بعض مناظر کتنے پیارے ہوتے ہیں
ان کو نسبت تاروں سے اور ان تاروں سے توبہ توبہ
اِک آنکھ کا تارا ہوتا ہے، اِک نام کے تارے ہوتے ہیں

شکیلؔ خاں نعمانی

آؤ میرے قریب سے دیکھو چاند کے پاس اِک ستارہ ہے
مجھ سے تمام واقعہ کہہ گئیں دل کی دھڑکنیں اور بڑھیں گی اُلجھنیں آپ نہ کھایئے قسم

مل کے شکیل سے پتہ چل گیا دوستی ہے کیا　　　　اب تو ہم اپنے سائے سے بچ کے چلیں گے دو قدم

منظؔر

خورشید علی خاں منظؔر ولد جمیل خاں محلہ تالاب نہال الدین خاں، دادا بزرگ تھے سدن شاہ خاں میاں۔

کل ہم اس دُھن میں اِک راہ گزر سے گزرے　　　　کوئی شاید کہیں جاتا ہوا دھر سے گزرے

غمِ دوراں کی حقیقت بھی کہوں گا پہلے　　　　زندگی کشمکشِ شام و سحر سے گزرے

دیکھنا یہ ہے کہ ساحل تو قدم چومے گا　　　　سوچنا یہ ہے کہ طوفان تو سر سے گزرے

کبھی آہستہ قدم اور کبھی تیز قدم
آج منظؔر وہ کئی بار ادھر سے گزرے

مدعا اُن کی تجلّی کے سوا کچھ بھی نہیں　　　　دیکھنا سب کچھ ہے لیکن سوچنا کچھ بھی نہیں

ان کا بندہ ہوں لحاظِ بے نیازی کے سوا　　　　جن کے مسلک میں لحاظِ ماسوا کچھ بھی نہیں

کفرِ نعمت کا بھرم رکھنا ہے بربادی کے بعد　　　　ان سے کہتا ہوں وفاؤں کا صلا کچھ بھی نہیں

جامِ شراب و حسن و عشق کہنے کو ایک ہے مگر　　　　حسنِ سرور بے ثبات عشقِ حیاتِ معتبر

باہمہ احتیاطِ عشق جب بھی ہوا ہے سامنا　　　　میری بھی اُٹھ گئی نظر اُن کی بھی اُٹھ گئی نظر

عارضِ پاک کبھی زلف تری بکھر نہ جائے　　　　جیسے مچل مچل اٹھے شام کی گود میں سحر

ضابطۂ جمال میں ہے تو اجازت کلام　　　　میرے لئے حدیث شوق ان کے لئے اگر مگر

....

اب میرے بغیر ان کا عالم
زلفیں برہم، آنکھیں پرنم

گل چاک جگر گریاں شبنم
اب یہ ہے بہاروں کا عالم

کیا دن تھے کہ دیکھا کرتے تھے
آئینہ کو وہ اور ان کو ہم

جب ان کو ڈھونڈ کے پلٹا ہوں
چومے ہیں خود اپنے نقش قدم

ارزاں تھا مگر مہنگا ہی پڑا
کونین کے غم سے آپ کا غم

منظر میرے ضبط کا منظر
وہ دیکھ تو لیتے کم سے کم

بشیر درانی

ثنا پہ اپنی مسرت سے جھومنے والے
جو تجھ کو تاب ملامت نہیں تو کچھ بھی نہیں

دشمن دل ہی نہیں دشمن جاں ہوتا ہے
اُف وہ احساس جو پیری میں جواں ہوتا ہے

بدل دی فطرتِ سائل ترے در کی گدائی نے
طلب رکھتا ہوں لیکن ہاتھ پھیلا یا نہیں جاتا

میں چمن میں جا کے بھی کیا کروں یہ نظر اُٹھا کے بھی کیا کروں
جو مری نگاہ میں حسن تھے وہ تمہاری شکل میں ڈھل گئے

یہ فروغ شعلۂ تعلیم شمع تو اسی بزم تک اسی رات تک
مگر ان کا اور مقام ہے جو پرائی آگ میں جل گئے

جمیل الرحمٰن خان صاحب افغانی شاگرد شرفؔ زیدی

یہ کیا راز ہے ساقی مست و بے خود کہ اب تو نے چشمِ عنایت ہٹالی
وہی میکدہ ہے مگر سونا سونا، وہی جام و مینا مگر خالی خالی

تصور نے کھینچی ہے تصویر ان کی بڑی شوخ، چنچل، بڑی بھولی بھالی
کسی دن جو دیکھو نگاہیں اُٹھا کر نظر آئے گا تم کو پر کیف منظر
برنگِ شفق نیلگوں آسماں پر ابھرتی ہے خونِ شہیداں کی لالی
یہ کون آج آتا ہے سوئے گلستاں، معطر معطر، خراماں خراماں
بہاریں ہیں کیوں اپنی قسمت پہ نازاں، یہ کیوں وجد میں ہے صبا ڈالی ڈالی

بلیغ الرحیم خاں، بلیغ رامپوری، ولد حکیم ابراہیم خاں محلہ لال مسجد

کوئی کھٹکا، کوئی آہٹ، نہ صدائے رفتار
کیا دبے پاؤں مری عمرِ رواں گذری ہے

پیارے خاں وفا حیاتی

یہی جنتیں، یہی دوزخیں، کھلیں جب سے ان کی حقیقتیں
یہ حریصِ جلوۂ ناز اب نہ جزا سے خوش، نہ سزا سے خوش
خلوت ہے، نہ جلوت ہے، وصلت ہے، نہ فرقت ہے
تو ہے، تری نخوت ہے، میں ہوں، مری حیرت ہے
دل ہے، ترا کوچہ ہے، سر ہے، درِ دولت ہے
اسباب تو اچھے ہیں، آگے مری قسمت ہے
کوئی ان کا پردہ دیکھے وفا نہ دیکھے دنیا نہ دیکھے

حادث ہی امتیازِ قدم کی دلیل ہے
کر فکر و غور بحث فنا و بقا کو چھوڑ

خورو طفلاں کو عبث لائے بڑے لالہ جی
ناچ دیکھت نہیں آوت ہے برائے ختنن

آج مے خانہ پر بھی نازل ہے
یہ کئی مسجدوں کا ایک امام

محتسب کی نہ سن مرے ساقی
پی پلا تجھ کو اپنے کام سے کام

حکیم عبدالہادی خاں وفاؔ

چلتی نہیں زبان تمہاری دہن میں کیا
مہندی لگائے بیٹھے ہو پائے سخن میں کیا

اے وفاؔ شیفتہؔ غالبؔ و مومنؔ ہوں میں
میں نے کچھ رنگ اُڑایا ہے غزل خوانی کا

اے وفاؔ بعد میرزا غالبؔ
ہاں غزل یوں کہا کرے کوئی

ہے ایک تار سبحہ زنار دیکھنا
ہے ایک بات شیخ کیا برہمن میں کیا

جاؤ تم عالمِ فرصت کے تماشے دیکھو
چھوڑ دو گردشِ تقدیر کو تقدیر کے ساتھ

روح پروانۂ ناشاد کی رخصت ہے یہ
اِک دھواں سا نظر آیا گلِ گلگیر کے ساتھ

الطاف الرحمٰن فکرؔ رامپوری

بزریہ ملا ظریف کے ساکن شاگرد راز یزدانی، پہلے پوسٹ آفس میں ملازم تھے لیکن وہاں سے برطرفی کے بعد کچھ صوفیانہ رنگ غالب آگیا۔ ۶۲ء یا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوگیا۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو فکرؔ نے دیکھا
پھر اسکے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

آپ اور ضبطِ محبت اچھا!
شکریہ آپ کی اس حوصلہ افزائی کا

نبی جان خاں بقاؔ رامپوری

ہم کبھی اس جا تھے، یہ بیٹھے ہیں جہاں اور　　　　اللہ رے تقدیر کہاں، ہم ہیں کہاں اور

عجب نور خاں صاحب

(خاندانی نام) چندا پیارے خانصاحب مرحوم، تخلص بے تکؔ الہ نور خاں ۱۹۰۱ء میں مصطفی آباد عرف رامپور میں پیدا ہوئے۔ اُن کے جدامجد گل نور خاں صاحب صوبہ سرحد کے علاقہ بنیر سے آ کر رام پور میں آباد ہوئے۔

بے تکؔ صاحب وسیع حلقہ احباب کے مالک تھے۔ ان کے دوستانہ مراسم ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے تھے چنانچہ سماج کے مختلف طبقوں میں یکساں احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ بے تکؔ صاحب تقریباً نصف صدی تک دُنیا کو گدگداتے اور ہنساتے رہے، ان کا طنز و مزاح کا کلام اور اس پر اندازِ بیان وہ جس مشاعرہ میں جاتے اسے لوٹ لیتے۔ بے تکؔ صاحب کے سامنے کسی دوسرے مزاحیہ شاعر کا رنگ کبھی نہ جم سکا۔

بمبئی کے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں جہاں پورے ہندوستان کے طنز و مزاح کے شاعر جمع ہوتے تھے بے تکؔ صاحب کو ظریف الملک کا خطاب دیا گیا۔

ان کے پڑھنے کا انداز اس قدر پرلطف ہوتا تھا کہ جب وہ ڈائس پر پہنچ جاتے تو ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری اس طرح فرمائش کا ایک سلسلہ تھا جو دیر تک جاری رہتا۔ ان کے اشعار کا طنز و مزاح اپنی جگہ اور اس پر ستم بالائے ستم ان کی غضب کی اداکاری خود مجسم شعر کی تشریح و توضیح بن جاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ کلامِ شاعر بزبانِ شاعر کا سچا لطف بے تکؔ

صاحب کو سن کر ہی آتا تھا۔

بے تکؔ صاحب شکل وصورت، رنگ وروپ، اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے بھی پٹھان ہی لگتے تھے۔ اُن کا انتقال تقریباً چھ سال کی مسلسل علالت کے بعد ۱۶/اپریل ۱۹۷۰ء بروز جمعرات شام ساڑھے سات بجے رام پور کے محلہ گھیر توغان میں اپنے آبائی مکان ہی ہوا۔

نمونۂ کلام

کمزوریوں کی وجہ سے دُرمٹ نہ اُٹھ سکا
سجدوں سے کوٹتا ہوں تری رہ گذر کو میں

وہ پہلوئے اغیار میں مسند پہ نشیں ہے
یارب ملک الموت بھی اس وقت کہیں ہے

کاٹ لے بڑھ کے ناک دشمن کی
میرے بدلے خدا کرے کوئی

تالیاں پھٹکار کے بے تکؔ زنانوں کو نہ چھیڑ
جن کی بنیادیں ہیں کھوکھل ان مکانوں کو نہ چھیڑ

ان کو ہاتھی کی سواری، اونٹ کا قد چاہیے
تو ابھی ناداں ہے بچہ، یوں پٹھانوں کو نہ چھیڑ

رئیس الرحمٰن خانصاحب

(خاندانی نام عشرت نور خانصاحب) ولد چندا پیارے خانصاحب، رئیس رامپوری، پیدائش ۳۰/نومبر ۱۹۳۰ء۔ تقریباً ۱۶ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔

شاعری کا ذوق فطری ہے۔ ابتدا میں تخلص مہرؔ تھا، بعد کو رئیسؔ تخلص اختیار کیا۔ ابتدا میں اپنے ہم جماعت لڑکوں کو شعر موزوں کر کے سنایا کرتے تھے۔ مصرعے موزوں کرتے تھے۔ ہائی اسکول حامد اسکول رامپور ۱۹۴۹ء میں پاس کیا۔ رضا انٹر کالج سے انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا، لیکن تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ رضا شوگر فیکٹری میں کچھ عرصہ ملازمت کی۔ ۱۹۵۳ء سے ہائیڈرو الکٹرک یوپی میں ملازمت اختیار کی۔ تعلیم وتربیت حقیقی پھوپھا لطیف الرحمٰن خانصاحب

لطیفؔ رامپوری کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ مرحوم نے شاعری کا ذوق دیکھتے ہوئے اپنے استاد محشرؔ عنایتی کا شاگرد کرا دیا۔ لاتعداد ریڈیو پروگرام اور بے شمار آل انڈیا مشاعروں میں شرکت کی اور کامیاب رہے۔ اخبارات و رسائل میں متعدد بار کلام شائع ہو چکا ہے۔ مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، گجرات، کلکتہ کا سفر کیا۔

نمونۂ کلام:

شعارِ ضبط کرو اختیار کہتے ہیں
عجیب بات مرے غمگسار کہتے ہیں

ثباتِ گل کا چھڑا تذکرہ تو بات کھلی
چمن میں حسنِ نظر کو بہار کہتے ہیں

شکایتوں کے نہیں، وہ دعا کے قابل ہیں
جنھیں رفیق، جنھیں غمگسار کہتے ہیں

اس کا تو غم نہیں کہ نشیمن اجڑ گیا
اس کا قلق رہے گا کہ دن تھے بہار کے

نہ ہے نصیب کہ منزل ہے بے نشاں اب تک
لئے ہوئے ہے مجھے گردِ کارواں اب تک

بہار آئی تو اُس کی بہار کیا ہوگی
رہا ہے وقفِ حوادث جو گلستاں اب تک

قفس نصیب ذرا دیکھنا چمن کی طرف
وہ دے رہا ہے دھواں کیسا آشیاں اب تک

جنونِ عشق زیادہ دنوں کی بات نہیں
بٹی ہیں جیب و گریباں کی دھجیاں اب تک

میں چھوڑ دوں گا نشیمن مگر لحاظ رہے
کہ میں نے خون سے سینچا ہے گلستاں اب تک

جب سے دل میں ترے بخشے ہوئے غم ٹھہرے ہیں
محترم اور بھی اپنے لئے ہم ٹھہرے ہیں

دیکھتا یہ ہوں کہ شاید ترا کوچہ، ترا در
سوچتا یہ ہوں کہاں آ کے قدم ٹھہرے ہیں

ہم تری راہ میں اُٹھے ہیں، بڑے عزم کے ساتھ
گردشِ دہر بھی ٹھہری ہے جو ہم ٹھہرے ہیں

غم کے ہر دور میں ٹھہرائے گئے حاصلِ زیست
اور اس دور میں ہم صاحبِ غم ٹھہرے ہیں

آرائشِ بہار کا ساماں کہاں سے آئے
یعنی جنوں میں روز گریباں کہاں سے آئے

انسان ملے تو دولتِ کونین بھی نثار
لیکن سوال یہ ہے کہ انساں کہاں سے آئے

اتنا بھی کوئی پوچھنے والا نہیں رہا
حیراں کہاں سے آئے، پریشاں کہاں سے آئے

کون کہتا ہے کہ پی کر دور ہو جاتے ہیں غم
اور یاد آتی ہیں باتیں اور تڑپاتے ہیں غم

احتیاط و ضبط بن جاتا ہے جس دل کا مزاج
مسکراہٹ کے حسیں پردے میں چھپ جاتے ہیں غم

مدت سے نہ جانے کیوں پلٹے نہیں دیوانے
معلوم یہ ہوتا ہے راس آ گئے ویرانے

ملتے ہیں محبت میں کچھ ایسے بھی دیوانے
دنیا سے شناسائی اور اپنے سے بیگانے

ہم نے تو رئیسؔ اپنی حالت یہ بنالی ہے
فرزانوں میں فرزانے، دیوانوں میں دیوانے

قطعات

اکثریت میں دشمن صفت دوست ہیں
جن سے محفوظ رہنے کا امکاں نہیں

ان سے بچنا بھی ہے، ان سے ملنا بھی ہے
اور یہ بھی کوئی کارِ آساں نہیں

اُٹھنے کا ہر کسی سے نہیں بارِ دوستی
سچ ہے کوئی مذاق نہیں کارِ دوستی

یارو! نظر میں اب مری جچتا ہی کچھ نہیں
تم نے بڑھا دیا ہے وہ معیارِ دوستی

مغموم و رنجور ہو وہ بھی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
عیش و طرب سے دور ہو وہ بھی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

جس سے میں طالب ہوں مدد کا جس سے مجھے اُمیدیں ہیں
میری طرح مجبور ہو وہ بھی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

سیکڑوں غم ہیں اور تنہا دل
جیسے کچھ زندگی سے اَن بن ہے

اب تو ہم سوچتے ہیں یہ اکثر
دل ہے یا حسرتوں کا مدفن ہے

وہی ہوتا ہے جو بھی ہے مقسوم
بعد از تجربہ ہوا معلوم

نہ خرد مند ہیں، نہ ہم ناداں
بلکہ حالاتِ وقت کے محکوم

جلیل خانصاحب نعمانی

ہوا چل کر جو بادل چھا گئے ہیں
مری آنکھوں میں ڈورے آ گئے ہیں

بہار آئی ہے اور آتی رہے گی
مگر وہ پھول جو کمہلا گئے ہیں

عیادت کی خوشی غم ہوگئی ہے
وہ چشمِ ناز پر نم ہوگئی ہے

مزاج دوست برہم توبہ توبہ
مری تقدیر برہم ہوگئی ہے

خدا حافظ ہے اب رازِ چمن کا
نسیمِ صبح محرم ہوگئی ہے

میکدہ اور گردشِ ایام
کسی ساغر میں ڈھل گئی ہو گی

کیا کریں گے قفس سے چھوٹ کے ہم
اب تو دنیا بدل گئی ہوگی

لطیفؔ

لطیف الرحمٰن خاں صاحب ولد الطاف الرحمٰن خاں صاحب

مدینہ کی فضا ایسی حسیں معلوم ہوتی ہے
کہ دنیا میں یہی خلدِ بریں معلوم ہوتی ہے

میں جب سجدہ کی خاطر خاک پر سر اپنا رکھتا ہوں
جبیں اپنی مجھے عرش بریں معلوم ہوتی ہے

نہیں وہ جا جہاں کلمہ نہ جاری ہو محمد کا
یہ دنیا ان کے سب زیرِ نگیں معلوم ہوتی ہے

بارِ احساں کیوں اٹھاؤں، فکرِ رہبر کیوں کروں
جب ہے ذوقِ دید میرا راہبر میرے لئے
کچھ زمیں دے دے خدا یثرب میں گر میرے لئے
تو میں سمجھوں بن گیا جنت میں گھر میرے لئے

محمدؐ کے جانی، خدا کے پیارے علی اور حسین و حسن کے دلارے
بھنور میں سفینہ ہے بہتا ہمارا لگا دو اسے غوثِ اعظم کنارے

....

عزت اتنی فیضِ خواجہ سے بڑھی اجمیر کی بن گئی باغ ارم ہر اِک گلی اجمیر کی
تھے نہاں ظلمت میں جو ذرّے وہ تاباں ہو گئے شمع روشن چشتیہ جیسے ہوئی اجمیر کی
تیری وہ شمع بدر روشن ہے مدینہ میں مدام دیکھ حالت ذرا اس شمع کے پروانوں کی
کھا کے کہتا ہوں سراپائے محمدؐ کی قسم دل میں قرآن کی تفسیر لئے پھرتا ہوں
دید مولا کی ہو، آقا کی شفاعت ہو نصیب حشر میں اس لئے تقصیر لئے پھرتا ہوں

اشرفؔ

اشر یار خاں صاحب شاہ آبادی ولد ہادی یار خاں اعظم خاں صاحب رئیس سید بخیل کے بھائی ذہین و تیز فہم تھے، موزوں طبع تھے، منشی امیرؔ مینائی کے شاگرد تھے۔ مہیوہ کی ریاست میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اپنی حسن تدبیر سے وہاں کے کاروبار میں رونق پیدا کر دی۔ اُن کی کارگزاری پر اس قدر اعتماد ہے کہ راجہ کے خاندان کے ممبر سمجھے جاتے ہیں بیاض کی شکل میں کلام جمع نہیں کیا۔

نمونۂ کلام

شبِ وصل دستِ تمنا کے ہاتھوں چلے گا نہ پھر چلبلا پن کسی کا
پسِ مرگ اک داغ کافی ہے اشرفؔ کرے گا یہی نام روشن کسی کا

مولوی حسن علی خاں صاحب

تارین پٹھان محلہ نالہ کے باشندے افضل خاں رئیس دریاپور کے بزرگوں میں تھے۔ ظلم کے خلاف شمشیر برہنہ، عالمِ باعمل، کئی سو احادیث کے حافظ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی صحبت کے فیض یافتہ، دین داری کا اثر بہت غالب تھا۔ حق کے معاملہ میں کسی کی مروّت نہ کرتے تھے، امانی خان صاحب رئیس محلہ مہمند جو سمندر خاں کے فرزند تھے اور مبارز خاں کے پوتے ایک ذی وجاہت شخص تھے، دُنیاوی حیثیت سے ذی عزت اور دینداری کے لحاظ سے حضرت شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی کے خلیفہ تھے، شاہ آباد کے پٹھانوں میں اُن کا بنگلہ خوبصورتی میں ضرب المثل تھا، ان کے باغ میں کسی شخص کا ایک آم کا درخت شامل ہوگیا، وہ شخص مولوی صاحب موصوف کے پاس شکایت لے کر آیا اِس کی حمایت پر ایسے آمادہ ہوئے کہ تلوار لے کر امانی خاں کے یہاں محلہ مہمند میں آئے اور خانصاحب کو ایسا سخت پکڑا کہ درخت مذکور باغ سے اسی وقت علاحدہ کرا کے اس غریب کو دلوا دیا۔ اسی طرح مولوی شیخ ثناء اللہ صاحب جن کو مناظرہ میں اچھی دستگاہ تھی۔ ایک بار انہوں نے نواب دوست علی خاں صاحب تعلقدار باسط نگر کو اسلامی طریقہ سے سلام کیا۔ خانصاحب نے اس بات کو ناپسند کیا۔ چونکہ مولوی صاحب نورباف تھے شیخ جی نے مولوی صاحب موصوف سے کہا۔ بس مولوی صاحب شمشیر برہنہ ہاتھ میں لے شیخ جی کو ساتھ لے کر نواب صاحب کی ڈیوڑھی پر جا پہنچے اور اسی طریقہ سے سلام علیک کرایا اور کہا اس امر میں مودب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، دینی معاملات میں ہر شخص کو ہمسری کے حقوق حاصل ہیں، ریاست کے امور اور ہیں۔ شعر کہتے تھے مگر کلام دستیاب نہ ہوسکا۔

مولوی محمد سلطان خانصاحب

فرائض کے سخت پابند اور صاحبِ تصنیف عالم تھے۔ محلّہ احاطہ میں مکان تھا۔ ان کے فرزند عبدالرحمٰن خاں تھے۔ ۱۸ ربرس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ قصص الانبیاء فی احوال الاصفیا، زینت مستقطبین، اور رشید المومنین اُن کی تصانیف ہیں۔

مولوی صاحب نے پٹھانوں کا شجرہ حضرت ابوالبشر آدم تک نہایت تحقیق سے مرتب کیا ہے۔ علی گڑھ کے کلکٹر کی سر رشتہ داری کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ناجائز مال سے قطعی پرہیز رہا۔ ۴۵ ربرس کی عمر میں انتقال ہوا۔ شعر بھی کبھی کبھی کہتے تھے مگر کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

تذکرہ شعرائے فرخ آباد

تالیف مفتی محمد ولی اللہ فرخ آبادی

آہ

حکیم امان اللہ خاں۔ اپنے چچا کے بعد طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔

افسوس آہ تجھ میں اتنا اثر نہیں ہے — رونے سے تیرے اب تک اُس کو خبر نہیں ہے

عجب تیری تاثیر اے آہ دیکھی — نہ آیا تو پیارے بہت راہ دیکھی

خادم

خادم علی خاں۔ از بزرگ زادگان قصبہ کیتھیل وداماد قادر علی خاں، خوش نویس ودر حفظ کلا الٰہی ونظم ونثر شاگرد حافظ غلام محمد مرحوم وخط نستعلیق بہ وضع میرزا محمد علی وخط نسخ بہ وضع یاقوت رقم خاں محمد عارف وخط شکست بہ وضع کفایت خاں وخط شفیع بہ وضع جدید خوش مے نوشت از دست۔

"قاسم نے لکھا ہے کہ دیوان فارسی اور دیوان اردو ان کا مرتب تھا اور یہ کہ اشعار وہ میر کو دکھاتے تھے۔"

صابر

حاجی اللہ یار خاں، برادر عینی قاضی محمد یار خاں ومحمد شفیع خان، از چند سال بہ سفر حج وعتبات عالیہ رفتہ از حالش خبر نیامدہ از دست۔

عاشق کے خونِ دل کو جو ہر دم ملا کرے — ہاتھوں میں پھر وہ رنگِ حنا مَل کے کیا کرے
پھاڑے چمن میں رشک سے گل پیرہن وہیں — گلشن میں آ کے بندِ قبا گر وہ وا کرے
اُٹھتا نہیں ہے درد جدائی کا دیکھیے — کب تک غمِ فراق اذیت دیا کرے

طبیب

غلام مصطفٰے خان ولد حکیم ممتاز علی نوجواں ازیں جہاں رفتہ از دست۔

جو وہ خانہ آباد نظر آیا — تو حسنِ خداداد نظر آیا
ہر کسی کا گداز کرنا دل — آپ کی ساری کیمیا ہے یہ

فدا

حافظ الف خاں۔ مردے صاحب طبع بود و در فارسی و ہندی شعرمی گفت

خون تن آتشِ فرقت سے ہے اخگر مانند
دل ہے اسپند صفت، سینہ ہے مجمر مانند

جوہری کیوں نہ کرے رشک اسے دیکھو بھلا
صدفِ چشم میں جو اشک ہے گوہر مانند

بال پرواز نہ صیاد نے رکھے باقی
قفسِ تن میں ہے دل طائرِ بے پر مانند

مکتبِ عشق میں کی عشق جنوں جب سے شروع
تنِ لاغر ہے مرا رشتۂ مسطر مانند

ہجر میں لیلیٰ کی جیوں قیس کفِ پا میں مرے
خار صحرائے جنوں چبھتے ہیں نشتر مانند

اے فدا بہرِ خدا ہاتھ سے مت دامن چھوڑ
شافعِ حشر ہے کون آلِ پیمبر مانند

کمتر

شاہ کمتر پدرش اسلم خاں۔ از عمدہ ملازمان سرکار نواب احمد خاں بودہ واو بعد وفات پدر طریقۂ درویشی اختیار کردہ مرید شاہ حسن اللہ دہلوی گشت و بعد ازاں بہ لکھنؤ رفتہ دست بہ عقیدت خواجہ حسن دہلوی، از فرزندان خواجہ کہاری دادہ بعد ۱۲۴۰ھ ازیں جہاں رفت بہ دارالآخرۃ کشید، شعر ہندی بہ ہر نوع بسیاری گفت و فارسی کمتر، کلیاتش متجاوز از صد ہزار است۔

تجھے چھوڑ کر میں اگر جاؤں گا
تو پھر دو جہاں سے گزر جاؤں گا

جلاتا ہے ٹھوکر سے پیارے تو مردہ
قدم نیچے کل تیرے مر جاؤں گا

جو کاٹے ہے یہ تیغِ ابرو زیادہ
میں سینہ کی لے کر سپر جاؤں گا

مرے پاس جس وقت آتے ہو صاحب
تو کہتے ہو اب میں کدھر جاؤں گا

جو اِک آن ہنسنا تو اِک آن رونا　　میں اوقات یوں کر بسر جاؤں گا
تجھے دیکھ بسمل لگا ہنس کے کہنے　　نہ گھبرا ترا کام کر جاؤں گا
بقا کس کو ہے دارِ فانی میں کمتر
رہا آج کل کر سفر جاؤں گا

محبت

محبت خاں ولد ارشد حافظ الملک حافظ رحمت خاں، حالات کے لئے مجموعہ نغز اور گلشن بے خار۔

باز تشریف زشفقت سوئے ما آوردی　　خوش بیا اے غمِ جاناں کہ صفا آوردی
بہرِ من رنج وغم واندوہ والم　　آہ اے عشق چہ گویم کہ چہا آوردی
کردہ بودیم وفاہا وجفاہا دیدیم　　برتو ایں بود حقِ ما کہ بجا آوردی
پیش آں خسرو خوباں چہ بری نذرِ حقیر　　رد محبت تو دل خویش کجا آوردی

مہربان

مہربان خاں، از عمدہ سردارانِ دولت نواب احمد خاں بودہ ودر آں سرکار عہدہ دیوانی داشت واکثر شعرا شاہ جہاں آباد را بہ آسودگی نگاہ می داشت از دست۔

میں تو غلام دل سے ہوں اُس مہربان کا　　غنچہ بھی زر خرید ہے جس کے دہان کا
دھمکا نہ مجھ کو بوسہ پہ اے یار ہر گھڑی　　شرمندہ میں نہیں ہوں ترے ایک پان کا
یہ کہکشاں نہیں ہے، مرے غم کو دیکھ کر　　سینہ پھٹا ہے ہول سے اب آسمان کا

ممنون ہوں میں اپنے دلِ ناتوان کا　　　سن مہرباں گلی سے صنم کے نہ سر اٹھا

ناصرؔ

محمد ناصر خاں داماد نواں قاسم علی خاں، عالی جاہ، و پدر محمد قاسم خاں شاعر زبردست بود۔ وکلامش پہلو بہ بہ کلام نظامی می زند در قصہ لیلیٰ و مجنون مثنوی دارد۔ بہ غایت جودت دراں مثنوی بہ مدح عشق می فرماید۔

برسر کہ زعشق باخبر نیست　　　ہاں برسر سنگ زن کہ سر نیست
آباد حریم دل زعشق است　　　آمیزشِ آب وگل زعشق است
عشق است کہ ہر فلک رساند　　　عشق است کہ ملک نشاند
سرمایۂ افتخارِ عشق است　　　مجموعۂ اعتبارِ عشق است
مقصد زوجود چیست جز عشق　　　درمحفل بود کیست جز عشق
عشق آمد درونق جہاں دارد　　　عشق آمد وجسم ودل وجاں دارد
تاہست جہاں جہاں عشق است　　　تاہست مکان مکان عشق است
آئینہ پرتو خدا عشق　　　معمور ز ارض و تا سما عشق
سرجوش شرابِ ناب عشق است　　　سوزِ جگر کباب عشق است

ناظرؔ

امام الدین خاں۔ از مردم شاہ جہاں پور، صاحب فہم بود، و در شاعر ہا شعر وے پسندی افتاد از دست۔

دخل دے کر بزم خلوت میں ہر اک دم ساز کو
مت سبک فرمائے یوں قدر حسن و ناز کو

سرو بالا تجھ میں جو انداز ہے رفتار کی
کبک کیا جانے ہے اس رفتار کے انداز کو

رات میرے حق میں کیا ارشاد فرماتے تھے آپ
پاس بٹھلا کر رقیبانِ فسوں پرداز کو

مت ہماری لاش کر جلوہ فرمائی دریغ
ہم بھی دیکھیں اے مسیحا دم ترے اعجاز کو

یوں تو اے صیاد اب مطلق مری پروانہ کر
مرغ پر بستہ بھی ہوتے ہیں کہیں پرواز کو

دل میں اس کے کچھ تو تیرے عشق نے تاثیر کی
ورنہ کب میلِ محبت تھا بتِ طناز کو

کل وہ آہو چشم نا ظر آ کے میرے دام میں
آہ کیا رہ گیا سن کر تری آواز کو

نواب امداد حسین خاں بہادر جنگ

او فرزند نواب مظفر جنگ وولادت وے در ۱۱۹۷ھ ست وناصر جنگ میل بہ سخن ہم داشت۔

بکھری ہوئی چہرے پہ پڑی زلفِ رسا ہے
زنجیر ہے یا دام ہے، ناگن یہ بلا ہے

وہ دست حنا بستہ مرے ہاتھ میں ہے آج
رنگین یہ مضمون مرے ہاتھ لگا ہے

ایمانؔ

رحم علی خاں ولد بہرہ مند خاں از فرزندان نواب پر دل خاں سکندری است۔ کتب درسیہ گزرانیدہ بخدمت مولوی غلام نبی بریلوی۔ و غلام حسین و کتب نظم و نثر فارسی گزرانید و بخدمت میاں جیو تھن بریلوی از مشاہیر معلمین آں جا بودہ ورحم علی خاں تصانیف دارد در فارسی خلاصۃ العلوم و مطلوب طالب، و مصباح حبیاں و تذکرہ شعراء و مصطع الشعراء وفات او در ۱۲۲۶ھ است مقبور در سواد فرخ

آباد بیروں دروازہ گاہے شعر ہم می گفت وایمان تخلص می کرد از دست۔ اردو اشعار نہیں ملے۔

نواب عبدالباقی خاں

ولد حمید الدین خاں نبجۂ عالمگیری کہ بعنایت معتمد عالمگیر بود در عہد نواب احمد خاں آمدہ در فرخ آباد بہ محلہ گنج خانہ بہ کرایہ گرفتہ سکونت داشت میل بہ شعر ہم داشت از دست

سلسلۂ عشق میں جو گبرو مسلماں دیکھے
زُلف کی طرح سبھی ہم نے پریشاں دیکھے

شوکت

نواب خادم حسین خاں بہادر شوکت ولادت بتاریخ ۲۸ر صفر ۱۲۱۷ھ است۔ بعد وفات ناصر جنگ مسند نشیں شدو بتاریخ ۲۹ر شوال ۱۲۳۸ھ جان بہ جاں آفریں سپرد میل بہ گفتن شعر ہم داشت از دست۔

بہ سانِ نقش پائے رہ رواں ہم — رہے ہیں اک نشانِ رفتگاں ہم
سمجھ کر بیت بجٹی کرتو بلبل — پڑھے ہیں گلستاں اور بوستاں ہم
سینۂ داغ دار کی صورت — بن گئی لالہ زار کی صورت
دیکھو سیماب سے مشابہ ہے — اس دلِ بے قرار کی صورت
ہوش بھی اڑ گئے بہ رنگِ حنا — دیکھ کر اس نگار کی صورت

دیکھ شوکت جو روئے جاناں کو
پھر نہ دیکھی بہار کی صورت

ہو رہے ہو جو تم خفا مجھ سے | کون سی ہوگئی خطا مجھ سے
عرق ہو جاوے غرق بحر فنا | تو اگر ہووے آشنا مجھ سے

چشم تر ہے جو تیری اے شوکتؔ
کچھ بیاں کر تو ماجرا مجھ سے

نواب محمد قاسم خاں

خلف نواب محمد ناصر خاں۔ شعر نغزی فرماید۔ اردو میں اشعار نہیں ملے۔

گلشن ہمیشہ بہار

عبدالعلیم خاں خیشگی احمدی خورجوی

اسدؔ

اسد خاں مشہور بہ فتح خاں از عالی خاندان خواجہ است از قوم خلیل راقم الحروف نسب ہمشیر زادگی۔ دفرزندگی بآں والا تبار وحاتم دوراں دارد وکسب سخن از فارغ شاہ خورجوی کردہ در حلقہ زبان اوزاں نامی جلسہ اہل علوم گرامی ید شد عمر کہ زاہد از شصت سال خواہد بود اوصاف جمیلہ وحماید نبیلہ برگزیدہ انفس وآفاق برزبان خلایق نہ جاری است۔ نتایج افکار آن۔ بزرگ بدست

خلایق رسیدہ فکر عالی در ہندی دار داز دست۔

جو رو جفا سے پیارے دل چور ہے ہمارا
تس پر بھی قتل تم کو منظور ہے ہمارا

اِک عمر ہوگئی ہے آنکھوں کو بہتے بہتے
جاری نہ آجکل سے ناسور ہے ہمارا

اس دل نے لا کے یارو بندِ قفس میں ڈالا
ورنہ تو آشیانہ بس دور ہے ہمارا

پہنچا ہے عاشقی سے از بسکہ فیض ہم کو
ہر شہر میں اسد خاں مذکور ہے ہمارا

کیا ہوا گر چشمِ نم سے خوں ٹپک کر رہ گیا
بادۂ گلگوں کا ساغر تھا ٹپک کر رہ گیا

تحتِ دل آیا تھا یار واشک کے ہمراہ وہ
نوکِ مژگاں تک جو پہنچا پھر اٹک کر رہ گیا

ایک کیا کوہِ طور، جل جاتے یہ سب ارض وسما
خیر تھی اس میں کہ ذرہ ہی چمک کر رہ گیا

آتشِ فرقت سے تیری شمع رو یکبارگی
تن مرا جوں خار وخس تھا سب بھبک کر رہ گیا

روزِ اُلفت تھا جو کچھ قیس نے پہچانا تھا
عین ہشیار تھا اُس فن کا نہ دیوانہ تھا

کیا مجھ کو شعور گفتگو کا
جو بات کہی اس میں چوکا

جینے کی ہوس، نہ موت کا غم
میں سر سے گزر چکا کبھو کا

قسمت پہ ہے وصلِ یار موقوف
یہ کام نہیں ہے جستجو کا

ساغر کو میرے تو بھر دے ساقی
کیوں بند کیا ہے منہ سبو کا

اس جا سے اسد کو مت اُٹھاؤ
بیٹھا ہے یہ منتظر کسو کا

اُس کماں ابرو نے یہ کیا کام شائستہ کیا
تیرِ مژگاں سے غریب عاشق کا دل خستہ کیا

زندگی رندوں کی کیونکر ہوگی اے پروردگار
محتسب نے میکدہ کا بند اب رستہ کیا

ایک بوسہ پر لگا تو بیچنے دل کے تئیں
اے اسد کیوں گوہرِ نایاب کو سستا کیا

شکل یوسف کی کہاں اور اے پیارے تم کہاں　　همسرِ خورشید ہو پر طاقتِ انجم کہاں
اے مسیحا دم تو اپنے کشتگاں کی لے خبر　　منتظر اعجاز لب ہیں پھر صدائے قم کہاں

آشفتہ

عظیم الدین خاں عرف بھورے خاں، افغان کے از تلامذہ میر محمدی مائل است گویند دست از تعلقات دنیا و مافیہا برداشتہ در عالم تجرد و تفرد علم آزادی برافراشتہ اخیر ہا توبہ از شاعری نمودہ۔

آشفتگی ہماری ہر لحظہ یاں ہے تازہ　　شیدا ہیں اس پری پر ہم گرچہ مدتوں سے

امیر

نواب علی محمد خاں افغان در فن سخن وری تلمیذ قیام الدین قایم است بقدر و منزلت جلیل واوصاف جمیل بودہ۔

ہائے سرخی تیرے رخسار کی ہنگامِ عتاب　　جتنا بگڑے ہے تو اتنا ہی سنور جاتا ہے

امیر

امیر خاں، از افاگنہ نگینہ متعلقہ بجنور۔ حصہ شمالی مراد آباد است مرد روزگار پیشہ است طبع خوش دارد و شعر دلکش گوید از بس متقی مزاج است از اذکار اوست۔

نشانِ عشق کب موقوف ہے چہرے کی زردی پر
سدا ہم سرخرو ہیں دیدۂ خونبار کے باعث

امینؔ

امین الدین خاں خلف وحید زماں فرید دوراں قاضی وحید الدین خاں بود مردے صلاحیت شعار خجستہ اطوار در عصر خود بودہ میگویند کہ در عہد نواب غفران پناہ افسر وزراء عالی مقام نواب نجیب الدولہ منصب قضائے دہلی باوالد ماجدش نامی وسامی بود۔

کون آتا ہے، یہ کس کے پاؤں کی آواز ہے
ہر صدائے پا میں جس کے سوطرح کا ناز ہے

حسینؔ

نواب غلام حسین خاں۔ یکے از اعزہ ورؤساء افاغنہ شاہجہاں پور بودہ نوشتہ اند کہ در حسن واخلاق ثانی خود نداشت۔

میں تو تدبیر میں تھا زخمِ جگر کی مصروف — دل میں پہلو بھی نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
اُن کے ملنے کی کوئی راہ نکل آئے گی — بیقراری تو مجھے اس کے تو در تک پہنچا

حکیمؔ

محمد پناہ خاں است کہ فرزندار جمند محمد شریف خاں۔ از تلامذہ خواجہ میر دردؔ بودہ۔

خیالات نازک اودل پسند ہر خردمند است

پوچھتے کیا ہو حکیمِ جگر افگار کا گھر
ایک تکیہ سا ہے اُس شوخ کی دیوار کے پاس

تیرے لئے خلق در بدر ہے
اے خانہ خراب تو کدھر ہے

ہم تھے صنم کے غم میں نہ ایمان سے گئے
کتنے ہی بندگانِ خدا جان سے گئے

خردؔ

نواب فخر الدین محمد خاں فرزندار جمند نواب شرف الدین محمد خانصاحب است در عنفوان جوانی بہ نکتہ دانی شہرت داشت و باصرار محبان باوفا و دوستاں باصفا مضموں خوش دلکش می نگاشت فردے از طبع موزوں اوست۔

لبوں پہ جان ہے جلدی پہنچ کہیں ظالم
یہ آرزو ہے کہ دم میرے روبرو نکلے

دلؔ

زور آور خان متوطن کول است از دست۔

گل ہیں مکھڑے سے خجل اور آنکھ سے نرگس کے پھول
باغباں تیری نذر کو چمن کے لاؤں کس کے پھول

یہ نہیں خوب مجھے دن ہو، تجھے رات پسند
دوستی جب ہے کہ ہم تم کو ہو اک بات پسند

ہوتے ہیں میری چشم سے اب اشک رواں پھر
پوشیدہ میرے راز کو کرتے ہیں عیاں پھر

دلسوز

خیراتی خاں متوطن قصبہ پٹل از افاغنہ آنجاست۔ بسرکار نواب ظفریاب خاں باریاب بود۔ از دست۔

فکرِ فراق کے صدموں سے لالہ زار رہا — یہاں خزاں میں سدا موسمِ بہار رہا
تپ فراق کے بیمار کی جو دیکھی نبض — طبیب کو بھی کئی دن تلک بخار رہا

ذکاء

ذکاء اللہ خاں از دودماں نواب محبت خاں ابن حافظ رحمت خاں مغفور بودہ کہ جلالت شاں ابالش طشت از بام افتادہ از دست۔

آہ کس طرح سے اُس پردہ نشیں کو دیکھوں — اس کے گھر میں تو کوئی روزنِ دیوار نہیں

رند

مہرباں خاں نوصل گزیاں احمد خاں بنگش است از دست

جس کا تجھ سا حبیب ہووے گا — اس کا عالم رقیب ہووے گا
دل کا گھبرانا کہوں یا نفس کی تنگی — دیکھیے کیا کرے صیاد قفس کی تنگی

راز

برہان الدین خاں، خط شکست اور خوشنویسی کے ماہر۔

چرخ کے کیسے انقلاب ہوئے — پر کبھی ہم نہ کامیاب ہوئے

ذکی

جعفر علی خاں نام در ایام شاہ عالم بادشاہ امیری بودہ در سخن پر نظیر از دست۔

عشق میں نسبت نہیں بلبل کو پروانہ کے ساتھ
وصل میں وہ جان دے، یہ ہجر میں جلتی رہے

قمؔر صاحب گلشن ہمیشہ بہار

نصر اللہ خاں نام است صاحب گلشن ہمیشہ بہار اور در عہد صاحب قران ثانی از غزنی در قصور آمد پس ازاں در خورجہ آمدہ سکونت ورزیدند از دست۔

ہر چہ مد دنیا شد از نیرنگہا یار شد
برہمن شد شیخ شد صوفی شد و میخوار شد

اے ستمگر بتا سوا میرے
کون قائم ہے آشنائی میں

جب سے دیکھی تری کلائی ہے
جاں مجھ کو نہیں کل آئی ہے

تیرے کوچے میں اب مقیم ہوا
یہ بھی قسمت کی رہنمائی ہے

شعلۂ رخ دلربا کا یاد کر
خود بہک کر آپ جل جاتے ہیں ہم

محبؔت خاں

محبت۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے بیٹے۔

جس کو تیری آنکھوں سے سروکار رہے گا
بالغرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے
آج چہرہ مرا بحال ہوا

آپ کچھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں
یہ جو ہو جھوٹ تو ہم ہاتھ قلم کرتے ہیں

بیٹھنے دیوے نہ وہ بزم میں اپنی جو مجھے
تو اُٹھالیجیو اے بارِ خدایا مجھ کو

منصف

منصف علی خاں۔ از افاغنۂ عظیم آباد است۔

خیال جائے ترا کیونکر میرے سینہ سے
جدا ہوئے ہیں کہیں نقش بھی نگینہ سے

والہ رحمت خاں کشمیری

گنے جو بندوں میں اپنے تو ایک بار مجھے
تو خلق میں ہو خدائی کا اعتبار مجھے

ہے عیاں جلوہ ترا انسان کی تصویر سے
صورتِ معنی ہو ظاہر نقطۂ تحریر سے

ہمت

اخوندزادہ از رام پور است صاحب علم و مائل سخن ذی شعور بیتی از وے مسطور است۔

عجب گردش میں اپنے ان دنوں اوقات کٹتے ہیں
غنیمت ہیں کوئی ساعت جو تیرے ساتھ کٹتے ہیں

عاصی

محمد علی خانصاحب محمد نیاز خانصاحب رام پور میں پیدا ہوئے۔ محلہ گھیر عثمان خاں میں مکان ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی کی تکمیل احمد علی خانصاحب عرف امن خانصاحب بیخود

اپنے حقیقی چچا سے کی۔ انگریزی میں انٹرنس پاس کیا۔ اس کے بعد کانپور سے زراعت کی سندلی، برٹش گورنمنٹ میں گرداور قانون گو کے عہدہ پر رہے۔

پنشن کے بعد رام پور میں تحصیلدار ہو گئے۔ حرکت قلب بند ہو جانے سے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۵۳ء میں انتقال ہوا۔ کنڈے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ۶۶ برس کی عمر پائی۔ لمبا قد، چھریرا بدن، رنگ گورا، داڑھی صاف۔ کلام زیادہ تر تہنیتی نظموں اور سہروں پر مشتمل ہے۔

تجلی طور کی یا حسن روز افزوں ہے جاناں کا
کہ جس کا دیکھنا ہرگز نہیں ہے کام انساں کا

مسیحا جا چھپے چرخ چہارم پر ندامت سے
ہوا شہرہ جہاں میں جب لب جاں بخش جاناں کا

برق جا سکتی نہیں جلوۂ جاناں کے قریب
مہر و مہ آ نہیں سکتے رخ تاباں کے قریب

یہ عجب طرح کا پردہ ہے کہ دیکھا نہ سنا
نظر آتے نہیں، رہتے ہیں رگِ جاں کے قریب

کچھ نہیں خوف و خطر روزِ جزا کا مجھ کو
اس کی ہر وقت ہے رحمت مرے عصیاں کے قریب

حسد و بغض کچھ آپس کے ہیں ایسے عاصیؔ
کہ مسلماں نہیں جاتا ہے مسلماں کے قریب

حشر میں وسعتِ رحمت کا کھلے گا تری حال
جب گنہگاروں کو خود ڈھونڈے گی رحمت تیری

دشمن جاں ہوا ہر گبر و مسلماں میرا
باعث رشک ہوئی مجھ پہ عنایت تیری

عاشق

مبارک علی خاں ولد ماضی، استاد چار بیت تھانہ کنڈہ کے محلہ میں مکان تھا، صیغۂ پولیس میں کلرک تھے۔ شاعری میں محمد اسماعیل خاں صبرؔ کے شاگرد تھے۔ ۱۹۱۳، ۱۹۱۴ء میں محلہ راجدوارہ میں انتقال ہوا۔

نمونہ کلام

بگڑی ہوئی یہ اپنی تقدیر نظر آئی — ملنے کی نہ کچھ اس کے تدبیر نظر آئی

ملنا جو کیا ہم سے موقوف صنم تو نے — کیا مجھ سے بھلا ایسی تقصیر نظر آئی

وہ ترچھی نگہ اس کی اور ناز بھری چتون — اِک آئی نظر خنجر، اک تیر نظر آئی

عاشقؔ

حضرت شاہ خاں ولد بہادر شاہ خاں، قوم پٹھان رام پوری، جناب عالیہ کے مقبرہ کے پاس رہتے تھے۔ پلٹن میں حولدار تھے۔ فن شعر میں شمیم امروہوی کے شاگرد تھے۔ اپنے شاگردوں کے کلام پر بھی اصلاح دیتے تھے۔ ۱۹۲۶ یا ۱۹۲۷ء میں انتقال ہوا۔ نمونہ کلام

اِک آہ پر اس بت نے گھونگھٹ سے مجھے دیکھا — تدبیر کے برقع میں تقدیر نظر آئی

کافر کے خط و رخ کے سجدے میں جھکا عاشق — اللہ کے ہاتھوں کی تحریر نظر آئی

دیکھیں کدھر کو جائیں گے نکلیں تو گھر سے آپ
ممکن ہے بچ کے جائیں ہماری نظر سے آپ

کیا ہی فتنے تھے ان کے قامت میں — حشر برپا کیا قیامت میں

رفتہ رفتہ کھلے گی دل کی کلی — کچھ ابھی بے کلی ہے قسمت میں

میکدے میں بنے مزار اپنا — مے بھی ہو فاتحہ کے شربت میں

دل کو بھی عشق ہو گیا عاشق — یہ بھی بگڑا ہماری صحبت میں

یاں وعدۂ فردا پہ قیامت کی خوشی تھی — کیا حشر کیا آپ نے محشر میں مکر کے

ہنس بول لئے جن سے وہ سب روئیں گے عاشق — اس زندہ دلی کا ہمیں لطف آئے گا مر کے

بس گئی دل میں تری زلفِ دوتا کی صورت — اتری شیشے میں پری بن کے بلا کی صورت

شکلِ عاشق نظر آئی تو وہ بولے ہنس کر — دیکھ لے جس نے نہ دیکھی ہو وفا کی صورت

دل تھامے ہوئے خود وہ نکل آئیں گے گھر سے — یوں دل کی حقیقت پسِ دیوار کہوں گا

آج اپنے قتل کا سامان ہو کر رہ گیا — حلق پر رکھتے ہی فوراً مڑ کے خنجر رہ گیا

یاد تو آیا تھا میں ان کو مگر افسوس ہے — ذکر میرا محفلِ جاناں میں چل کر رہ گیا

نہ کوسو کہ یارب ترا ہاتھ ٹوٹے — تمہارے گلے میں حمائل یہی ہے

تمہارے ستم کی نہیں کچھ شکایت — حسینوں کی عادت میں داخل یہی ہے

عاقلؔ

محمد فدا علی خاں ولد بندہ علی خاں، رام پور میں پیدا ہوئے۔ محلہ راجدوارہ میں رہتے تھے شہر کے بڑے وکیلوں میں تھے۔ فارسی کی تعلیم مولوی عبدالعلی خاں رامپوری سے حاصل کی حضرت میاں مشتاق صاحبؒ کے معتقد تھے۔ حضرت موصوف خرے والی زیارت سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ عاقلؔ کا اصرار تھا کہ میرے گھر کے کل افراد کو بیعت فرمانے کی غرض سے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمائیے، چنانچہ موصوف نے ان کی دلدہی کی خاطر اپنے معمول کے خلاف عاقلؔ کے مکان پر تشریف لے جا کر کل خاندان کو حلقۂ ارادت میں داخل کیا۔ عاقلؔ کا انتقال ۷۵ برس کی عمر میں بروز جمعۃ الوداع رمضان ۱۳۳۳ھ مطابق اگست ۱۹۱۵ء میں ہوا۔ کنڈے کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ داغ کے شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام

جو کچھ اس کی ہے حقیقت کیا کہوں — آدمی ہے کس کی صورت کیا کہوں

کیا بتاؤں میں تجھے تصویرِ یار
تجھ میں جو جو ہے شرارت کیا کہوں

مجھ سے واعظ منزلِ جاناں نہ پوچھ
ہے وہاں حیرت ہی حیرت، کیا کہوں

اے شیخ تجھے واقفِ اسرار کہوں گا
ہاں صاحبِ سجادہ و دستار کہوں گا

جلدی نہ ہو انصاف میں اے داورِ محشر
میں عشق و محبت کے کچھ اسرار کہوں گا

یہ اچھی گھڑی ہے، مبارک ہو اے دل
کہ سوتا ہے وہ مستِ خواب اول اول

قیامت ہے وہ جب قیامت میں ہوگا
ہمارا تمہارا حساب اوّل اوّل

شوق سے کھنچوائیے دیوار، در کے سامنے
اس کی کیا بنیاد اُس شوریدہ سر کے سامنے

دل چرایا ہے مرا پوچھا تو صاف انکار ہے
یہ غضب اس پر کہ بیٹھے ہیں مکر کے سامنے

سحرؔ

جمیل احمد خانصاحب والد نصیر احمد خانصاحب (کے منجھلے بیٹے) گوجر ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد رامپور کے ہائی اسکول کے پہلے بیچ میں داخل ہوئے۔ پھر اپنے بڑے بھائی نذیر احمد خانصاحب ناظم ٹونک کے پاس چلے گئے۔ اس کے بعد رامپور آکر روشن باغ رامپور کے کارخانوں میں عرصہ تک بعہدۂ سپرنٹنڈنٹ ملازم رہے۔ میکینکل انجینئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس فن کو سمجھنے کے لئے تقریباً ایک برس تک کانپور میں رہے۔ وہاں سے آکر زمینداری کا کام کرتے رہے۔ شاعری سے دلچسپی تھی، منشی احمد علی شوق قدوائی سے تلمذ تھا، ۱۹۳۱ء میں بعمر ۶۵ سال رامپور میں انتقال ہوا۔ محلہ گوجر ٹولہ کے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔

نمونۂ کلام

بڑھی ہے بے خودی دیوانہ پن میں
کہ صحرا ڈھونڈتا ہوں انجمن میں

وہ چاہے جس کو مالا مال کردے
بھرا زر جس نے غنچوں کے دہن میں

مجھے ہستی میں بھی فکرِ عدم ہے
جیا کرتا ہوں امید و محن میں

نہیں دنیا میں کوئی غم سے خالی
ہیں لاکھوں چاک گل کے پیرہن میں

رکا بھی ہے کسی سے مرنے والا
مسافر چل دیا شوقِ وطن میں

جفا میں وہ، وفا میں مَیں یگانہ
ہر اک کامل ہے اپنے اپنے فن میں

ستم ہے چشمِ غارت گر پہ ابرو
غضب ہے تیغ دستِ تیغ زن میں

نشاطِ دل ہے دل کے ساتھ رخصت
خوشی کا کام کیا بیت الحزن میں

سَحر کافور ہیں آثارِ ظلمت
عیاں ہے روشنی صبحِ وطن میں

عزیزؔ

عزیز احمد خانصاحب ولد مولوی نصیر احمد خانصاحب، جمیل احمد خانصاحب سحر کے چھوٹے بھائی محلہ گوجر ٹولہ کے کھیر غوث محمد خاں میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ رام پور سے ہائی اسکول اور انٹرنس پاس کیا اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد وہیں سے ایل ایل بی کی سند لی۔ بریلی میں وکالت شروع کی۔ خداداد ذہانت نے شہرت عطا کی۔ بریلی کے چوٹی کے وکلا میں تھے۔ دیوانی اور فوجداری دونوں میں کامل دستگاہ تھی۔ یوپی کے ممتاز مقرر تھے۔ سیاسی خیالات نے جب مجبور کیا تو کانگریس میں

داخل ہو گئے اور مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ رہ کر عرصہ تک بحیثیت سکریٹری کانگریس میں کام کیا۔ کھدر پہنتے تھے۔ جب عدم تشدد کی تجویز پاس ہوئی تو اس سے اختلاف کرتے ہوئے لیگ میں داخل ہو گئے اور اس کے سرگرم نیز بہترین رکن ثابت ہوئے۔ کچھ ہی دنوں میں یوپی مسلم لیگ کے نائب صدر ہو گئے۔ آخر وقت تک یوپی اسمبلی اور مرکزی اسمبلی کے ممبر رہے۔ آخر زمانہ میں رامپور اسمبلی کے بھی ممبر رہے۔ قوتِ تقریر کا لوہا سب مانتے تھے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے بہترین مقرر تھے۔ تقریر جوشیلی ہوتی تھی لیکن دلائل کے ساتھ تقریر مسلسل کرتے۔ سوچنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اُن کے تعلیمی مصارف والد کے انتقال کے بعد بڑے بھائی نذیر احمد خانصاحب ناظم ٹونک نے اُٹھائے۔

گورا سرخ سفید رنگ، وجیہہ چہرہ، بڑی آنکھیں، میانہ قد، دوہرا بدن، فراخ پیشانی، داڑھی فرنچ کٹ، خوددار اور با اخلاق، بے حد ذہین۔ ۶ ار اکتوبر ۱۹۴۹ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔ جنازہ لکھنؤ سے بریلی لایا گیا اور وہیں دفن ہوئے۔ انتقال کے وقت عمر تقریباً ۶۰ برس کی تھی۔ شاعری طبع زاد تھی، بہت کم کہتے تھے۔

خیالِ مصحفِ رخ تھا تو دل معمورِ ایماں تھا
جب آنکھیں بند کرلیں سامنے موجود قرآں تھا

بنا تھا رعب سے ہر ایک کیوں تصویرِ حیرانی
وہ بزمِ ناز تھی یا منظرِ شہرِ خموشاں تھا

طلب کرنا مجھے بزمِ عدو میں غیر کی خاطر
یہ ان کی عزت افزائی، مری ذلت کا ساماں تھا

ہوا آوارہ گردی کی بدولت یہ شرف حاصل
اٹھا کر آنکھ دیکھا جس طرف کوسوں بیاباں تھا

نہ تھا اُس کی طبیعت میں کبھی شوقِ غزل گوئی
عزیزؔ زندہ دل وابستۂ اصرارِ یاراں تھا

عیاشؔ

مولوی محمد عبدالرؤف خانصاحب عرف رؤف احمد ولد محب اللہ خانصاحب۔ رامپور میں پیدا ہوئے۔ والد ریاست جھالاواڑ میں ممبر کونسل ہو گئے تھے اسی لئے عیاشؔ بھی وہیں چلے گئے تھے اور عرصہ تک مختلف معزز عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ان کے بیٹے یوسف سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ انتقال جھال واڑ میں دسمبر ۱۸۹۲ء میں ہوا۔ قطعہ تاریخ وصال یہ ہے جس سے مرحوم کے خصائل پر روشنی پڑتی ہے۔ مشکل بحروں پر انھیں کافی دسترس تھی۔

حالت وجد میں سرشار رؤف احمد جادۂ حسن طریقت کے مودب بے حد

جام صہبائے حیات ابدی وہ پی کر جب ہوئے بیخود و سرمست پئے وصل احد

فکر تاریخ ہوئی مجھ کو کہ ناگاہ شبیرؔ غیب سے آئی ندا منعمِ رضوان احمد

۱۳۱۰ھ

نمونہ کلام

تلاش کمر میں ہیں کھوئے گئے، ٹھکانہ کہیں لگا ہی نہیں

وجودِ عدم میں محو ہوئے حدوثِ قدم کھلا ہی نہیں

ستاتے ہیں بت یہ سمجھ کے یہی کہ ان کا کوئی خدا ہی نہیں

یہ کفر میں ہیں صریح پھنسے لگاؤ ادھر رہا ہی نہیں

عیاشؔ تمہیں ضرور ہوا عروض کا فن کسی سے پڑھو

مٹھائی رکھو جو تم سے یہاں تخلص اگر کھپا ہی نہیں

رضائے خدا نہ ترک ہوئی نبی سے کبھی خلاف نبی نہ فعل ہوا علی سے کبھی

نہ بذل وکرم میں دیر ہوئی سخی سے کبھی | نہ میل کیا دنی سے کبھی شقی سے کبھی
صحابہ ہیں سب مطاع جہاں، مطیع رسول | عزیز رکھا نہ مال، نہ جاہ نبی سے کبھی

شوق نظارہ جب سے ہوا دل پہ کچھ اختیار نہیں
جس کو دیکھا پھڑک ہی گیا ایک دم بھر قرار نہیں

عمرانؔ

عمران شاہ خانصاحب ولد محمد شاہ خانصاحب قوم افغان رامپور کے محلہ باغ پختہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں اردو فارسی گھر پر پڑھی۔ انگریزی کی تعلیم ہائی اسکول رامپور میں حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انگریزی میں میٹرک پاس کیا۔ نومبر ۱۹۲۵ء میں پلٹن بعہدہ لفٹنٹ نواب سید حامد علی (خاں) نے مقرر کیا۔ ۱۹۳۵ء میں میجر کا رینک عطا ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں پلٹن سے تبدیل ہو کر بعہدہ کمانڈنٹ خاص باغ پیلس بحکم نواب سید رضا علی (خاں) مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں پنشن پر ریٹائر ہوئے۔ شاعری کا ذوق تھا۔ محمود رامپوری سے تلمذ تھا۔ لمبا قد چھریرا بدن، رنگ گورا، آنکھیں بڑی سنجیدہ مہذب کم سخن، مرنجان مرنج۔

نمونہ کلام

لاش پر عاشق بیکس کی یہ ساماں ہوں گے | یاس غمگین تو سر پیٹتے ارماں ہوں گے
کچھ بھی گر بازوئے قاتل کو نہ پہنچا صدمہ | تیرے ممنون ہم اے خنجر براں ہوں گے
بلبلانِ چمن دہر کو مژدہ ہو کہ آج | بزم میں حضرت عمران غزل خواں ہوں گے
ظلم کا شکوہ نہ فرقت کا گلا کرتے ہیں | تم سلامت رہو ہم تو یہ دعا کرتے ہیں
یہ محبت بھی بری چیز ہے اے جانِ جہاں | تم ستم کرتے ہو، ہم پھر بھی دعا کرتے ہیں
چھوڑ کر عشقِ بتاں حضرت عمرانؔ اب تو | رات دن بیٹھے ہوئے یادِ خدا کرتے ہیں

عشرتؔ

عشرت علی خانصاحب معروف بہ عشرت رحمانی ولد اسماعیل خانصاحب قوم پٹھان دادھیال مرادآباد، ڈاکٹر شفاعت احمد خانصاحب کے عم زاد بھائی تھے، ننھیال رام پور، اردو فارسی کے علاوہ انگریزی تعلیم میٹرک تک تھی رامپور میں محکمہ پولیس میں دفتر میں کلرک تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگ میں منشی عزیز اللہ خاں صاحب عزیز مرحوم مالک ومدیر نیرنگ کے شریک ہوئے۔ شعروشاعری کا ذوق بڑھتا گیا۔ ابتدا میں رشیدؔ رامپوری کو کلام دکھایا۔ اس کے بعد عیاںؔ یزدانی میرٹھی سے اصلاح لی۔ وہ جب دہلی کے مائیلٹری اسکول کے استاد ہوئے تو عزیز اللہ خانصاحب نے نیرنگ کو بھی دہلی منتقل کر دیا۔ یہ دہلی سے ۱۹۴۰ء تک نیرنگ شائع کرتے رہے۔ اس کے بعد دہلی ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہوئے۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر بھی رہے۔ تقسیم کے بعد پہلے ڈھاکہ ریڈیو پر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد کراچی میں رہے پھر ۱۹۵۳ء تک لاہور ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے۔

نمونہ کلام

راز ہائے حجاب نے مارا
ناز بن کر نیاز نے مارا

کچھ نہ سمجھے حقیقتیں اپنی
جستجوئے مجاز نے مارا

پستی عشق میں بلندی ہے
اس نشیب وفراز نے مارا

کیف گاہِ سحر کی مستی ہائے
نگہ نیم باز نے مارا

میں کہاں، شاعری کہاں عشرتؔ
شعر کے سوزوساز نے مارا

مشکل کہ تیری بزم میں لب وا کرے کوئی
آئینہ بن کے ہاں تجھے دیکھا کرے کوئی

یہ التفاتِ ناز، یہ پیغامِ سوز و ساز
ایسا نہ ہو کہ ضبط کو رسوا کرے کوئی

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی کیفیتِ حیات
کاش اک نگاہِ لطف گوارا کرے کوئی

جس کو صدائے خندۂ گل ناگوار ہو
اس غم پرست دل پہ کرم کیا کرے کوئی

جب اپنی دھن ہے، اپنی طلب، اپنا راستہ
پھر کیوں تلاشِ نقشِ کفِ پا کرے کوئی

پہلے سمجھ لے فرق نیاز ونماز کا
پھر جلوہ گاہِ حسن میں سجدا کرے کوئی

عشرتؔ میں داد دینے کو تیار ہوں مگر
پہلے کوئی کمال تو پیدا کرے کوئی

ظہیرؔ

ظہیر علی خانصاحب ولد امراؤ دولہ خانصاحب خلف غلام حیدر خانصاحب، ممتاز رئیس رام پور محلہ راجدوارہ گھیر زبیر خاں میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ رشیدؔ رامپوری کے شاگرد تھے۔

نمونۂ کلام

یارب مجھے اس شوخ سے بیگانہ بنادے
ایسا نہ ہو دنیا کوئی افسانہ بنادے

دن رات چلیں بادۂ گل رنگ کے ساغر
یارب مجھے پیرِ درِ میخانہ بنادے

جلوے رہیں ہر وقت حسینانِ جہاں کے
دل کو مرے اے عشق پری خانہ بنادے

میں تو یہ چاہتا ہوں بھلا دوں تجھے مگر
دل ہی سے تیری یاد نہ جائے تو کیا کروں

غفلت رہی مریضِ محبت کو رات دن
لیکن وہ تیری یاد سے غافل نہیں رہا

ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے پاس سے
کیا غم اگر نہ وہ روشِ آسماں رہے

ہردم ظہیرؔ ہے یہ خدا سے مری دعا
آباد و شاد انجمنِ شاعراں رہے

رہوں میں پھول بن کر اس کی چوٹی میں، تمنا ہے
لپٹ جاؤں قدم سے اس کے میں برگِ حنا ہو کر

برائی سے وہ یاد اگر کر رہے ہیں
کریں، ذکر میرا مگر کر رہے ہیں

جایئے کعبہ کی جانب بت پرستی چھوڑ کر
کیا کریں گے شیخ صاحب آپ لندن چھوڑ کر

مفلسوں کو پوچھتا ہے کون دنیا میں ظہیرؔ
سچ تو یہ ہے برق بھی گرتی ہے خرمن چھوڑ کر

صراحی تھی، نہ ساقی تھا، فقط افسانہ باقی تھا
سحر کو بزم میں ٹوٹا ہوا پیمانہ باقی تھا

شب وصل کا جب بھی آیا خیال
شب ہجر پیش نظر ہوگئی

نہ چڑھنا تم اس تیغ کے منہ ظہیرؔ
وہ جامے سے باہر اگر ہوگئی

دیکھا ہوا ہے یہ تو فلک لاکھ بار کا
مجھ کو ذرا بھی ڈر نہیں اس فتنہ کار کا

عاصیؔ

امان اللہ خاں صاحب عرف احمد میاں ولد مولوی ضیاء اللہ خانصاحب ساکن محلہ دو محلہ رامپور۔ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء میں ایم۔اے (اردو) اور ایل ایل بی کی ڈگری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی۔ اسی سال پاکستان چلے گئے اور مَری کالج سیالکوٹ میں استاد ادبیات اردو کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ذوق سخن نھیالی شعرا کا رہین منت ہے۔ نانا سید احمد شفیعؔ مرحوم فرید آباد متصل دہلی کے خاندان سے تھے۔ سادات کے رئیس تھے اور شاعر بھی تھے، نیرؔ تخلص تھا۔ اُن کے ماموں سید ہاشمی فرید آبادی بلند پایہ شاعر تھے اور اردو کے مشہور مصنفین اور مترجمین میں سے تھے۔ اُن کا جماعت اسلامی کے اغراض و مقاصد سے عملاً گہرا تعلق ہے۔ نثر نگاری میں اچھی مہارت ہے۔ اچھے ادیب کی حیثیت سے ہندو پاکستان میں مشہور ہیں۔ علم عروض کے اصول اپنے والد

صاحب سے سیکھے اور ان ہی سے شعر میں مشورہ لیا کئے۔ اُن کی رائے ہے کہ دنیا کی مشہور ترین شعری سرمایہ رکھنے والی زبانیں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اردو کی حریف نہیں ٹھہر سکتیں اور میرؔ و غالبؔ اکبرؔ، اقبالؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کی ہستیوں کو نہایت فخر کے ساتھ عالمی ادب میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

نمونۂ کلام

آمادۂ جفا وہ فتنہ زا ہے آج
کس کس بہانے دیکھئے کس کی قضا ہے آج

مژدہ ہو عرضِ حال پہ، ہوتے ہیں سر قلم
عشاقِ سرفروش کا روزِ جزا ہے آج

برقِ ستم شعار کی بیدردیاں نہ پوچھ
ہر آشیانِ باغ جہنم کدہ ہے آج

ڈر ہے عدو کو نالۂ سوزاں نہ پھونک دے
پیمانۂ شکیب چھلکنے لگا ہے آج

لذت کو جانتے ہوئے توبہ کا کیا سوال
عاصی کا دل گناہ پہ مچلا ہوا ہے آج

جس کو اپنا سمجھ لیا میں نے
وہی لمحہ خیال و خواب ہوا

سارے عالم پہ چھا گیا ہے سکوت
دیکھنا اب وہ بے نقاب ہوا

بدلی ہوئی عزم محکم سے ہم گردش دوراں دیکھیں گے
اس مطلعِ تیرہ کو یعنی خورشید بداماں دیکھیں گے

لو زنجیریں بھی ٹوٹ گئیں اب رنگِ گلستاں دیکھیں گے
آغاز بہاراں دیکھ چکے، انجام بہاراں دیکھیں گے

اظہارِ خلوصِ پیہم سے مٹ جائیں گے آپ کے شکوے
وہ ہم کو صادق پائیں گے، ہم ان کو پشیماں دیکھیں گے

ٹھہرو ملاّحو! کشتی کو موجوں سے ذرا ٹکرانے دو
ساحل پہ پہنچنے سے پہلے ہم شورشِ طوفاں دیکھیں گے

....

نگہ کرم سے مجھے عطا ہوں وہ جرأتیں، وہ جسارتیں
وہی میرا سجدۂ شوق ہے، وہی آستانِ کہن ترا

ترا فیصلہ تھا کہ بزم میں تری بوالہوس کا گزر نہیں
مگر آہ میں نہ سمجھ سکا کہ کدھر ہے روئے سخن ترا

جنوں سامانیاں میری رہینِ منتِ دل ہیں
جو ممکن ہو تو اس کو باندھ کر رکھئے سلاسل ہیں

میرے ہمراہ مرے غم بھی ڈبو دینے تھے
پھر ذرا مجھ کو بھی اندازۂ طوفاں ہوتا

آپ کا خوابِ تغافل، مری بیداریٔ شوق
آج کی رات بھی کیا یونہی گزر جائے گی

عزمی

عنایت اللہ خاں ولد عبداللہ خاں بزمؔی نعت گو۔ ولد سیف الدین خاں قوم پٹھان۔ پیدائش محلّہ لال قبر رامپور۔ کھنڈ ساری کی تجارت کرتے تھے۔ پھر غلّہ اور قند سیاہ کی تجارت بھی شروع کی۔ عاشقِ رسول تھے، نعت لکھتے تھے، شاعری میں اپنے والد سے تلمذ تھا۔ خوش الحان تھے، جب پڑھتے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں۔ مدینہ کی زیارت کی حسرت آخر دم تک رہی۔ ۶۳ سال کی عمر پائی۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۲۴ء مطابق ۴ر شعبان ۱۳۴۳ھ کو انتقال ہوا۔ نالا پار کے عام قبرستان میں دفن ہوئے۔ آخری لمحوں میں یہ شعر وردِ زبان تھا۔

قبر عزمیؔ دیکھنا بن جائے گی آغوشِ حور
لے گیا ہے دل میں عشق حلقۂ موئے نبی

لمبا قد، چھریرا بدن، کشادہ پیشانی، سفید لباس، داڑھی گھنی، بڑی آنکھیں۔ نمونہ کلام

بلبلِ جاں تن سے جب نکلے، اڑے سوئے نبی — اور پھریں آنکھیں تو دیکھیں جانب کوئے نبی
نزع میں بیمارِ الفت کا ہوا جب تنگ حال — پھٹ گئیں آنکھیں بشوقِ یادِ گیسوئے نبی
نرگسِ شہلا ہلالِ عید میں کیونکر کہوں — ہیں شعاعِ نور یزداں چشم وابروئے نبی
سرو شمشاد و صنوبر، مہر و مہ سے کیا مثال — سایۂ ذات احد اور قد ہے دلجوئے نبی
فرش سے تا عرش بلکہ لامکاں تک ہے مہک — دونوں عالم میں بسی ہے ایسی خوشبوئے نبی
کاسۂ سر پر ہیں ان کے لاکھ جام جم نثار — ٹھوکریں کھاتے جو پھرتے ہیں سرِ کوئے نبی
قبر عزمیؔ دیکھنا بن جائے گی آغوش حور — لے گیا ہے دل میں عشق حلقۂ موئے نبی

اکبر

علی اکبر خان ولد احمد خان سواروں کے رسالدار کا محلہ لال قبر رام پور میں مکان تھا۔ شاعری میں شبیہ علی خاں شبیہ رامپوری کے شاگرد تھے۔ اس کے بعد صبرؔ رامپوری کے شاگرد ہوئے۔ پہلے ششدرؔ تخلص تھا۔ بعد کو اکبر اختیار کیا۔ ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوا۔ تکیہ شاہ رفیق کے قبرستان رام پور میں دفن ہوئے۔

نمونہ کلام

رہا ہوں مدتوں قیدی کسی زلفِ مسلسل کا — جنوں میں تنگ کیا کرتیں مجھے کڑیاں سلاسل کی
نہ درد آمیز افسانہ، نہ پُر تاثیر نالے ہیں — سنے پھر کیا کوئی فریاد گلشن میں عنادل کی

رہے ہر وقت جب اک لیلیٰ پردہ نشیں دل میں
تو اکبر قدر ہم کو کیوں نہ ہو پھر دل کے محمل کی

چھپاؤ رُخ نہ زلف پُر شکن میں
گماں ہوگا کہ چاند آیا گہن میں

سناؤں کیا غزل اکبر کسی کو
مزہ آتا نہیں اپنے سخن میں

دیتا ہوں دعائیں تری شمشیرِ نظر کو
بھرنے نہ دیا جس نے مرے زخمِ جگر کو

اس زلف معنبر کی اڑالائی ہے نکہت
دیتا ہوں دعا اس لئے میں بادِ سحر کو

تیرِ نگہِ ناز کے گھائل ہیں یہ دونوں
دل تھاموں کہ ہاتھوں سے سنبھالوں میں جگر کو

تاثیر نظر آتی ہے کچھ آہ میں اکبر
دل تھامے ہوئے دیکھتے ہیں اس گلِ تر کو

یہاں تک حسن کا شہرہ ہوا اک رشکِ خوباں کا
کہ آخر دامنِ ابرِ حیا سے مہ نے منہ ڈھانکا

کرو تو یاد کوئی بھی کیا وعدہ وفا تم نے
یقیں اب کس طرح آئے تمہارے عہد و پیماں کا

جو تم سمجھے ہوئے ہو وہ نہ ہو شاید مرے دل میں
کبھی پوچھا تو ہوتا حال تم نے میرے ارماں کا

وہ دستِ غیر سے جب پان کھائیں سامنے ہمدم
بھلا پھر خون پانی کیوں نہ ہو اکبر علی خاں کا

عشق

شوکت علی خان عرف میر دولہ خاں ولد امداد علی خان ساکن محلہ باغیچہ ڈنکا شاہ رامپور سرکاری باورچی خانہ کے تحویلدار تھے۔ ۳۰ برس کی عمر میں دسمبر ۱۹۳۰ء کو انتقال ہوا۔ محلہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

نمونۂ کلام

جھپک جائے بھلا کیوں زیرِ خنجر آنکھ بسمل کی
ملی ہے دیکھنے کو جان دے کر شکل قاتل کی

ستمگر دیکھ لی تاثیر جذبِ عشقِ کامل کی
جو لپٹی بڑھ کے پروانے سے لو خود شمعِ محفل کی

کسی کے اٹھتے ہی افسردگی یوں ہر طرف چھائی کہ جیسے لے گیا رونق اٹھا کر کوئی محفل کی
گواہِ قتل کی محشر میں کچھ حاجت نہیں مجھ کو اتر آتی ہے میری آنکھ میں تصویر قاتل کی

بجھیں شمعیں، وہ گھبرائے، رقیب آپس میں ٹکرائے
ہوا بگڑی مری آہوں سے ایسی ان کی محفل کی

بتاتا ہے طریقے جستجو کے دل محبت میں
خدا کی شان اندھا رہبری کرتا ہے منزل کی

تردد کیوں نہ ہو اے عشق ہم کو جان دینے میں
یہ سنتے ہیں کٹھن ہوتی ہیں راہیں پہلی منزل کی

حضورِ یار چپ ہوں انجمن میں زباں گویا نہیں میرے دہن میں
بہے سوزِ محبت سے جو آنسو لگیں چنگاریاں سارے بدن میں
وہ کیسے وقت روٹھے ہیں الٰہی جدائی ہو رہی ہے جان و تن میں
شکایت کیا کریں غربت کی اے عشق ملی تھی کون سی راحت وطن میں

حد اپنے جور کی یوں تو انھیں معلوم کیا ہوگی
مرا مدفن بتا کر کوئی کہہ دے کہ یہاں تک ہے

جو طالب وصل کا ہے تو مٹا دے اپنی ہستی کو
جدائی کا زمانہ ارتباط جسم و جاں تک ہے

قیامت تک نہیں بچنے کی جانیں ان کے ظلموں سے
بتوں کا دورِ بھی اے عشق دورِ آسماں تک ہے

وہ بات اِک نگاہ میں پیدا کرے کوئی برباد جس سے ہوش کی دنیا کرے کوئی
ناکامیوں نے کردیا دنیا سے بے نیاز للہ اب نہ ذکرِ تمنا کرے کوئی

اللہ ری بے نیازی چشمِ حیا و حسن — ہر وقت جستجو ہے کہ دیکھا کرے کوئی
ہیں چشمِ منتظر میں بہت دلفریبیاں — کچھ غم نہیں ہے شوق سے پردا کرے کوئی

عزیزؔ

عزیز اللہ خاں صاحب ولد سعید اللہ خانصاحب عیشؔ رامپوری ساکن گھیر ملکیان، سنجیدہ ذہن، مہذب اور خوش اخلاق نوجوان تھے۔ فارسی درجہ منشی، فاضل پنجاب کی سند حاصل کی تھی۔ احباب نواز تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد رسالۂ نیرنگ رامپور کے تاحیات ایڈیٹر رہے۔ مذاق سخن فہمی پاکیزہ اور بلند تھا۔ شعر کم کہتے تھے۔ پہلے تخلص رعدؔ تھا۔ اس کے بعد عزیزؔ ہوا۔ قد چھوٹا، چھریرا بدن، رنگ گورا، ناک ستواں، چھوٹی مونچھیں، داڑھی صاف، مخملی ٹوپی، شیروانی، سیدھا پاجامہ پہنتے تھے۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں ۴۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ چاہ موٹے کلن کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

نمونۂ کلام ۱۹۰۸ء

نہیں ہے شیخ قائل مصحفِ رخسارِ جاناں کا — تماشا ہے مسلماں ہو کے وہ منکر ہے قرآں کا
نہیں سودا اگر اُن کو کسی زلفِ پریشاں کا — کٹے ہے چاک پھر کیوں پیرہن ہر گل گلستاں کا
دل سودا زدہ اپنا بتِ کافر پر آیا ہے — خدا ہی اب تو حافظ ہے ہمارے دین وایماں کا

یہ دل کا فصل گل میں دستِ وحشت سے تقاضا ہے
کہ پرزے پرزے کردو پھاڑ کر دامن بیاباں کا
تماشے کے لئے صدہا پری رو ساتھ رہتے ہیں
اثر داغِ جنوں میں ہے مرے مہرِ سلیماں کا

عجب کچھ حال تھا بندِ قبا کا وصل کی شب میں

اِدھر ٹا نکا، اُدھر ٹوٹا، اُدھر ٹوٹا، اِدھر ٹانکا

تو ہی تھی ساتھ جیتے جی تو ہی اے بیکسی رہنا

نہیں ہے کوئی سجادہ نشیں گورِ غریباں کا

مثالِ طائرِ قبلہ نما ہردم تڑپتا ہے

لگا ہے تیر جب سے دل پہ اس کافر کے مژگاں کا

نہ برسے رعد کہہ دو ابر تر سے منہ کی کھائے گا

وہ ہے ناچیز کیا ہوگا مقابل چشم گریان

شہیدِ خنجر الفت ہوں رنگیں ہے کفن میرا

طفیل عشق مر کر بھی ہے باقی بانکپن میرا

خوشا قسمت کہ وہ بیدرد حالِ دل کا پرساں ہے

مدد اے ضبطِ غم ظاہر نہ ہو رنج و محن میرا

ستمگر مائلِ پرسش ہے، اب طرزِ ستم دیکھو

ہوئے جب بند لب میرے، زباں میری دہن میرا

نواب محبت خاں تذکرہ نگاروں کی نگاہ میں

نواب محبت خاں روہیل کھنڈ کے حکمراں حافظ الملک حافظ رحمت کے بیٹے تھے۔ وہ ۱۱۶۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد بزرگوار کی ماتحتی میں ہوئی۔ پشتو و فارسی ان کی مادری زبان تھی۔ علم موسیقی کے بھی استاد تھے۔ عربی بھی خوب جانتے تھے۔ میر حسن مصنف تذکرۂ شعرائے اُردو نے انھیں ''نواب ذیشان'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ مولف عماد السعادت کا کہنا ہے کہ نواب محمد محبت خاں جیسا صاحب عزت، صاحب لیاقت نواب کم ہی نظر سے گذرا۔

مولوی سید الطاف علی حیات حافظ رحمت خاں میں لکھتے ہیں کہ میر حسن نے غدر سے دو تین سال پہلے (غدر ۱۸۵۷ء) مولف تاریخ سلیمانی سے قسم کھا کر کہا تھا کہ میں نے آصف

الدولہ کے عہد سے اس وقت تک محبت خاں جیسا خوبصورت انسان نہیں دیکھا۔

محبت خاں کی شادی عبدالستار خاں کمال زئی ساکن فرید پور بریلی کی بیٹی سے حافظ رحمت خاں کی زندگی میں ہی ہوئی تھی۔ محبت خاں کثیر الاولاد تھے۔ لڑکیوں کے علاوہ سترہ بیٹے تھے۔ ۱۷۷۴ء ہندوستان کی تاریخ کا بدترین عہد ہے جب انگریزوں نے حافظ رحمت خاں پر چڑھائی کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغل طاقت ٹوٹ چکی تھی۔ اس وقت صرف روہیلوں کی ایسی طاقت تھی جو انگریزوں کو نکال سکتی تھی نہ صرف یہ کہ دوسرے صوبیداروں نے حافظ رحمت خاں کی مدد نہیں کی بلکہ شجاع الدولہ نے انگریزوں سے مل کر سازشیں شروع کردیں اور انگریز و شجاع الدولہ کی متحدہ طاقت نے مل کر روہیل کھنڈ پر حملہ کر کے روہیلوں کی طاقت توڑ دی اور حافظ رحمت خاں کو شہید کر دیا، برصغیر انگریزوں کا غلام ہوگیا اور ہندوستان میں آٹھ سو سالہ عظمت اسلامیہ کا خاتمہ ہوگیا۔

محبت خاں کے بارے میں سیرت المصنفین کے مصنف لکھتے ہیں۔ ''میں نے آصف الدولہ کے آغازِ سلطنت میں حافظ رحمت خاں اور دوندے خاں کی اولاد کو اکثر لکھنؤ میں دیکھا اور ان کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ ان لوگوں میں بہترین انسان محبت خاں پسر حافظ رحمت جو عنایت خاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ یہ شخص صورت و سیرت ہر اعتبار سے حکمرانی و سرداری کے لائق تھا لیکن اس سفلہ پرور زمانہ میں اس کے لئے نہایت قلیل رقم ہے جو ان کے لئے باعث ننگ و عار ہے، آسمان کی ستم ظریفی کو ضبط تحریر میں لانا مشکل ہے''۔ تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی سیرت اور فیاضی کی تعریف کی ہے۔ میر حسن انھیں منبع جود و سخا اور قدردانِ شعرا کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ زیادہ تر اس دور کے صاحبِ سخن خوش خلقی کی وجہ سے ان کی صحبت اختیار کرتے ہیں اس دور میں ان کا دم غنیمت ہے سلمہ اللہ۔ شیفتہ گلشن بے خار میں لکھتے ہیں۔ ''نہایت مہذب و پرہیزگار اور فہم و فراست کے مالک ہیں۔'' مرزا علی لطف گلشن ہند میں محبت خاں کو جوانِ خوش ظاہر و خوش

رو کہتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''خوش گفتار و خوش خو، حسنِ اخلاق سے پُر، بامروت اور جوانمردی میں مشہور ہے۔'' مولانا عبدالسلام ندوی شعرالہند میں یوں رقمطراز ہیں۔ جعفر علی خاں حسرت کے تلامذہ میں نواب محبت خاں ایک ممتاز مرتبہ کے مالک ہیں لیکن ان کا ذکر مربیان سخن میں آتا ہے۔

نواب محبت خاں عربی فارسی پشتو اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ فارسی قواعد کی بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ ایک لغت پشتو میں بھی تیار کی تھی۔ ۱۲ر صفر ۱۲۲۴ھ میں ۵۹ سال کی عمر میں دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔

یہ عہد ہندوستان کی تاریخ کا نہایت پر آشوب زمانہ تھا، ہر طرف کشاکش، اضطراب، بے چینی اور انار کی پھیلی ہوئی تھی، مسلمانوں کی سیاسی طاقت ٹوٹ چکی تھی جس میں سب سے بڑا ہاتھ نادر شاہ افشار کے حملہ کا تھا۔

شامت اعمال ماصورت نادر گرفت

روہیل کھنڈ کا علاقہ دہلی کے مشرق میں تقریباً ڈیڑھ سو کلو میٹر پر ہے۔ دہلی اور روہیل کھنڈ کی تباہی کے بعد لکھنؤ آباد ہوا۔ انشاء اللہ خاں انشاء دریائے لطافت میں لکھنؤ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''لکھنؤ دہلی کی جان ہے اس لئے کہ فصحاء اور سلیقہ شعار جو اس شہر کی جان تھے یہاں آکر جمع ہوئے ہیں اس لیے شاہجہان آباد (دہلی) ایک بے جان پیکر ہے اور لکھنؤ اس کی جان ہے۔

نواب محبت خاں نے اردو زبان میں ایک مثنوی بنام ''اسرار محبت'' لکھی۔ مثنوی اسرار محبت اردو کی پہلی مثنوی ہے۔ مولف صبح گلشن سید علی حسن ولد نواب صدیق حسن نے بھی ان کے کلام اور نغمات طبع زاد کی تعریف کرتے ہوئے شجاع الدولہ کے ناروا برتاؤ پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ ''ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ برصغیر میں پٹھان دیس یعنی صوبہ سرحد کا مرکز پشاور ہی اردو کی ٹکسال ہے جہاں ہندی آمیز فارسی کلام کے مسلم الثبوت اولین شاعر محمد قلی

---

[1] فارغ بخاری اٹک کے اس پار

قطب شاہ متوفی ۱۶۴۰ء سے بھی بہت پہلے نہ صرف ہندی آمیز فارسی و پشتو کے نمونے ملتے ہیں بلکہ اردو کی ایک کامیاب ابتدائی شکل یہاں کی مقامی زبان کی صورت میں مروج نظر آتی ہے[1]"۔

اسلامیہ کالج لاہور میں قاسم علی خاں آفریدی کے دیوان کا قلمی نسخہ ۱۸۲۰ء کا موجود ہے۔ دیوان کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ "ان کے والد برہان خاں شاہجہان آباد میں اردوئے معلّٰی کے ماہر اور پشتو، فارسی اور ترکی زبانوں کے بہت بڑے عالم تھے اور وہاں انھیں گرانقدر مشاہرہ پر رکھا گیا تھا۔" آفریدی کے کلام کے تیور بھی تیکھے ہیں۔

ازل سے تا ابد تک آفریدی ساتھ ہے اس کے
میانِ دوساں صاحب سلامت ہو تو ایسی ہو

پٹھان شاعری اپنے مزاج کے اعتبار سے سادہ، رواں اور بیباک رہی ہے۔

مجھے وہ دے رہے تھے گالیاں بے وجہ محفل میں
جو پوچھا بات کیا؟ جھنجھلا کے بولے بات کیا ہوتی؟

میاں خاں اپنی بیتابیوں کا یوں ذکر یوں کرتے ہیں۔

بے تابیاں بھری ہیں میرے سخن سخن میں　　بجلی بھری ہے گویا میری زباں دہن میں
اس شوخ فتنہ گر کی ہر بات ہے نرالی　　رگ رگ میں ہے شرارت، صورت ہے بھولی بھالی
وہ کون سی ادا ہے جو ہے ستم سے خالی　　شوخی میں بانکپن ہے، شوخی ہے بانکپن میں

یہاں پٹھان شاعری کے مزاج یا لکھنؤ اور دہلی کے بیچ روہیل کھنڈ اسکول کا ذکر کیا ہے۔ سادگی روانی اور دو ٹوک انداز میں بات کہہ دینا پٹھانوں کا فطری وصف ہے۔ اردو شاعری میں جہاں یہ وصف نظر آئے وہ شعر پٹھان شاعری کے مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ وصف مردوں اور عورتوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔ شاہجہاں بیگم نواب بھوپال کے چند اشعار دیکھیں۔

واہ وا! کیا ہی نیا یہ آپ کا چالا ہوا دل ہمارا لے لیا ہے عمر بھر کا پالا ہوا
ہمارا دل دکھانا کچھ ہنسی یا کھیل سمجھے ہو سمجھ پکڑو جواں ہو اب نہ جاؤ تم لڑکپن پر

ایک دوسری شاعرہ زاہدہ شیروانی نہایت سادہ انداز میں زبانِ نعت میں یوں گویا ہوتی ہے۔

زعشق تو، زرعب تو، زغیر تو، زجود تو سرم جوشاں لبم ساکت دلم خالی کفم مملو

اور ملکہ آفاق زمانی بیگم ایک اہم مسئلہ کو سادگی و روانی کے ساتھ یوں ادا کرتی ہیں۔

اِک رسم ہے یہ جس کو ادا کرتی ہے دُنیا میت پر کسی شخص کا احساں نہیں ہوتا
رنگ حنا کی زینتیں، سرمہ کی شوخیاں غلط حسن تو خود بہار ہے اس کے لئے بہار کیا

فارسی شاعری میں دبستانِ خراسان کے نام سے پایا جانے والا انداز شعری افغان شاعری کا زندہ نمونہ ہے۔ یہ دبستان افکار وخیال کی سادگی اور روانی الفاظ وبیان کے لئے مخصوص حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں یہ سادگی رامپور یا روہیل کھنڈ کے شعراء یا ان کی فکر سے متاثر ہونے والے شاعروں میں ملے گی۔

یوں تو ہندوستان میں مغلوں کے آنے کے بعد پٹھانوں کے کارناموں کو اس وقت کی سیاسیات کو سامنے رکھ کر پسِ پشت ڈالنے اور انھیں بدنام کرنے کے جملہ سیاسی طریقے اپنائے گئے۔ یہ وقت کا تقاضہ تھا، حکمرانی کی لڑائی تھی، اس لیے تاریخ میں یہ چیزیں قابل معافی ہیں اور اولوالعزم قومیں انھیں بھول جاتی ہیں لیکن ادب میں تعصب اور فرقہ وارانہ تعصب کو معاف نہیں کیا جاسکتا جس کی ابتدا مولانا محمد حسین آزاد سے ہوئی۔ انہوں نے حکیم مومن خاں مومن کا ذکر آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں نہیں کیا۔ یہ ادب میں بدترین فرقہ وارانہ تعصب کی ابتدا تھی جو کسی نہ کسی شکل میں چلتی رہی۔ اس کا شکار روہیل کھنڈ کے بہت سے شاعر وادیب ہوئے اور اہل تنقید نے جان بوجھ کر بہت سے شعراء کو نظر انداز کیا۔ اسی کا شکار نواب محبت خان محبت بھی

ہوئے۔

اردو کی ایک بدنصیبی یہ ہے کہ حالی کے بعد تنقید نگاری کا کام ٹھپ ہو گیا اور تنقید نگار اس روش پر چل نکلے۔ ''نہ میں کہوں تیری، نہ تو کہہ میری'' ہر تنقید پر ایک دوسرے کے حوالہ دینے لگا اور تنقید کا فن ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' کا مصداق بن کر رہ گیا۔ اردو میں تنقید کیا ہے؟ یہ عنوان پس پشت جا پڑا اور یورپین تنقید نگاروں کی کتابوں کے آزاد تراجم کی بنیاد پر تنقید نگاری شروع ہوئی اور انگریزی و فرانسیسی اور دوسری یورپین زبانوں کے ادبیات پر منطبق ہونے والے تنقیدی نظریات کو کھینچ تان کر اردو ادبیات پر چست کرنے کی لگاتار کوشش جاری ہے۔ اس کے علاوہ شاعروں کی ایک مخصوص ٹولی کی پٹس پڑی ہوئی ہے۔ دوسرے شاعروں کے بارے میں ان کی ادبی اور تاریخی حیثیت کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو ان کا ذکر شجر ممنوعہ سے کم حیثیت نہیں رکھتا۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ علاقائی تقسیم کر کے علاقوں اور منطقوں کی بنیاد پر اردو ادبیات کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔

لکھنؤ اور دلّی اسکول کی اصطلاحات مطلق غلط اور بے معنی ہیں۔ اسکول کا مطلب ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مدرس اعلیٰ یا ہیڈ ماسٹر ہو۔ ان اسکولوں کے مدرس اعلیٰ کا پتہ چلتا ہے نہ ماتحت اساتذہ کا اور نہ طالب علموں کا۔ فارسی میں دبستان عراقی و خراسانی کی اصطلاح اختراع کی گئی تھی تو اردو والوں نے بھی اسکول کا نام دے ڈالا۔ یہ یونیورسٹیاں تو ہو سکتی ہیں لیکن اسکول نہیں اس لیے کہ ان کی تقسیم فکر اور اندازِ زبان و بیان کی بنیاد پر کی گئی ہے جبکہ اسکول ابتدائی تعلیم کا پہلا زینہ ہے۔

برصغیر میں اردو شاعری کے بہت سے مرکز یا اسکول رہے ہیں۔ دکن میں گولکنڈہ، حیدر آباد، وسطی ہندوستان میں بھوپال، ٹونک، شمالی ہند میں آگرہ، دہلی، روہیل کھنڈ، لکھنؤ، مشرقی ہندوستان میں پٹنہ (بہار) کلکتہ، مرشد آباد، ڈھاکہ، مغربی ہندوستان میں پشاور، لاہور وغیرہ۔

ان علاقوں کی اپنی علاقائی خصوصیات ہیں۔ زبان و اسلوب سخن کو کسی ایک اسکول کا اسیر بنا کر اسی اسکول میں جبری بھرتی کر دینے کا رجحان قطعی حقیقت پسندانہ نہیں کہا جا سکتا۔ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کو معیار زبان دانی قرار دے کر باقی سارے علاقوں کے لوگوں شاعروں اور ادیبوں کو ٹکسال باہر کر دینے کی روش ادب میں علاقائی تعصب اور عصبیت کا مظہر ہے، لہٰذا اس روش کو ترک کر کے نئے سرے سے علاقائی ادبی کاوشوں کو وہاں کی سیاسی سماجی اور لسانی ضروریات کو سامنے رکھ کر ہر علاقہ کے شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کو اُجاگر کیا جائے تاکہ ہر شاعر و ادیب کو اس کی خدمت و محنت کا ثمرہ مل سکے۔ اردو ادب میں پہلا مثنوی نگار نواب محبت خاں محبت ہے اور اس کی مثنوی ''اسرارِ محبت'' اردو کے لئے ایک ادبی سرمایہ ہے جسے یکسر نظر انداز کیا گیا۔ اللہ بھلا کرے ان تذکرہ نگاروں کا جنہوں نے مسلسل نواب محبت خاں کا اپنے تذکروں میں ذکر کر کے انھیں زندہ رکھا، ورنہ بعد کے تنقید نگاروں نے محمد حسین آزاد کی تقلید کرتے ہوئے نہ جانے کتنے گنجہائے گراں مایہ کو تعصب کی دھول تلے چھپانے کا اہم کام انجام دیا۔ اس ادبی تعصب کا اسی وقت پردہ فاش ہوگا جبکہ علاقائی تقسیم کر کے شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کا اُجاگر کیا جائے، ورنہ ادبیات اردو دہلی اور لکھنو کے قیدی بنے رہیں گے۔

افغانوں کے خلاف یہ نفرت فارسی شاعری میں بھی ملے گی، شعر میں بھی اور نثر میں بھی۔ فرخ خراسانی قصیدۂ فتح دہلی کے عنوان سے کہتا ہے۔ [1]

بتا زیانۂ تادیب خیل افغان را بداد کیفر گردنکشی وراند از در

گروہ کوہ نشینان وحشی افغان گرفت آنزہ و دشوار گشت کار عبر

افغان بفغان زبانگ زخشش مہ تیرہ زتابش در فشش

---

[1] سخنوران ایران در عصر حاضر جلد اول نگارش و تالیف محمد اسحاق صفحہ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۵ یہ قصیدہ نادر افشار کی شان میں ہے۔

اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ افغانوں کے قبیلہ غلزئی کی شاخ ہوتک کے فرزند جیل میرویس ہوتکی اور اس کے بیٹے محمود شاہ نے ایران تک افغان حکومت کو وسعت دے دی تھی۔ غلزئی افغانوں کی حکومت کے خلاف نادر افشار نے افغانستان، پھر برصغیر پر حملہ کیا۔ اس وقت بارک زئی قبلیہ نادر ایرانی سے مل گیا اور غلزیوں کو شکست ہوگئی۔ یہ قبیلہ ہندوستان چلا آیا جس کے افراد آج بھی ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کے قصبہ ملیح آباد ضلع لکھنؤ میں آباد ہیں اور قندھاری کہلاتے ہیں۔ بعد میں بارک زئی قبیلہ کا احمد خاں احمد شاہ ابدالی کے نام سے افغانستان کا بادشاہ ہوا اور ظاہر شاہ تک یہ خاندان حکومت کرتا رہا۔ داؤد نے پھر ظاہر شاہ کے خلاف بغاوت کی۔ پہلی بغاوت کے بعد افغانوں کو نادر افشار کی قتل و غارت گری کا سامنا کرنا پڑا اور شامت اعمالِ ما صورت نادر گرفت اور دوسری بغاوت کے بعد افغانوں کو روسی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا لیکن افغانوں نے ہمیشہ خواہ وہ میدانِ علم و ادب ہو یا میدانِ کارزار اپنے دشمنوں کو شکست فاش دے کر نیچا دیکھنے پر مجبور کردیا ہے۔ کتنی ہی ظالم و جابر اقوام کا قبرستان ہمیشہ سے افغانستان بنتا رہا ہے، روس کا بھی قبرستان افغانستان میں بن چکا ہے اور انشاء اللہ امریکہ کا بن رہے گا۔ جب خدا کسی قوم پر عذاب نازل کرتا ہے تو ''تا کی مت پہلے ہر لیت'' یعنی اس کی عقل پہلے مار دیتا ہے۔

عبدالرحمٰن پژواک شاعر افغانستان نے سکندر کے بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

چوں زیروزبر کرد سرزمین دارا را	بران بشد کہ بدست آرد آریانہ[1] را
خبر نہ بود کہ این مملکت عدو سوز است	خدنگ چلۂ پکتیسیان جگر سوز است
ہزار خم نکند مست مے پرستان را	چنانچہ زرۂ خاکی وطن پرستان را

اردو تنقید کے باوا آدم مولانا حالیؔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

---

[1] افغانستان کا ایک صوبہ

[2] مسدس حالی دیباچہ صفحہ ۱۰ مطبع نولکشور لکھنؤ

"نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اُردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق وواقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ ایک روز انیسؔ کا ذکر ہو رہا تھا۔ انہوں نے انیسؔ کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا ع

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے؟

اور کہا انیس نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔ [۲]

حالیؔ نے ایک پٹھان کی صحبت میں اپنے ادبی ذوق کو نکھارا اور اثر قبول کیا لیکن بے شمار متعصب تنگ دل اور کوتاہ نظر تذکرہ نگاروں اور تنقید نگاروں نے پٹھان شاعروں، ادیبوں اور شاعرات کو نظر انداز کر کے اپنے تسکینِ قلب کا سامان بھی فراہم کیا اور اس عہد کے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کر کے دامن مراد کو بھی بھرا۔

انگریزی سرکار کا ایک ہرکارہ حکیم مومن خاں مومنؔ جیسے انقلابی شاعر اور آزادی ہند کے نقیب کا کیسے ذکر کر سکتا تھا۔ مومنؔ نے کہا تھا۔

یوں کچھ نہ ہو! اُمید تو ہے انقلاب میں　　اے حشر جلد کر تہ و بالا زمین کو

غدر سے پہلے تصور انقلاب عطا کرنے والا شاعر کو پیچھے دھکیل دیا گیا اور انگریز کی چاپلوسی کرنے والے میر مجلس بن بیٹھے۔ یہی کھیل نواب محبت خاں محبتؔ کے ساتھ کھیلا گیا۔ محبت خاں حافظ الملک حافظ رحمت خاں والی روہیل کھنڈ کے بیٹے تھے۔ ان کے علم وادب اور عالمانہ طرزِ فکر کے سبھی قائل ہیں۔ خود موصوف کو بھی اس کا خیال تھا۔ اسی لیے کہا ہے۔

ہر ایک علم میں ماہر تو ہے محبت تو

پہ فن شعر میں پیدا عجب کمال کیا

سادگی بیان ان کی شاعری کا سرمایۂ خاص ہے۔ ہر شاعر اپنے عہد اور اپنی اندرونی کیفیت کا محتاج ہوتا ہے۔ محبت خاں عالم فاضل انسان تھے۔ حکمرانی کی گود میں آنکھ کھولی۔ جوان ہوئے اور اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جاہ وجلال، رشتہ داروں، عزیزوں، دوستوں اور اہلِ خاندان کو لٹتے قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ایک صاحب سیف وقلم، والی طبل وعلم، پیکرِ صدق وصفا کا خاندان محبِّ اہلِ بیت، شجاع الدولہ اور انگریزوں کی سازشوں کا شکار ہو کر سنت شہید کربلا پر گامزن تھا۔ روہیل کھنڈ کی زمین پر بریلی کے آسمان کے نیچے روہیلوں کی عظمت وشوکت کو پامال کیا گیا۔ ان کی عزت مآب خواتین کو سرِ بازار گھمایا گیا۔ رسیوں میں باندھا گیا۔ سامنے گھڑے لاکر توڑ دیئے گئے مگر پانی نہیں دیا گیا اور یہ سب کچھ نواب محبت خاں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ شاید اسی لئے یہ شعر انہوں نے زبانِ دل سے ادا کیا۔

ہم چشمی ابر مجھ سے تو کرتا تھا رات	ایک آن میرے ساتھ پہ دیکھو نہ رو سکا
آہ و نالہ میں رات کٹتی ہے	اب یہ رہتا ہے مشغلہ دل کا
خزاں لے گئی متاع صبر وبلبل	چمن میں ہاں خس وخاشاک ہوگا
گئے وہ دن کہ رہتی تھی گل وگلزار سے صحبت	نہیں ہوتی میسر اب چمن کے خار سے صحبت
خدا جیتا بچا دے آج اس کو تو غنیمت ہے	محبت کو پڑی ہے ایک بت خوں خوار سے صحبت
روتے دیکھا مجھے تو دشمن کا	دیدۂ بے اختیار بھر آیا

نواب محبت خاں کا کلام دردوغمِ رنج والم کی تصویر ہے۔ روہیل کھنڈ میں جو کچھ ہوا اسے شجاع الدولہ کے حلیف انگریزوں نے بھی ناپسند کیا۔ پوری غزلیں غم میں ڈوبی ہوئی پیکر دردوغمِ

نمونہ حسرت ویاس دکھائی دیتی ہیں۔ میر کا غم خارجی ہے جبکہ محبتؔ کا غم داخلی ہے اور تمام تر داخلی کیفیات کا ترجمان ہے۔ اپنی تباہی وبربادی، غریب الوطنی اور عظمت رفتہ کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

صیاد گر زباغ جدا گشتہ ام چہ غم
از خون خود قفس شدہ رشکِ چمن مرا

جبکہ اردو میں کہتے ہیں۔

کیا بے پروبالی کے سبب کرتا ہوں نالے — آتا ہے نظر جبکہ مکاں دور چمن کا
صیاد کیا یہ ظلم ہے آئی بہار اب — میں باغ سے جدا رہوں، مجھ سے چمن جدا
کیا کیا مرے اس دل پہ گذرتا ہے قفس میں — آجاتا ہے مذکور جو ناگاہ چمن کا

شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد کے سہارے حافظ رحمت خاں کا خون نہیں کیا تھا بلکہ اپنے باپ کی پے درپے شکستوں کا انتقام لیا جو اس کے باپ کو ایک پٹھان خاتون بی بی صاحبہ بنگش کے ہاتھوں اُٹھانا پڑی تھیں۔ یہ انتقام اور پٹھانوں کی قتل وغارت گری نہیں تھی بلکہ برصغیر سے سلطنت اسلامیہ کا خاتمہ تھا۔ شجاع الدولہ وہ پہلا محبّ اہل بیت ہے جس نے برصغیر کو انگریزی غلامی سے ہم کنار کردیا اور اس طرح ان غازیانِ اسلام کا خون ہوگیا جنہوں نے اپنا لہو دے کر مٹی کو چمن بنانے کا کام کیا تھا۔ اسی چمن بے نظیر کو شجاع الدولہ نے اپنی آتش انتقام سے خاکستر میں بدل کر انگریزی طاقت کو مضبوط کردیا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک انگریزی غلامی کے جوے میں جا دبے۔ یہ سب کچھ محبت خاں نے دیکھا تھا تو ان کی آنکھیں لہو رورہی تھیں۔

جو سمجھے گا سخن تیرا محبتؔ — وہی کچھ صاحبِ ادراک ہوگا

کون جانے ہے ماجرا دل کا　　سخت مشکل ہے مدعا دل کا

آہ و نالہ میں رات کٹتی ہے　　اب یہ رہتا ہے مشغلہ دل کا

نالہ مثلِ جرس پکارے ہے　　لٹ گیا سارا قافلہ دل کا

بلبلو آئے فصل گل تو کیا　　میں گرفتار اب کی سال ہوا

مرزا غالبؔ نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

۱۷۷۵ء محبت خاں کے لکھنؤ آنے کا زمانہ ہے اور اسی وقت وہ حسرتؔ کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۵ سال تھی۔ ۲۱ سال اکتساب فیض کر چکے تھے۔ حسرتؔ کے بعد اب انھیں کسی کی ضرورت نہ تھی اور شاید اسی لئے انھوں نے کہا۔

شاعرانِ حال کو دیکھا سوا استاد کے
اب محبتؔ ہے سخن پر ایک سر تیرا بلند

میر ضیاء الدین عبرت متوفی ۱۷۸۸ء مولف پدماوت اردو نواب محبت خاں کے شاگرد تھے۔ انہوں نے پدماوت میں محبت خاں کی تعریف اس طرح کی ہے۔

کہوں کیا نوابِ زماں ہے　　قلم آسا سراسر نکتہ داں ہے

مضامیں کس طرح کرتا ہے ایجاد　　نہ ہوتا گر محبت خاں سا استاد

اصول و منطق ہیں اس کی زباں پر　　ہے فنِ شعر اس کا ادنیٰ جوہر

سخن کے سقم کا ہے وہ فلاطوں　　کہ اس کے ہاتھ میں ہے نبضِ مضموں

ہر اک مضمون رنگیں بیش و کم سے　　وہ لکھتا ہے رگِ جاں کے قلم سے

خدا رکھے اسے دلشاد و دائم　　بہ حق پنجتن پاک معظم

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا اور وہ اپنا حلقۂ تلامذہ بھی رکھتے تھے۔نواب محبت خاں نے اپنے کلام میں جو درد و غم کا سرمایہ ہے ان علامات کا لگاتار استعمال کیا ہے اور یہ الفاظ بار بار ان کے کلام کی زینت بنے ہیں۔یتیم ، نالہ،گل، چمن، بلبل، سنگدل، کم بخت، خونِ دل، فصل گل، گرفتار، اشک گلگوں، مات، ہم چشمی، دل جلا، قفس، مرغ چمن، ظلم وستم، اغیار سخت جان، قاتل عالم، متاع صبر، خوں بہا، بوئے وفا، بحر غم، اہل ماتم، گریۂ شبنم، آہ، پتھر پھوڑنا، غارت گر، عریانی بدن، صیاد، دام، مرغ دل، بال و پر، رنجور، دیدارِ چمن، غیرتِ یوسف، قیامت، چاک گریباں، جہان خلیل، تند خو، دشمن، تیر مژہ، خار و سنگ، دیدۂ احباب، چشم تر، چشمِ سیاہ مست، دیدۂ پر آب، چشمِ گہربار، چشمِ خونبار، خوں آشام، لیل تنور، شب سمور، در پئے قتل، لشکر، ضبط آہ، بیداد، حسرت وغم، سینۂ سوزاں، ارجن، تیر و کمان، عندلیب، زکریا، آرے، شیخی، شکار، قیدی، جنگ، فتنہ، آئینۂ فولاد، ظالم مظلوم نما، بندہ حرص وغلام آز، نقشہ وغیرہ۔

نواب محبت خاں محبت کو اس دور اور اس کے بعد کے تذکرہ نگاروں نے اہمیت بھی دی اور ان کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے انھیں نکتہ داں، رنگینی مضمون کا ماہر اور رگِ جاں سے لکھنے والا بتایا لیکن سہل نگاران تنقید نے محبت جیسے صاحب دل و دماغ شاعر کو سمجھنے یا تاریخ ادبیات اردو میں اوّلین مثنوی نگار کی حیثیت سے ان کی تاریخی اور لسانی جائزہ کی طرف کوئی توجہ نہ دے کر ان کی فنکارانہ حیثیت کو متعین کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی۔

ان کی شخصیت اور شاعرانہ حیثیت کے تعین کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ذہن کے ترکیبی اجزاء کو تلاش کیا جائے۔ان کا علم اور شعری قوت ان کی اپنی انفرادیت کا ضامن ہے اور ان کے کلام میں جو کچھ ہے وہ صاف سادہ اور شفاف آئینہ کی طرح ہے۔انہوں نے پر پیچ مضامین اور دوراز کار تشبیہات سے اپنے کلام کو بوجھل کرنے کا کام نہیں کیا۔جو کچھ ان کے آئینۂ دل پر عکس ریز ہوا اسے انہوں نے زبانِ دل کے ذریعہ رگ جاں کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر ثبت

کر دیا۔ ہمارے یہاں اردو تنقید میں تجزیاتی تنقید کا فقدان ہر شاعر کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے چہ جائیکہ محبت خاں محبتؔ لیکن دوسرے شاعروں کے سلسلہ میں کہا جاتا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت اور کلام کی معنوی خصوصیات کو کھنگالا جا چکا ہے۔

بیسویں صدی میں تنقید نگاری نے جو رخ اختیار کیا وہ انیسویں صدی سے بالکل الگ ہے۔ اٹھارہویں صدی پر مغربی افکار و نظریات اور مغربی تنقید کے لباس کو مشرقی شاعری کے جسم توانا پر چست کرنے کا خیال بھی کسی تذکرہ نگار کو نہیں آیا۔ کل شاعر نے جو کچھ کہا تھا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کے تنقید نگاروں نے اس کے پیکر ہی کو بدل کر رکھ دیا اور شاعر کا کلام فن تنقید پر تو کسا نہیں گیا البتہ اس کے کلام کی تفسیر بیان کی جانے لگی۔ اقبالؔ و غالبؔ تو پوری طرح اس روش بے جا کے شکار ہو چکے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعرانہ عظمت تو قائم نہ ہو سکی، ہاں وہ فلسفی، مفکر اور تقدس مآب شخصیت ضرور بن گئے۔ یورپ میں جس طرح تنقیدی زاویے تبدیل ہو رہے ہیں اُردو میں بھی ان ہی کو فٹ کیا جا رہا ہے۔ اردو کا ہر تنقید نگار رین سم، کلینتھ بروکس کا مقلد یا ان کے طرزِ فکر کا شیدائی ہے۔ موجودہ دور میں تنقید میں بھی نظریاتی اور لباسی وابستگی کا زور بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے سو دو سو سال پہلے کے شاعر کے کلام کو کھینچ تان کر ان کیمپوں میں رکھا جا رہا ہے جن کے بارے میں شاعر نے کبھی سوچا تھا اور نہ اس کے وہم و گمان میں آیا تھا۔

شاعر کے کلام کو اس دور کے حالات، سیاسی و سماجی ماحول، اس کی اپنی شخصیت اور لسانی خاکہ میں دیکھنے کی کوشش کیے بغیر ہم شاعر کے اصل جذبات اور اس کے ذہن کے ترکیبی عناصر کو کھو دیں گے اور جو کچھ کہیں گے وہ ہماری اپنی بات ہوگی۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے کلام کو لے لیجیے۔ کچھ تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ ظفرؔ کے لیے ذوقؔ کہتے ہیں، کیسی بچکانہ بات ہے۔ ذوقؔ کے کلام میں، جو انہوں نے اپنے لیے کہا اس میں وہ درد، شدت الم، بے چینی اور کسک کیوں نہیں پائی جاتی جو ظفرؔ کے کلام سے موسومہ کلام میں ملتی ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ذوقؔ کے کلام میں وہ

درد، شدت غم اور بے چینی کا احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کہ ذوقؔ کے سامنے تیسرے فاقہ پر ان کے بیٹوں کے سر نہیں آئے تھے، نہ ان کے سر سے تاج شاہی گرا تھا۔ یہ تو ظفرؔ کے ساتھ ہوا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ظفرؔ کے کلام میں صیاد و گل چیں، لہو کی چھینٹ جیسے الفاظ کی بھرمار ہے۔

تزئین جو دی چمن کو تو میرے لہو کی چھینٹ
بوٹی سی ایک دامنِ قاتل پہ بن گئی

بہادر شاہ ظفرؔ ہی جیسا شاعر کہہ سکتا تھا۔

نواب محبت خاں محبتؔ کے ہاتھوں سے بھی حکمرانی نکلی تھی اور وہ بھی والی طبل و علم تھے اسی لئے انہوں نے بھی کہا۔

میں اپنے سر کو جو پٹکا تھا ہجر میں تیرے
لہو ہر ایک در و دیوار سے تھا جاری رات

روتا تھا کوئی خوں، کوئی غلطاں تھا خون میں
مجلس میں ہو رہا تھا عجب اس کی رنگ رات

آنکھوں سے جو جاری ہوں مری اشک کی نہریں
کیونکر رہے سر سبز نہ گلزارِ محبت

اے محبتؔ اب قفس میں یاد کر کہتے ہیں ہم
آہ گل افسوس سنبل، ہائے گلشن وائے باغ

محبتؔ کے عہد کے شاعروں کے یہاں آہ، افسوس ہائے اور وائے در و دیوار سے خون کا جاری ہونا، آنکھوں میں خون کا غلطاں و پیچاں رہنا جیسے الفاظ و علامات کی بھرمار نہیں ملے گی۔ میر تقی میرؔ نواب محبت خاں محبتؔ کے ہم عصر ہیں۔ انہوں نے خارجی واقعات اور زندگی کے حادثات کو غم کا پیکر عطا کیا ہے لیکن محبتؔ کے کلام میں غم کے ساتھ درد کا وہ عنصر غالب ہے جو

انھیں اس دور کے شاعروں سے الگ کرتا ہے۔ ان کے اپنے ماحول، خاندانی حالات اور تباہی و بربادی کے پس منظر میں ان کے کلام کو جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے ورنہ محبت خاں کا کلام بھی غالب و اقبال کی طرح چیستاں بن جائے گا اور شاعر کی زبان کٹ کر تنقید نگاروں کی زبان سے ایسے معنی و مطالب ادا ہوں گے جو شاعرِ عالی مقام کے وہم و گمان میں بھی نہ رہے ہوں گے۔ ان کے کلام میں نغمگی، ترنم اور شدید ترین احساس پایا جاتا ہے۔ ؎

تو مجھ کو ذرا اے خلش عشق بتا تو — کیا نت مرے پہلو میں یہی خار رہے گا
گر چشمِ سیاہ مست دکھاتی نہ بلائیں — تو فتنہ کبھی خواب سے بیدار نہ ہوتا

محبت نے بے شمار آسمانی بلاؤں کا مقابلہ کیا تھا اور جو مصائب ان پر ٹوٹے تھے انھیں وہ جھیل گئے۔ ان کے یہاں تبدیلی حالات کا ذکر ہے جس میں لذتِ درد کا شدید ادراک ہے لیکن اس کے بعد بھی ان کے کلام میں پیچیدگی نہیں پائی جاتی۔ ان کے اندر حزن و ملال کا دریا موجزن ہے لیکن اسے وہ بڑی جرأت کے ساتھ پی گئے ہیں۔ اس عہد کے تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے اور اظہار غم بھی۔ ؎

گرچہ ہیں اغیار کے ہم پر بہت ظلم و ستم — اے کریمِ عاشقاں تیرے کرم کو کیا ہوا
سر دینا کام تھا مرا سو دے چکا و لے — تیری نظر کسی کے ہے کب کام کی طرف
دیکھتے تھے جو کہ ہم عشق اب تجھے دکھلائے گا — کوئی دن میں آپ تو اپنے کیے کو پائے گا
خونِ دل پیتے تھے ہم، کھاتے تھے غم، دیکھیں تجھے — خون دل کیوں کر پیے گا کس طرح غم کھائے گا
آرے بھی سر پہ کر چلیں مانند زکریا — میں عشق سے نہ ہوں گا پشیمان یک بیک

وہ ایک ایسا پر آشوب زمانہ تھا جب اپنوں نے بھی ساتھ چھوڑ کر غیروں سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی اور یہ ایسا شدید احساس تھا جس کا ذکر اُن کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے لیکن احترامِ آدمیت کا جذبہ بھی کارفرما رہتا ہے۔ ؎

خاطر سے تیری میاں نہ بولے　　　اغیار سے کہہ تو ڈر گئے ہم

ان کا سارا کلام ان کی اپنی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ میری نگاہ میں ان کے فن کی یہی معراج ہے۔ ہم کھینچ تان کر اسے اس دور کے تنقیدی زاویوں کی طرح عصری آگہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہماری بات ہوگی، شاعر کے کلام سے اسے کوئی علاقہ نہ ہوگا۔ تنقید میں ترقی پسند شاعری کی اصطلاح ایجاد کی گئی ہے جو اشتراکت کی ہمیشہ ڈھنڈورچی رہی ہے۔ حقیقت پسند شاعری کی اصطلاح ایجاد کی گئی حالانکہ اسے سماجی آگہی کا لقب دیا گیا ہے جبکہ سماج یا عوام اس کے نزدیک اشتراکیت کا اندھا مقلد ہے۔ ہر شاعر کا معیاری اور دل کو چھو لینے والا کلام وہی ہوتا ہے جو اس کے دل کی آواز ہو! دراصل دل کی آواز ہر جگہ اور ہر قوم میں یکساں ہے اور وہی ہر دل کو متاثر کرتی ہے۔

کچھ محبت نے کیا بیزار عالم سے مجھے　　　کچھ ہوا عالم سے میں بیزار دل کے ہاتھ سے

اے فلک پیدا کیا ہے تو نے غم میرے لئے　　　راحت اوروں کیلئے، درد والم میرے لئے

تیری بیداد مجھ کو یاد آئی　　　بھولی فریاد مجھ کو یاد آئی

تماشہ قتل کا میرے نہیں کم　　　نکل آئے تماشائی کہاں سے؟

شعر ایک الہامی ملکہ ہے جس کی کچھ حدود ہیں۔ مشرقی علوم میں حالؔی نے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے عطیہ الٰہی کہا ہے اور شبلؔی کے نزدیک ذوقی چیز ہے۔ شاعری کی ابتدا کسی حادثہ یا المیہ کی مرہون منت ہے لیکن شعر ایک فن بھی ہے اور مظہر جمالیات بھی جس میں نفسیاتی محرکات بھی شامل رہتے ہیں۔ محبت کے یہاں محرومی، ذہنی کشمکش، جوش اور شدت احساس بھی ہے لیکن ہوش و تمکنت کے ساتھ۔

کاکل میں پھنسے گا جو ہوا زلف سے آزاد　　　افسوس یہ دل یونہی گرفتار رہے گا

تو مجھ کو ذرا اے خلشِ عشق بتا تو کیا نت میرے پہلو میں یہی خار رہے گا

پایا محبت اس کو تو اس دل کے بیچ میں پھر آئے سب جہاں دو ہمارے ہی گھر ملا

کسی صورت زباں پر نہیں آتا اپنے دل میں ہے مدعا کس کا

کیا ہوا جو ہم گم ناموں سے تو ظالم ملا اس میں کچھ نام ونشاں تیرا نہیں جاتا رہا

اب تو دَم رُکنے لگا ہے دفع ہو دل ہی کہیں رکھتے رکھتے ہاتھ اب دل پر الم ہونے لگا

عشق اڑ لگتا ہے مت چھو مجھ کو ورنہ اے طبیب دیکھتے ہی نبض تجھ کو یہ مرض ہو جائے گا

نالۂ بلبل کی ہے تاثیر یہ شبنم نہیں ہر سحر روتے ہیں گل سن کر فغانِ عندلیب

نواب محبت خاں کی حکومت ختم ہوئی لیکن زوال اقتدار کے ساتھ زوال ہوش کا وہ شکار نہیں ہوئے۔

یہ عشق کی آفت وہ قیامت ہے کہ جس میں صابر تو خدا کی قسم ایوب نہ ہوتا

ناصحا میں کس طرح ہوں یار جانی سے خفا کب کوئی ہوتا ہے اپنی زندگانی سے خفا

پیری میں گلرخوں کے نظارہ کا لطف ہے ہوتی ہے سیر گل شب ماہتاب خوب خوب

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا بالغرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

غرورِ جوانی ہے مستی اگر تو ہشیار رہ، ایسی مستی نہ چاہ

محبت کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے آسان اور سادہ الفاظ کو معنی آفرینی کا زیور عطا کیا۔ دنیائے تخیل کی سیر کرنے کے بجائے حقیقت کی تلاش وجستجو کرتے ہوئے شعر کو آسان وسادہ پیکر دے کر نغمگی کے ساتھ ساتھ محاورہ کا بھی خیال رکھا۔

گر چشم سیہ مست دکھائی نہ بلائیں تو فتنہ کبھی خواب سے بیدار نہ ہوتا

دل مری جان کا وبال ہوا آہ جینا مجھے محال ہوا

دل کو گنوایا جان وجگر کو بھی کھو سکا
مجنوں سے ہوں زیادہ پہ مجنوں نہ ہو سکا

تم جو منہ سے نہیں لیتے ہو محبت کا نام
ہم سمجھتے ہیں میاں کٹتے ہو اس نام سے تم

نوکِ مژہ پہ لختِ جگر آرہا ہے اب
مل جائے خاک میں نہ ثمر ٹک رہے نگاہ

گر میری محبت کا اثر خوب نہ ہوتا
محبوب ترا نام بھی محبوب نہ ہوتا

شعر کے لئے ضروری ہے کہ اس میں زندگی کی دھڑکنیں ہوں۔ اس کے ساتھ ہی خود شناسی بھی پائی جاتی ہو۔ شاعر کا کام نہ تو تبلیغ ہے اور نہ پہلے سے طے شدہ ڈھانچہ میں موضوع کو فنی قالب میں ڈھال کر پیش کرنے کا مقصد۔ اگر کوئی شاعر اس طرزِ عمل کا حامل ہے تو وہ تخلیقی عمل کو جاری نہیں رہ سکتا اور اس کا دائرہ محدود ہو جائے گا۔ اصل میں شاعری کے لئے ضروری ہے کہ اس میں زندگی کی اصلیت قاری کے سامنے آئے۔ تنقید میں وجودیت کو دوسری عالمگیر جنگ سے کافی سہارا ملا لیکن یہ مسئلہ اپنی جگہ پر قدیم ہے اور خود راشناس اپنے کو پہچانو صوفیانہ مسلک سے جڑا ہوا ہے۔

رونے سے تو میرے ہی یہاں خندۂ گل ہے
میں باغ میں ہوں ابرِ گہر بار چمن کا

نیکی ہوئی کسی سے، کسی سے بدی ہوئی
تجھ سے تو کچھ جہاں میں محبت نہ ہو سکا

کھوئی ہے عقل میری محبت نے کس کی آہ
ایسا جو ہو گیا ہوں میں نادان یک بیک

اپنا تو تبھی سے عیش تاراج ہوا
اغیار کا جب گھر مرے راج ہوا

یہاں بھی تو ساتھ مدعی کو لایا
ہم پر نہ ہوا تھا کبھی سو آج ہوا

تو جفا کرتا رہا اور آہ تیرے جور کا
کچھ نہ چارہ ہو سکا، ناچار ہم دیکھا کئے

دیر سے مجھ کو نہ کچھ کام، نہ کعبہ سے غرض
کیوں گلہ کرتے ہو اے گبر و مسلماں میرا

نواب محبت خاں محبت کے لہجہ میں غزل کی نرمی، تنوع اور ایک ہی بات کو مختلف

طریقوں سے ادا کرنے کا فن پوری طرح موجود ہے۔ حالانکہ جن حالات سے وہ دو چار ہوئے تھے اس میں چڑچڑاپن، گالیاں اور اوکھیوں کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا لیکن انہوں نے متانت، سادگی سنجیدگی، شرافت اور شائستگی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

آپ کچھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں — یہ جو ہو جھوٹ تو ہم ہاتھ قلم کرتے ہیں
کردہ بودیم وفاہا وجفاہا دیدیم — برتو این بود حق ماکہ بجا آوردی

مثنوی ''اسرار محبت'' میں بھی انہوں نے نہایت سادگی، پرکاری، روانی اور ترنم خیزیوں کے ساتھ محبت کی تعریف وتوصیف یا یوں کہا جائے کہ تمہید میں شانِ محبت کی قصیدہ سرائی کی ہے۔

محبت نام اور ہر دل مکیں ہے — محبت سے کوئی خالی نہیں ہے
جو سمجھو ذاتِ مطلق فی الحقیقت — محبت ہی، محبت ہی، محبت
محبت بوئے گل، گل ہے محبت — محبت جزو اور کل ہے محبت
محبت باطن اور ظاہر محبت — محبت اوّل اور آخر محبت
محبت سے ہر ایک ہو مست ومدہوش — محبت ہی کرے از خود فراموش
محبت اشک کو دے چشمِ باری — محبت دل کو سونپے بیقراری
محبت میں نہ ہو پروائے عالم — محبت ہی کرے رسوائے عالم
محبت اور ہی عالم دکھاوے — محبت غم دو عالم کو بھلاوے

....

محبت نے کیا کتنوں کو برباد — محبت میں موئے مجنوں و فرہاد
رکھے ہے جذبہ صادق محبت — کرے معشوق کو عاشق محبت
محبت ہی سے ہو بیتاب بلبل — محبت ہی سے ہو ٹکڑے دلِ گل

محبت ہی سے ہو تن پروانہ خاک
محبت کر دکھاوے شمع کو خاک

کرے بیخود سو وہ مے ہے محبت
خدا جانے کہ کیا شے ہے محبت

محبت مصطفیٰؐ رنگِ گلِ عشق
وہ زلف ان کی بہارِ سنبلِ عشق

وہی مصدوق، صادق اور وہی عشق
وہی معشوق، عاشق اور وہی عشق

اسے ہے عشق جو نفسِ نبیؐ ہے
اسے ہے عشق جو مولا علیؓ ہے

کہ وہ مشکل کشا ہے مائلِ عشق
ہوئی آساں اسی سے مشکلِ عشق

یہ آتش سب میں چمکی بہر رنگ
نہیں اس آگ سے خالی دلِ سنگ

نہ ہو دست تعقل سے یہ تحریر
محبت کی ہے دور از عقل تاثیر

اردو کا ایک اَن پڑھ شاعر

افغانستان کا ایک شاہی خاندان محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا۔ اس خاندان شاہی کا سردار محمد یوسف خاں تھا۔ یہ خاندان آگرہ ہوتا ہوا فیض آباد پہنچا۔ چونکہ یہ لوگ قندھار سے آئے تھے اس لیے یہاں قندھاری کہے جانے لگے اور وہ جگہ جہاں انہوں نے سکونت اختیار کی اس کو قندھاری بازار کہا جاتا تھا ورنہ ان کا تعلق افغانستان کے قبیلۂ علزئی سے تھا جو افغانستان کے اصل حاکم تھے۔ بعد میں فیض آباد سے یہ خاندان لکھنؤ منتقل ہوگیا اور اس جگہ کو جہاں انہوں نے لکھنؤ میں قیام فرمایا قندھاری بازار کہا جانے لگا۔ یہ علاقہ لکھنؤ میں لال باغ سے متصل ہے۔

نواب اودھ نے شاہزادہ قندھار کی بڑی قدر و منزلت کی اور ان کے بیٹوں کو بڑے

---

1 جو لوگ تاریخ اودھ سے واقف ہیں وہ قندھاریوں کے جاہ و جلال اور دین پروری سے بھی واقف ہوں گے۔

بڑے عہدوں پر مامور کیا اور رسالداری وچکلیداری کے منصب عطا کئے۔ قندھاریوں[1] کے کارناموں اور جرأت وشجاعت کی داستانوں سے تاریخ اودھ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ اگرچہ قندھاریوں کا رسالہ نوابین اودھ سے تنخواہ پاتا تھا لیکن وہ ان کا ملازم نہیں تھا۔ چونکہ ابھی افغانستان کے چٹیل پہاڑوں، آزاد فضا اور شاہانہ زندگی سے دور ہوئے زیادہ دن نہ گذرے تھے، اس لئے آزاد خیالی اور اپنی شاہانہ عظمتوں کے تحفظ کا خیال موجزن رہتا تھا۔ مولانا محمد مستعان کاکوروی ایک بڑے عالم تھے لیکن طبیعت سپاہیانہ پائی تھی اور سواروں میں ملازم تھے۔ ایک شخص نے حضرت محبوب سبحانی، قطب ربانی، شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ النورانی کی شان اقدس میں گستاخی کی، مولانا موصوف نے اسے قتل کردیا۔ اس واقعہ پر نواب نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ مولوی صاحب نے عبدالرحمٰن خانصاحب بہادر رسالدار قندھاری ابن محمد یوسف خاں قندھاری کو لکھا کہ نواب صاحب نے ایک گستاخ کے قتل کے بدلہ میں میرا سر کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ چونکہ میں نے آپ لوگوں کی شجاعت اور حرارت اسلامی کی تعریف سنی اس وجہ سے آپ کو اطلاع دی ورنہ ہرگز نہ لکھتا فقط والسلام راقم فقیر محمد مستعان عفٰی عنہٗ[2]

عبدالرحمٰن خانصاحب بہادر رسالدار کو یہ خط اس وقت ملا جب ان کا ایک پیر رکاب میں اور دوسرا زمین پر تھا۔ گھوڑے پر سوار ہوکر رقعہ پڑھا اور رقعہ کی پشت پر منشی کو لکھنے کا حکم دیا۔ مولوی صاحب آپ اطمینان رکھیں، کس کا مقدور ہے جو ہماری زندگی میں آپ کا سر کاٹے گا۔ اگر ایسا ہوا تو تف ہے ہماری سپاہ گری پر۔ یہ دین کا معاملہ ہے ہم دنیا کے امور میں اپنے آقا پر جان نثار کرسکتے ہیں اور دین کے امور میں علمائے دین ہمارے آقا ہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اس مردود کو کہ حضرت غوث المعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جناب عالی میں گستاخی کرتا تھا قتل کیا۔

---

[1] مفید الصالحین

[2] مفید الصالحین صفحہ ۳ مصنفہ سکندر خاں واصلی

اگر آپ ہم کو اطلاع دیتے تو آپ کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ہم لوگوں میں سے کوئی اس سگ ناپاک کو دفع کر دیتا الخیر وفیما دفع۔ آپ بہت جلد اس خادم کے غریب خانہ پر آ جاویں اللہ حامی اور مددگار ہے وفقط رقیمہ عبدالرحمٰن قندھاری عفی عنہ الباری۔ ۲

اس کے بعد اپنے رسالہ کے سواروں کو بلایا اور مشورہ کیا۔ سب نے یک زبان ہو کر ساتھ دینے کا اقرار کیا۔ پس خانصاحب نے حکم دیا کہ تیار ہو کر گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ۔ جب نواب کو قندھاریوں کی برہمی کی خبر ملی تو اس نے مولوی صاحب کی طرف بھیجی گئی فوج کو واپسی کا حکم دیا اور ایک چوبدار عبدالرحمٰن خان کی طرف روانہ کیا اور کہا کہ ہم نے مولوی صاحب کے قتل کا حکم صادر نہیں کیا ہے۔ غرض اس طرح مولوی صاحب کی جان بھی بچی اور نواب کی طرف سے مولوی صاحب کو دو ہزار روپیہ بطور انعام بھی ملے۔

محمد یوسف خاں صاحب جو ایران و قندھار کے بادشاہ تھے اپنی باہمی پھوٹ اور خانہ جنگی کی وجہ سے نادر کی یلغار کا شکار ہو کر ہندوستان ہجرت کر آئے۔ ان دنوں بنی اعمام یعنی شاہ محمود شاہ اشرف[۱] حسین بن میر ویس عرف حاجی میر خاں تاجدار قندھار آپس میں جدال و قتال میں لگے تھے۔ ان کی حکومت ایران تک پھیلی ہوئی تھی۔ نادر جو ایک اولوالعزم راہزن تھا وہ اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اور ایرانیوں کو ملا کر ان پر ٹوٹ پڑا اور نہ صرف ایران کو آزاد کرا لیا بلکہ قندھار کے علاقہ بھی چھین لئے اور وہاں سے ان کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ نادر راہزن نادر شاہ بن گیا۔ محمد یوسف خاں مستورات اور غلامان و کنیزاں وغیرہ کو لے کر ہندوستان کی طرف چلے آئے لیکن موصوف کا ایک بیٹا عبدالوہاب خاں نادر کی قید میں رہا۔ جب نادر کا وقت آیا اور لشکر افشار اس کے قتل پر آمادہ ہوا تو عبدالوہاب خاں نے اپنی تلوار سے نادر کے دو ٹکڑے کر دیئے اور اپنے والد محمد یوسف خاں کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔

---

[۱] شاہ اشرف بن عبدالقادر غلجی (غلجزئی) برادر میر اویس غلوئی

با مراد آمدم بحضرت تو
سر ظالم بریده آمده ام

محمد یوسف کے چوتھے بیٹے عبدالرحمٰن خاں تھے۔ تاریخ اودھ اور بکسر میں ان کے بڑے کارنامے ہیں۔ ان کے پوتے فضل اللہ خاں فضلؔ قطعی ان پڑھ تھے، اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے تھے لیکن اللہ کی طرف سے خداداد ملکہ شاعری کا موجود تھا۔ وہ صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں۔ شاعری ایک عطیہ خداوندی ہے۔ موصوف کا دیوان موجود ہے۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں اگرچہ شعروشاعری کا مذاق موجود تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے لیکن مجھے دوبار ایسا اتفاق ہوا کہ میں ان مشاعروں میں شرکت کرسکا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء کے غدر میں قندھاری بازار لکھنؤ سے خالصپور میں (تحصیل ملیح آباد کا ایک گاؤں) مستقل سکونت اختیار کرلی۔ کبھی کبھی کوئی شعر ہوجایا کرتا تھا لیکن جلد ہی ایک ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی اور شعر لکھوانے کے لئے ایک منشی رکھنا پڑا۔ یہاں تک کہ اس نے دیوان کی شکل اختیار کرلی۔

فضلؔ قندھاری (ملیح آبادی) نے غدر کا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تباہی وبربادی کے مناظر آنکھوں کے سامنے سے گذرے تھے۔ قتل وغارت گری، لوٹ مار اور عظمت اسلامیہ کی تباہی دیکھتے دیکھتے آگئی تھی۔ ایسے ماحول میں ایک شاعر کا دل کیا محسوس کرتا اور اس کی نگاہ کیا دیکھتی ہے اور اس پر کس قسم کا احساس طاری ہوتا ہے اس کو سمجھنا ایک عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کو صرف حساس دل ہی سمجھ سکتے ہیں اور اس کا ادارک کر کے الفاظ میں نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ اگر الفاظ کا دامن بھی تنگ ہے تو وہ صرف احساس کا ایک لطیف عکس ہی قاری کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ شاعر کی دھڑکنیں ان کے بیان سے باہر ہیں۔ یہی دھڑکنیں جب تیز ہوتی ہیں اور شدت جذبات سے جب شاعر اپنے اندر ہیجانی کیفیت پاتا ہے اور دل سے ہوک اٹھتی ہے تو عالم بے اختیاری میں کہہ اٹھتا ہے۔

وہ دُنیا تھی جہاں تم روک لیتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سننا پڑے گی داستاں میری

فضل کے یہاں ایک درد اور دھیمی دھیمی آگ ہے جو اندر ہی اندر شاعر کو جلا رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں نہ جانے کتنے صاحب کمال مالک اوج و ثروت گوشۂ گمنامی میں جا چھپے۔ اگر یہ عہد و زمانہ ہوتا تو کلام فضل لوگوں کے دلوں کو تڑپاتا اور گرماتا۔ فضل نے اپنے کلام کی ابتدا نعت سے کی ہے۔ رسول خدا کی شان میں فضل نے جس طرح نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کو آنکھوں سے لگایا جائے۔ سادگی، سلاست، روانی، اور اعتدال پسندی اُن کا وجہ امتیاز ہے ورنہ نعت گو شعراء اکثر حقیقت سے بہک جاتے ہیں اور حد اعتدال سے نکل کر حالت غلو میں داخل ہو کر مبالغہ تک جا پہنچتے ہیں لیکن اَن پڑھ فضل کا کلام ان عیوب سے بالکل پاک وصاف ہے۔

نہ تھا جس میں ذرا کینہ وہ سینہ تھا محمدؐ کا
زرِ اسرار حق سے پر دفینہ تھا محمدؐ کا
شبِ معراج بام لامکاں پر چڑھ گئے دم میں
جسے سب عرش کہتے ہیں وہ زینہ تھا محمدؐ کا
گروہ صوفیا کے اب تلک تھوڑا سا سینوں میں
جو ہے علم لَدُنی وہ خزینہ تھا محمدؐ کا
قسم اللہ کی تھا بس عجب خلقِ عظیم ان کا
نصیحت نیک کرنے کا قرینہ تھا محمدؐ کا
محبانِ خدا کو جس نے طوفاں سے بچایا تھا
نہ تھی وہ نوحؑ کی کشتی، سفینہ تھا محمدؐ کا

جہاں تک ہوتا وہ خود آپ دیتے اور دلاتے تھے

نہ پھرتا کوئی سائل خالی یہی تھی خو محمدؐ کی

عبادت جان کر اس کا لیا کرتے ہیں سب بوسہ

ترے بوسہ کا خود مشتاق اے جاں سنگ اسود ہے

ڈراتا ہے عذابِ آخرت سے مجھ کو کیوں واعظ

مجھے کیا خوف ہے دل میں مرے حبّ محمدؐ ہے

فضل کے یہاں سادگی اور صفائی کا ایک اعلیٰ معیار ہے۔ اشعار اس طرح روزمرہ کی گفتگو کے سانچے میں ڈھل کر نکلتے چلے جاتے ہیں کہ قاری کے ذہن پر بوجھ نہیں بنتے۔ انہوں نے اپنے سامنے جو کچھ دیکھا اسی کو شعری زبان میں ادا کر دیا۔ شعر دراصل جذبات صالح کے اظہار کا نام ہے اور ان جذبات کا اظہار اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان کے دل ودماغ اور اس کے پورے وجود نے اس ماحول کو اوڑھ لیا ہو اور ماحول کی ردا سے وہ جھانک کر اپنے اقدار کی گرتی ہوئی دیوار کو دیکھ رہا ہو اور ان دھماکوں سے اس کا دل بے قرار ہو کر تڑپ رہا ہو۔ یہ بے قراری اور تڑپن موزوں الفاظ کے روپ میں ڈھل کر باہر آ رہی ہو تو شعر صحیح جذبہ کی نمائندگی کرے گا اور قاری پر ایک انمٹ تاثر چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا۔

ان آنکھوں نے دیکھے جواں کیسے کیسے

ہوئے اس جہاں سے رواں کیسے کیسے

لڑکپن سے اب تک ان آنکھوں کے آگے

ہوئے انقلابِ جہاں کیسے کیسے

ہے افسوس افسوس فضل اس جہاں سے

گئے خاک میں گلرخاں کیسے کیسے

فضلؔ کے یہاں دنیا کی بے ثباتی صوفیانہ نہیں ہے بلکہ اس کا ذکر ایک سوالیہ نشان بن کر ابھرتا ہے اور قوم سے پوچھتا ہے کہ وہ ہمارے طنطنے اور عظمتیں کیا ہوئیں۔

کل جو تختِ سلطنت پر بیٹھ کر کرتے تھے حکم

آہ وہ زیرِ زمیں تنہا پڑے سوتے ہیں آج

زندگی میں جو کہ بے مشعل نہ چلتے تھے کبھی

اب نظر آتے نہیں ان کے سرِ مدفن چراغ

کل کرتے تھے غرور جو تاج و سریر پر

یارو نشاں بتاؤ کچھ ان کے مزار کا

....

دیکھا تھا پیشتر جسے ہم نے بہار میں

بادِ خزاں بتا وہ گلستاں کہاں گیا؟

کل جن کے سر پہ ہم نے دیکھا تھا تاج زرّیں

آج ان کو فضلؔ ہم نے لپٹے کفن میں دیکھا!

یہ وہ زمانہ تھا جب سارا معاشرہ انقلاب کے دہانے پر کھڑا تھا۔ نت نئے تغیرات ہو رہے تھے، کسی شے کو استحکام نہ تھا۔ ایسے ماحول میں ظاہر ہے کہ ایک اولوالعزم انسان ہر چیز کو جلد از جلد ختم کرنے کا ہی مشورہ دے سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کرنا ہے وہ آج کر لو کل پر نہ چھوڑو، ایسے ماحول میں جس طرح دھیمے سروں میں دعوت انقلاب دیتا ہے وہ جذبہ فضلؔ کو اپنے ہم عصروں میں نمایاں بنا دیتا ہے۔

خوشی سے سیرِ چمن آج کر لے اے بلبل

ذرا نہ چھوڑے گا کل تیرا یاں نشاں صیاد

عمر رواں، رواں ہے ہر لمحہ اس طرح
گھوڑا دواں ہو جیسے کسی شہسوار کا

انگریزی اقتدار کے ساتھ ہی ملک جن سازشوں کا شکار ہو رہا تھا اور جس طرح انگریز برصغیر میں سازشوں کا جال پھیلا رہے تھے اس سے فضلؔ غافل نہیں تھے۔ ان کی نظر ان چالوں اور سازشوں پر پڑ رہی تھی لیکن ان کو کاٹنے کے لئے ہاتھ میں تلوار نہیں تھی، صرف منہ میں زبان رہ گئی تھی۔ اودھ کی تاریخ میں ان سازشوں کی تلاش کی جا سکتی ہے۔

صیاد نے گل چیں کو ملایا ہے غرض سے
بلبل سے کہو چھوڑ دے گلزار سے اخلاص
اے بلبلو چمن میں ہے صیاد گھات میں
پیاسے تمہارے خون کا ہے باغباں تلک
پھنساتا کیسا ہے دم دے کے اپنے پھندے میں
نہ دیکھا ہم نے کوئی ایسا خوش بیاں صیاد
یہ ہوتا ہے ہمیں معلوم فکر سے اس کی
نہ چھوڑے گا کہیں بلبل کا بھی نشاں صیاد
یہ بھی ہو جائے گا صیاد سا جانی دشمن
نہ کرو باغ میں گلچیں سے عنادل تقریر

اس عہد میں انگریز حاکم جو کچھ کر رہے تھے وہ محض انصاف کے نام پر ہی کر رہے تھے لیکن ان کے ظلم و جور سے تنگ آ کر جب لوگ انصاف کی بھیک مانگتے تھے تو ظلم کا نشانہ بنائے جاتے تھے۔

اے دل ذرا سمجھ بوجھ کے کرنا فریاد
بے محل سنتے نہیں حاکم و عادل تقریر

انصاف کے نام پر ہونے والے ظلم کے خلاف بھی فضل نے فلسفیانہ مگر سادہ انداز میں روزانہ زندگی کی حقیقت کو بیان کیا۔

ہوگئی تو ایکدم میں گھل کر اور جل کر فنا
خونِ پروانہ کی تونے دیکھ لی تاثیر شمع

انگریز حکمراں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی عظمتِ پارینہ کو بھول کر خود کو اسی کفر و غلامی کے ماحول میں گم کردیں لیکن یہ بات ناممکن تھی۔

صیاد عندلیب کو بہلائے گرچہ لاکھ
بھولے نہ وہ قفس میں گلستاں کسی طرح

فضل نے ۱۸۵۷ء کی ساری تباہیاں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھی تھیں۔ شہر لکھنؤ میں جو غارت گری ہوئی تھی، قیصر باغ [۱] کے در و دیوار پر خونریز اور ہولناک لڑائی لڑی گئی تھی، بے شمار مومنوں کا خون بہا تھا، بچوں کی ٹانگیں چیر دی گئیں تھیں، عزت مآب دوشیزاؤں کو کھینچ لیا گیا تھا، واجد علی شاہ اختر کا لکھنؤ وحشت اور ویرانی کا نمونہ بن گیا تھا، قیامت کا منظر تھا، لوگ بھاگ رہے تھے، جن بیبیوں کی آواز در و دیوار سے باہر نہ گئی تھی وہ سڑکوں پر بغیر چادر کے ماری ماری گھوم رہی تھیں اور وحشی ان کو نوچ رہے تھے، ان حالات میں کوئی پتھر دل انسان ہی متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا تھا۔ کلام فضل کے دھیمے وسر اس بات کو بتا رہے ہیں کہ خوف و دہشت کا بازار کس طرح گرم تھا اور ظلم و جبر کا کیسا ننگا ناچ ناچا جا رہا تھا۔

---

[۱] لکھنؤ کا ایک محلہ متصل قندھاری بازار

اسیر کر کے عنادل کو کس غضب سے فصل

بہارِ باغ کو کر دیتا ہے خزاں صیاد

نہ پوچھ تجھ سے جو پہنچا ہے بلبلوں کو ملال

بیاں کروں میں کہاں تک یہ داستاں صیاد

اسیر کرتا ہے بلبلوں کو موسمِ گل میں

الٰہی قبر سے نکلے تری دھواں صیاد

نہ پوچھو بلبلو ہے باغ میں کہاں صیاد

خدا کرے وہیں غارت ہو، ہے جہاں صیاد

لکھا قسمت میں تو اپنی یہاں صیاد کا گھر ہے

بلا سے میری اے مالی بہار آئی گلستاں پر

صیاد ابھی باغ میں پھر دوڑ کے جائے

سن لے جو کہیں بلبلِ گلزار کی آواز

ستم یہ بلبلوں پر تیرا اے چرخِ کہن کیسا

کیا ہے تو نے غارت اے خزاں لطفِ چمن کیسا

تیری آمد سن کے اے صیاد ظالم باغ میں

مل کے کرتے ہیں خدا سے سب عنادل الغیاث

بہار بلبلاں میں پڑ گیا رنج و محن الٹا

خزاں نے آ کے گلشن میں کیا لطفِ چمن الٹا

خیال آتا ہے جب بلبل کو گلچیں گل کے دامن کا
قفس میں لیتی ہے رورو کے اس دم نام گلشن کا

جب ظلم و جبر حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو تنگ آمد بجنگ آمد کے لئے تیار ہونا پڑتا ہے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ موت آ ہی گئی ہے تو ہاتھ پیر ہلائے بغیر چارہ بھی نہیں رہتا۔

اہلِ جنوں جو ساتھ تھے سب کوچ کر گئے
تنہا تو فضل خانہ زنداں میں رہ گیا

کہے دیتا ہوں اب تم سے میں زنداں کے نگہبانو
جنوں زوروں پر ہے، اپنا ارادہ ہے بیاباں کا

توڑ ڈالے گا سلاسل کو بہار آنے تو دو
شور مستی ہوگا ظاہر میرے سر سے دیکھنا

ایک سخت گیر ماحول، انتظامیہ کی مضبوط گرفت اور ذرا ذرا سی بات پر قتل و غارت گری حاکم کی نگاہ شک باعث پیغام اجل جہاں بن چکی ہو اس معاشرہ میں ہمت و مردانگی یقیناً جواب دے جائے گی۔ اپنی موت کا خوف نہ بھی ہو تو دوسرے بے گناہوں کی زندگی کا کھٹکا سارے حوصلے پست کر دیتا ہے۔ اسی ماحول اور سخت گیر نظام سے متاثر ہو کر کہنا پڑتا ہے۔

پہنچ سکتا ہے نامہ تو مرا اے یارو قاتل تک
مگر اک خوف آتا ہے میرے دل کو کبوتر کا

چمن میں دوستو سن لو جہاں فصل بہار آئی
خیال آیا ہمارے دل میں پھر ان نونہالوں کا

جوں جوں غلامی کی مدت دراز ہوتی چلی جاتی ہے ذہنِ انسانی وطنیت کا تصور کھو بیٹھتا ہے اور اس پر ایک مجنونانہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مزاج میں ایک چڑ چڑاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ہر چیز کو پھونک دو یا ہر چیز جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے اور ایسی تباہی و بربادی آئے کہ صیدر ہے باقی، نہ صیاد رہے۔

عبث ہو پوچھتے نام و نشاں میرے وطن کا تم
کہیں بھی یاد رہتا وحشیوں کو ہے نشاں گھر کا
بہار آئے گی جب گلشن میں تیرے باغِ گل کی یاں
گریباں چاک کر اپنا سوئے صحرا سفر ہوگا
بچے گا کیسے محفل میں تری پھر کوئی بجلی سے
ہماری آہِ سوزاں کا ستمگر گر اثر ہوگا
مرے سینہ میں ہے وہ آتشِ سوزندۂ ہجراں
کہ جس سے جان و دل سب خاک ہو جائے سمندر کا

دنیائے شاعری میں جب تک عشق و محبت، معشوق کے خدوخال، اس کی بے رخی، وصل و ہجر کی داستان بیان نہ کی جائے اس وقت تک اس کی تکمیل نہیں ہوتی۔ قلبِ شاعر ہر چیز کو محسوس کرتا ہے۔ اس کی نگاہ دور و نزدیک کی ہر چیز دیکھ لیتی ہے۔ وہ اپنی قوت متخیلہ سے نہ جانے کتنے واقعات بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ بے شمار کائنات کے پوشیدہ اسرار کو بیان کرتا ہے، عاشق کے جذبات کا ترجمان بھی بنتا ہے اور کہیں معشوق کی اندرونی کیفیات کا غماز بھی! وہ وصل و ہجر کے واقعات کو بیان کرتا ہے تو کہیں واعظوں پر پھبتیاں کستا ہے، کبھی درِ معشوق پر سر جھکاتا ہے

اور کبھی اس کی چوکھٹ کو چھوڑ دینے کی دھمکی دیتا ہے، کبھی ہجر سے گھبراتا ہے اور خواہش وصل کے لئے تڑپتا ہے تو کبھی وصل سے ڈرتا اور ہجر کی لذتیں اٹھاتا ہے، غرض شاعر مثل دیوانہ کے ہوتا ہے۔ کیا خوب منظر کشی کی ہے عرؔفی شیرازی نے۔

می بینم و می جویم می چینم و می ریزم
می گریم و می خندم دیوانہ چنیں باید

فضؔل نے معشوق کے حسن و جمال اور شوخیوں کو ایک اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے عشق مجازی اور عشق حقیقی کو گڈمڈ نہیں کیا، ان کے یہاں امرد پرستی نہیں ہے، ان کا معشوق پردہ نشین ہے، ان کی شاعری اس کے مزاج بلکہ افغانی مزاج کی ترجمان ہے۔ وہ فراقِ یار میں گھلنے کے قائل نہیں اور نہ ہی محبوب کے پہلو میں رقیب کو دیکھ کر آہیں بھرتے ہیں بلکہ ایسے موقع پر تلوار سے فیصلہ کرنے کے قائل ہیں۔

تیری محفل میں اگر ہوگا رقیبوں کا گذر
دیکھنا چلتی ہے کیسی اے صنم تلوار آج
یوں ہی گر آتشِ ہجراں سے وہ ہم کو جلائیں گے
تو ہم بھی جل کے پھر کرلیں گے معشوقِ دگر پیدا
یاد مجھ کو تو کرے گا یہ کہے دیتا ہوں
جب کوئی مجھ سا وفادار نہیں پائے گا

حیا سے سامنے آتا نہیں کسی کے وہ بت
کبھی جو آیا تو بابرقع و نقاب آیا
سیر کوباغ کی وہ پردہ نشیں آتا ہے
ابھی اے بلبلو ہو جاؤ چمن کے باہر

زاہدان خشک خوکومخاطب کر کے کہتے ہیں۔

اگر تو دیکھ لے نقشہ رخ بت کی صفائی کا
تو دعویٰ ٹوٹ جائے شیخ تیری پارسائی کا
ہمیں دنیا میں جس دوزخ سے اے واعظ ڈراتا ہے
بجھا دے گا اسے دریا ہمارے دیدۂ تر کا

مبالغہ آرائی بھی اردو فارسی شاعری کی جان ہے اور بعض اوقات اس کے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

تمہاری نرگسی آنکھوں کے آگے کل بیاباں میں
مقابل آ کے الٹا پاؤں بھاگا تھا ہرن کیسا؟
رخِ گلگوں پہ ان کے جو عرق آیا گلستاں میں
ہوا دھوکہ دلِ بلبل کو اس دم گل پہ شبنم کا

اس کے علاوہ وصل معشوق سے بوسہ بازی، اس کی وعدہ خلافی، نازک بدنی بدن کی خوشبو، بچپن کی شوخیاں، ان میں معشوقانہ انداز کی تلاش، دھوکہ اور بناوٹ سے نفرت وغیرہ بے شمار افکار

وخیالات کو انتہائی سادگی سے پیش کر دینے کا شرف فضل خالصپوری (ملیح آبادی) کو ہی حاصل ہے۔

کیا کہوں خوش ہو کے کیا رنج پھر مجھ کو ہوا
دن کو تھا اقرارِ وصل اور کر گئے انکار رات
نازک بدن پہ بار نہ کیونکر ہو رنگ کا
مہندی نہ اپنے ہاتھوں میں اے گلبدن لگا
ساقی پیے گا وہ مرا نازک دہن شراب
ایسے صنم کے واسطے جامِ حباب لا
نظر سے گر گئی بس میری عطر کی خوشبو
جو سونگھی وصل میں ان کے بدن کی خوشبو رات

سوال اس سے کیا جب ڈرتے ڈرتے لب کے بوسہ کا
کہوں کیا کس طرح مجھ سے مرا شیریں دہن بگڑا
زکوٰۃِ مالِ جمال میں ہے سوال بوسے کے زر کا تم سے
اگر نہ دو دو تو اِک ہی دے دو جواب ہم لے کے کیا کریں گے
جو طفلی ہی سے اپنے حسن پر اترائے جاتے ہیں
نشان ان میں ابھی سے دلبری کے پائے جاتے ہیں
ہمارے قتل کو بس گردشِ ابرو ہی کافی ہیں
سنان وخنجر و پیکاں یہ کیوں منگوائے جاتے ہیں؟
نشان پیری کے ڈھانکنے کو خضاب ہم لے کے کیا کریں گے
یہ ایسا دھوکہ کا جھوٹا رنگِ شباب ہم لے کے کیا کریں گے

نہ ساقی و مل، نہ باغ و بلبل، نہ سرو سنبل، نہ غنچہ و گل
فلک پہ تیرا بغیر باراں سحاب ہم لے کے کیا کریں گے

غرض کلام فضلؔ اس عہد کی ایک مکمل دستاویز ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے مظالم، لوگوں میں پیدا ہونے والے تصنع اور بناوٹ، معاشرتی حالات پرانی قدروں کا انحطاط، نئی قدروں کی آمد اور سازشوں کی منظر کشی انتہائی سادگی کے ساتھ ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ یہ سب بیان کر کے شاعر کہتا ہے کہ۔

جاتے ہیں ہم میاں خدا حافظ
اب نہ آئیں گے یاں خدا حافظ

ملیح آباد: مرکزِ علم وادب

ملیح آباد کے چند شاعروں کا ذکر شامل تذکرہ ہے۔ کبھی یہ سرزمین علمی خزانوں سے مالا مال تھی، اہل علم کا مرکز تھی۔ مختلف علاقوں سے صاحبانِ علم یہاں آتے اور یہاں کے علمی ماحول میں ذہنی کثافت کو دور کر کے اپنی تخلیقات اور علمی خزانوں میں اضافہ کرتے۔ ان ہی صاحبانِ علم میں ایک ذات وحید الدین سلیم کی بھی ہے، جنھوں نے ملیح آباد کو پسند کیا اور یہیں کے ہور ہے۔

یہ زمین صاحبانِ سیف وقلم کا مرکز و مدفن رہی ہے۔ علماء اور اطباء ہوں کہ خطاط، شاعر ہوں کہ ادیب، تذکرہ نگار ہوں کہ داستان گو، قاضی ہوں کہ فقیہ، مجاہد ہوں کہ زاہد، غرض یہ کہ لالہ وگل اور سرو سنبل کبوترانِ خوش خرام اور بلبلانِ خوش الحان وشاعر آخر الزماں کی زمینِ ملیح آباد کے جواہر پارے پیشِ خدمت ہیں۔

جو لوگ گاؤں کی زندگی سے واقف ہوں گے، وہ گنوار کی نفسیات کو بھی جانتے ہوں گے، مثلاً اگر بانس کا مروا (بانس کے ادھر ادھر پتلی چھڑیاں) آپ کسی گنوار سے مانگ لیں تو وہ گھر جا کر کہے گا کہ میاں مروا مانگت رہیں۔ اہی ماں کونوں بھید جرور ہے اور پھر ٹالے بالے کرتا رہے گا، مروا نہیں دے گا۔ یہی حال جہل کی ٹوپیوں میں لپٹے دماغوں کا ہے، اگر آپ کسی سے اس کے پاس موجود کسی شاعر کا کلام مانگ لیں یا کوئی کتاب جو بدنصیبی سے وراثتاً اسے مل گئی ہو اور اس نے اسے جہل کے غلاف میں لپیٹ دیا ہو تو وہ کتاب بلّی کا گو بنا دے گا، مگر اس کی شکل و صورت دکھا کر نہیں دے گا۔ اسی کو اردو کے ایک منفرد شاعر چرکین نے یوں کہا ہے ؎

---

[1] واقعات ملیح آباد سید محمد علی عرش ملیح آبادی۔

سگِ دنیا جو ہیں کب وہ سخار کھتے ہیں　　　گو بھی بلّی کی طرح سے وہ چھپار کھتے ہیں

بہر حال جہل کے غلافوں اور توپیوں سے جو کچھ بچ کر میرے ہاتھ لگا، خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کرر ہا ہوں۔ یہاں اپنے دوست پروفیسر محمد عتیق مرحوم سٹی کالج کراچی کے وسیلہ سے مشفق خواجہ کا شکریہ ادا کرنا میری شرافت نفس کا تقاضا ہے۔ اہلِ علم کی یہی شان ہوتی ہے۔ دیکھئے کیا لکھتے ہیں۔

محترمی ومکرمی!　　　سلام مسنون

پروفیسر محمد عتیق کے ذریعہ آپ کا گرامی نامہ ملا۔ ممنون ہوں۔ عرش ملیح آبادی کی تاریخ ملیح آباد اور تذکرہ جو ہر فرد کو ایک ہی جلد میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ تذکرہ پر کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ تاریخ کی نقل کو ابھی اصل سے ملانے کا موقع نہیں ملا۔ چونکہ آپ کی ضرورت زیادہ اہم ہے، میں تاریخ کی نقل کا عکس ارسال خدمت کرر ہا ہوں۔

میرے لائق کوئی اور خدمت !

خیر اندیش

مشفق خواجہ

۱۳/۶/۱۹۹۷ء

خط کی ہر سطر سے علمی گل بوٹے، خاکساری و انکساری کے ترنّم ریز آبشار رواں دواں ہیں۔ میں دل کی گہرائیوں سے اپنے عزیز دوست پروفیسر عتیق مرحوم کے کرم کا ممنون ہوں جنھوں نے اوّلین فرصت میں میرا خط جو میں نے انھیں لکھا تھا، مشفق صاحب کی شفقت کے سایہ میں رکھا اور فوراً ہی محترم خواجہ صاحب نے درخواست وگذارش کو حکم نامہ کا درجہ دے کر مسودہ کی نقل ارسال فرمادی، حالانکہ میری کوئی حیثیت ہی نہ تھی مگر علم کی شان ہی یہ ہے کہ یہ دریائے

کرم ہے جس کا جی چاہے فیض یاب ہولے۔۔۔۔ مگر ملیح آباد میں لوگ اب بھی شعرائے بزرگ کے کلام کو جہل کے غلافوں میں چھپائے بیٹھے ہیں، نہ منہ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں جب کہ مداری کی بندریا تک چند ماہ میں بول چاہے نہ پائے وہ اس کی فطری مجبوری ہے مگر سر سے ہاں نہ کا اشارہ کرتی رہتی ہے۔

ملیح آباد ہی سے قریب پٹھانوں کی بارہ بستیوں میں سے الگ خالص پور بھی اب چھوٹی سی جگہ ہے۔ کسی زمانہ میں کہا جاتا تھا۔۔۔ خالص پور قندھار بسے جہاں نو سو جوان کمر کسے۔۔۔ نوابین اودھ کے یہاں قندھاریوں نے عظیم کارنامے انجام دیئے جس کے عوض چودہ گاؤں معافی میں ملے تھے۔ چھ گاؤں ضلع رائے بریلی میں ڈیلا اورڈی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ایک گاؤں فیض آباد میں بجنائی اور چھ گاؤں لکھنؤ ضلع میں، خالص پور جس کا صدر مقام رہا ہے۔

یہاں ایک بڑے صوفی بزرگ ہوئے ہیں، عبدالقادر خاں دادا میاں۔ سید احمد بریلوی جب جہاد کے لیے جانے لگے تو پہلے خالص پور آئے اور دادا میاں سے جہاد میں استقامت کی دعا کے لیے فرمائش کی۔ پہلے تو دادا میاں نے انکار کردیا لیکن ان کے اصرار بے حد پر فرمایا کہ صبح فجر کی نماز کے بعد دعا کروں گا۔ دوسرے دن فجر کے بعد دُعا شروع کی، حضرت دادا میاں چار پائی پر بیٹھے تھے اور سید صاحب نیچے ان کے قدموں کے پاس۔ جب دادا میاں پر حال طاری ہوا اور منہ سے جھاگ اُڑنے لگا تو سید صاحب

شرع محمدیؐ
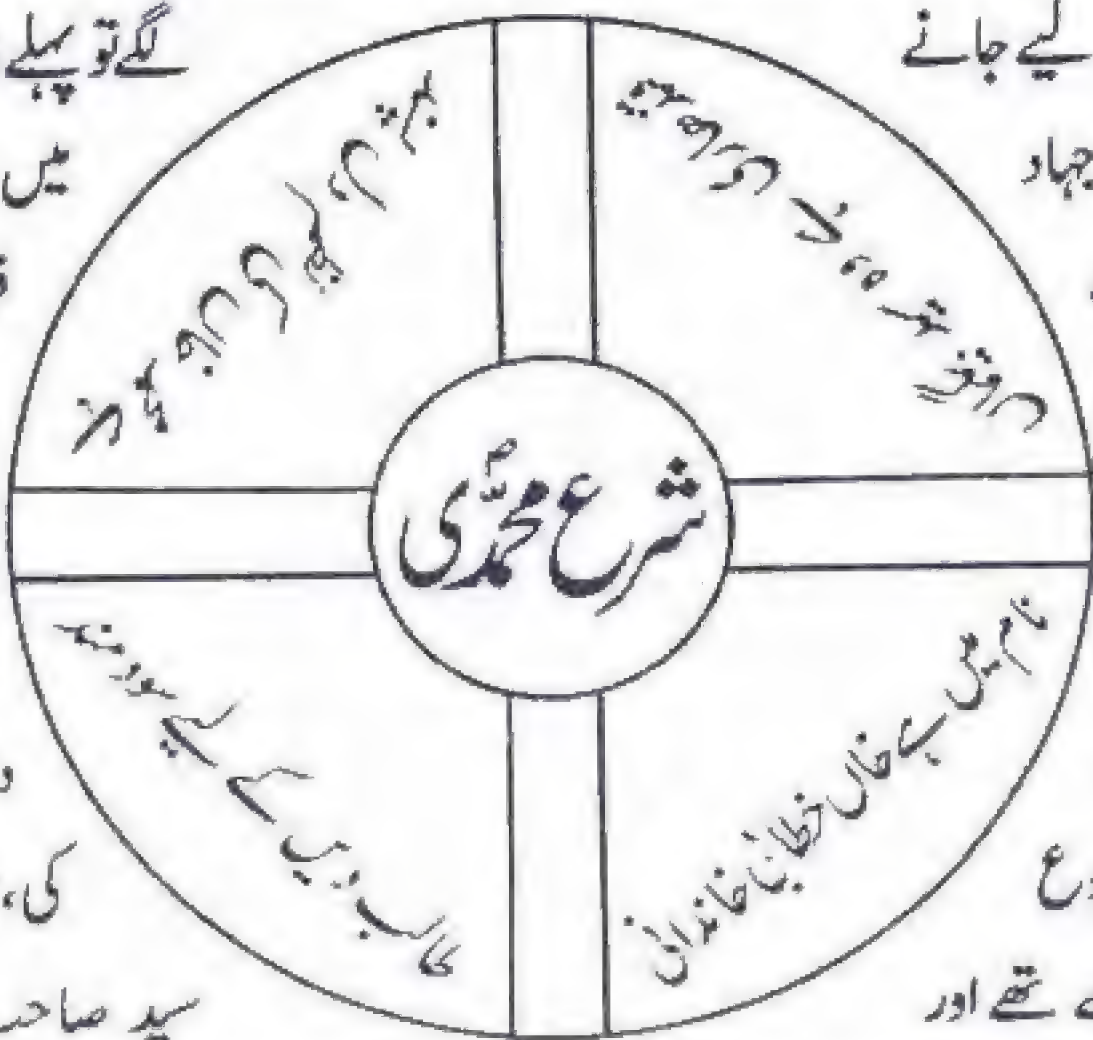
اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی داڑھی چہرہ پر ملتے جاتے تھے، جب دُعا کا عمل ختم ہوگیا تو دادا میاں نے انھیں اپنے سینے سے لگا کر رُخصت کردیا۔ ایک پٹھان کی دُعا کا اثر یہ ہوا کہ اسلام کی سر بلندی کے لیے سر کٹادیا مگر پیچھے قدم نہیں ڈالا۔

محمد خاں تونخی ولد محمد حسن خاں ولد نصر اللہ خاں ولد عبدالرحمٰن خاں قندھاری محمد خاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہزل کہا کرتے تھے۔ دادا میاں نے کہا۔ کیا فضول بکتے ہو، ان صلاحیتوں کو دین پر لگادو۔

محمد خاں بولے۔۔۔۔ میاں اپنے میں اتنی صلاحیت ہی کہاں ہے؟

دادا میاں نے کہا۔۔۔۔ کوشش کرو، اللہ مدد کرے گا۔

دادا میاں کی دُعا اور اُن کی صلاحیت و کوشش سے دین کے تمام مسائل نظم کی شکل میں لکھ دیئے ''بنام شرع محمدی'' جو لاہور سے ۱۹۳۹ء تک چھ بار چھپ چکی تھی، سرورق پر گول دائرے میں شرع محمدی اور اس کے چاروں طرف ۔

ہے محمد خاں کی نظم دل پسند   قندھاری ہے وہ سید بیگماں

نام میں ہے خاں خطابی خاندانی   طالب دیں کے لیے سود مند

یعنی عمدہ نظم دینیات کی۔۔۔۔ دائرے میں نام جس کا ہے جلی

سب مطابق اصل کے ہے بایقیں   دخل کچھ اس میں تصرف کا نہیں

ہوئے سال ہجرت کے اے ہم نفس   ہزار و دو صد اُنسٹھ برس

یہ نسخہ ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشر و تاجران کتب۔ مالکان دین محمد الیکٹرک پریس۔ بُل روڈ۔ کشمیری بازار لاہور سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کی پچاس فصلیں ہیں جس میں

پاکی کے بیان سے لے کر نماز، روزہ، زکوٰۃ، وضو اور گناہِ کبیرہ وصغیرہ تک کا ذکر نظم کیا گیا ہے۔

فضل حق سے ختم کی میں نے کتاب — کر قبول اس کو خدا وند وہاب
اور عنایت سے تری پروردگار — یہ چھپی شش بار با عزو وقار
لیک اب کی یہ صحیح چھاپی گئی — کچھ نہیں غلطی ہے اس میں واقعی
چھپی چھاپے میں از روئے شمار — ساتھ اجرت کے مکمل چار ہزار
مجھ کو لیکن پھر ہوس باقی رہی — یہ چھپے صد بار اے قادر قوی
شکر تیرا ہے خدائے کردگار — لکھنؤ میں اس نے پایا اعتبار
یاالٰہی سب میں پہنچے اس کا ناؤں — شہر شہر و قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں
اور بدل مومن کریں اس پر عمل — دیدۂ بینا رہے اے عزو جل
اے محمدؐ رو کے کر حق سے دُعا — مانگ اس کو جس سے ہو راضی خدا
اور کر پرہیز عصیاں سے مدام — تا تجھے بخشے خدا دارالسلام
یا الٰہی بر روح مصطفٰے — اور طفیل انبیاء و اولیا
بخش مجھ کو یا الہٰ العالمین — جنت الفردوس یا خلد بریں

یا الٰہی یہ دُعا ہوئے قبول
از طفیل آل و اصحاب رسولؐ

علی حیدر خاں شاعر اور عالمِ بے بدل تھے۔ مثنویٔ مولوی پر گہری نظر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایران وافغانستان سے طالبانِ علم مثنوی کا مطلب سمجھنے ان کے پاس آتے تھے۔ اکبر حسن خاں خالص پور کے ہی ایک دانشمند تھے، ان کے بارے میں علی حیدر خاں کہتے ہیں۔

خورشیدِ آسماں ہیں، جمشیدِ ملکِ جاں
سنو! انس جاں ہیں، اکبر حسین خاں ہیں

عبدالغفار خاں قندھاری انگریزی عمل داری سے ناراض تھے، لہٰذا گوالیار چلے گئے تھے اور راجہ ہولکر کے یہاں ملازمت کرلی، انتقال سے پہلے فارسی میں ایک قصیدہ اپنے خاندانی حالات کے بارے میں لکھا جو جہل کی چادر کی نذر ہوگیا۔

واقعات ملیح آباد میں سید محمد علی عرشؔ ملیح آبادی نے فقیر محمد خاں خالص پوری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ملیح آباد کی تاریخ لکھنے کے لیے انھوں نے برابر ہمّت افزائی فرمائی۔ فضل اللہ خاں فضل کا تفصیلی ذکر اس تذکرہ میں موجود ہے۔ سکندر خاں واصلؔ بھی صوفی اور بزرگ ہونے کے ساتھ ہی کئی کتابوں کے مصنّف اور اُردو و فارسی کے شاعر ہوئے ہیں، بمبئی میں اُن کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔

علی اطہر خاں خالص پوری بڑے عالموں میں تھے۔ سردار محمد خاں پنجہ کشی کے بڑے ماہر اور استاد تھے۔ ۱۹۱۲ء کے آس پاس اخبارات میں ان کے اشتہارات چھپتے تھے کہ جو اُن کا پنجہ موڑ دے گا اُسے پانچ سو روپیہ انعام ملے گا۔ افغانستان سے اکثر شائقین پنجہ ان سے پنجہ کشی کے لیے آتے، جہاں وہ ان کی بڑی خاطر مدارات کرتے تھے مگر سب ناکام لوٹتے تھے۔

مولانا آزاد نے جب انگریز کے خلاف جہاد کی تحریک اور مسلح جدوجہد کا پروگرام بنایا تو بیعت کا سلسلہ شروع کیا۔ سردار محمد خاں نے بھی بیعت کی، ذکرِ آزاد میں مولانا ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ مولانا کہتے تھے، جہاد شروع ہوا تو سردار محمد خاں سپہ سالار ہوں گے۔ پھر مولانا نے جمہوری طریقہ کو اختیار کرلیا، مگر اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے ایران، افغانستان، مصر اور ترکی میں بہت سے لوگ دیکھے جن سے میں متاثر نہیں ہوا مگر سردار محمد خاں میں ایسی مردانہ وجاہت تھی جس نے مجھے پہلی بار متاثر کیا۔ مولانا ملیح آبادی نے لکھا کہ جب سردار محمد خاں کے انتقال کی خبر میں نے مولانا کو دی تو وہ آبدیدہ ہوگئے اور دیر تک ان کا ذکر کرتے رہے، جو مولانا کے عام مزاج کے خلاف بات تھی۔

اسی خالص پور کے نزدیک علو پور میں بابا راگھوداس نام کے ایک نیک بزرگ ہوئے ہیں جن کے ورثاء کے پاس ایک کتاب ہے جو دیوناگری رسم الخط سے ملتا ہوا کوئی خط ہے۔ ہر سال ان کی سمادھی پر میلہ ہوتا ہے، جہاں مورتی پوجا نہیں ہوتی ہے۔

ملیح آباد کی بارہ بستیوں میں تین اور چیزیں مشہور تھیں۔ غریبے کی نہیں۔ غریبے مہتر خاندان کے آدمی تھے، تک بندی کر لیتے تھے اور موزوں کلمات زبان پر رواں رہتے تھے مگر ان کی شان یہ تھی اگر کسی معاملہ میں نہیں نکل گئی تو کوئی ''ہاں'' نہیں کہلا سکتا تھا، یہ بڑی گڈھی کے رہنے والے تھے۔

نبی شیر خاں کا لٹھ مشہور تھا۔ صدر پور کے رہنے والے۔ اگر کسی کے بارے میں سن لیتے کہ وہ بڑا لٹھیت ہے تو اس کے گھر جا کر پکارتے اور کہتے سنا ہے تم بڑے لٹھ باز ہو، آؤ دو دو ہاتھ ہو جائیں پھر لٹھ چلنے لگتا۔ بعد میں دوستی ہو جاتی۔ ان کے بیٹے نواب شیر خاں بڑے کنبہ پرور اور دوستدار انسان تھے، بارہ بستی میں کم از کم پچاس آدمی روزانہ ان کے دستر خوان پر کھانا کھاتے تھے۔

اسی کے قریب محمد نگر میں غنی احمد خاں تھے جن کا قلم مشہور تھا یعنی غریبے کی نہیں۔ نبی شیر خاں کا لٹھ اور غنی احمد خاں کا قلم۔ جو دستاویز لکھ دی اسے کوئی بڑے سے بڑا بیرسٹر کاٹ نہیں سکتا تھا۔

حسین علی خاں مرحوم جویاؔ

یہ بختیار نگر کے رہنے والے تھے، فقیر محمد خاں گویاؔ کے ہم عصر ہیں۔ ان کے کلام میں سے انتخاب درج ہے۔ بختیار نگر میں اُن کی اولاد بھی موجود ہے۔

تجلی بخش ہو پرتو اگر اُس روئے تاباں کا　　　تو رشکِ مہرِ رخشاں ہو ہر اک ذرہ بیاباں کا

کیا معمارِ قدرت نے خدا کا گھر دلِ مومن
اسی خاکے میں دیکھا چاہئے دیدار یزداں کا

....

انساں جو امانت کا سزاوار نہ ہوتا
تو حاملِ اسرار بھی زنہار نہ ہوتا

مخلوق کو خلاّق اگر خلق نہ کرتا
زنہار خدائی کا بھی اظہار نہ ہوتا

دنیا میں جو نیرنگئ تقدیر نہ ہوتی
قطرے سے کبھی گوہرِ شہوار نہ ہوتا

معشوق نہ ہوتا تو اگر سارے جہاں کا
جوؔیا بھی ترا طالبِ دیدار نہ ہوتا

....

میں عاشق ہوں محمدؐ مصطفےٰ کا
ہوا بندہ رقیب اپنے خدا کا

....

مجھے تو زلف سے اس بُت کی ہے گلہ دل کا
کہ جس سے درہم و برہم ہے سلسلہ دل کا

جو میں نے دل سے دعا دی تو گالیاں پائیں
غرض کہ خوب ملا آپ سے صلہ دل کا

ترے خدا ہوئے ہم جب سے ساقئ مہوش
ہوا ہے شیشۂ مے تب سے آبلہ دل کا

تمھارے غم سے پڑا ہے معاملہ دل کا
خدا ہی جانے کہ کیا ہوگا فیصلہ دل کا

....

سونگھ آئے ہیں طرّہ مگر اس رشکِ پری کا
مغز آج معطر ہے نسیمِ سحری کا

اطفالِ سرشک اپنے ہوئے خاک میں پامال
آخر کو نتیجہ ہے یہی پردہ دری کا

....

وہ نشیلی ہے آنکھ ساقی کی
بے خبر کر دیا جدھر دیکھا

حسن و خوبی میں تو فرشتہ ہے
کہیں ایسا نہیں بشر دیکھا

بے مدد تیری کچھ نہیں ہوتا
سو طرح بندوبست کر دیکھا

....

ایک سے ایک دلربا دیکھا
پر کسی کو نہ آشنا دیکھا

کیا بلا سحر تیری آنکھ میں ہے | جس کو دیکھا سو مبتلا دیکھا

....

مہرباں جس وقت ہم پر دلربا ہو جائے گا | حاصل اپنے دل کا سارا مدعا ہو جائے گا
گر گزر گلشن میں تیرا اے صبا ہو جائے گا | بارور اپنا بھی نخلِ مدعا ہو جائے گا
مہرباں، جب مہرباں ہم پر خدا ہو جائے گا | کام جو اپنا بُرا ہے سو بھلا ہو جائے گا
ہم نکوں بختوں کو بزمِ عیش میں مت یاد کر | ساغرِ مے ہو کے اُلٹا بلبلا ہو جائے گا

کیا کہوں جویا ستم ایجاد کو حیران ہوں
ایک دن وہ بے نوا شوخ خود نما ہو جائے گا

....

جب وہ صورت اپنی ہم کو برملا دکھلائے گا | تب ہمیں حاصل ہمارا مدعا ہو جائے گا
پیشتر آنے سے تصویر اپنی ہم کو بھیجئے | جب تلک آپ آئیں بندہ اس سے دل بہلائے گا

....

آخر اس بت کو میں منا لایا | کر کے یارو خدا خدا لایا
اُس کے لانے کی تھی یہی تدبیر | جو کہا اس نے میں بجا لایا
عشق کا میرے اگر تجھ میں اثر ہو جائے گا | آپ دردِ دل سے میرے تو خبر ہو جائے گا
نے زلف، نے ابروئے خمدار نے مارا | مجھ کو ترے اقرار اور انکار نے مارا

....

مجھ کو کوچے سے تو اپنے نہ مری جان اٹھا | کیا لیا دل تھا اسی واسطے قرآن اٹھا
جب کہا میں نے کہ مجھ کو نہ اُٹھا محفل سے | گر اٹھانا ہے تو اغیار کو نادان اٹھا
تب تو جھنجلا کے لگا کہنے وہ عیار کہ بس | ہم سے تو بات نہ کر، جی سے یہ ارمان اٹھا
دیکھا جب میں نے کہ ہوتے ہیں بہت وہ برہم | تب تو ناچار کہا میں نے کہ اے جان اٹھا
سُن کے یہ کہنے لگے بیٹھ میں جی دیکھتا تھا | ہے تو عاشق نہیں دنیا میں اسی آن اٹھا

تب کہا میں نے مری جان یہ اٹھنا کیا ہے
تم کہو مجھ سے تو دوں دل سے میں ایمان اٹھا

سن کے یہ مجھ سے لگا کہنے کہ اے جویا
کوئی محفل سے بھلا دیتا ہے مہمان اٹھا

کس طرح جا کے کوئی یار کے در پر بیٹھے
یار تو ایک طرف دیتے ہیں دربان اٹھا

کس کے آنے کی خبر دشت میں ہے بہر شکار
ہر طرف دیکھ رہے ہیں جو ہرن کان اٹھا

....

یا تو پڑتا تھا ترا یاروں کے کہنے پہ قدم
یا تو اب اغیار کا کہنا مقدم ہو گیا

زاہدا کہہ دیجیو کعبے کو جویا کا سلام
قصد اس کا بت کدے کو اب مصمم ہو گیا

....

عشق کا بوجھ فرشتوں سے اٹھایا نہ گیا
آپ کو چاہ سے بابل کی بچایا نہ گیا

عشق وہ شے ہے کہ مجنوں سے بھی اے اہلِ خرد
نجد کے بن کے سوا شہر بسایا نہ گیا

صدمۂ عشق کا عالم میں اٹھانے والا
دلِ انساں کے سوا دوسرا پایا نہ گیا

....

دیکھا جو تری زلفِ گرہ گیر کا نقشہ
یاد آیا مجھے حلقۂ زنجیر کا نقشہ

دکھلاؤں گا میں نامۂ اعمال کے بدلے
محشر میں خدا کو بتِ بے پیر کا نقشہ

ہرگز نہ بنا ہجر میں تقدیر کے آگے
ہم سے تو ترے وصل کی تدبیر کا نقشہ

....

کام آئے جہاں خواہشِ تدبیر کا نسخہ
چلتا ہی نہیں واں کوئی تدبیر کا نسخہ

گردِ رخِ جاناں نہیں آغاز ہے خط کا
چھپتا ہے یہ قرآن کی تفسیر کا نسخہ

....

ہند کے جتنے مہ لقا ہیں یہ
بے مروت ہیں، بے وفا ہیں یہ

آسماں و زمین و ما فیہا
ایک دن سب کے سب فنا ہیں یہ

پدر و مادر و برادر و خویش
تا لبِ گور رہنما ہیں یہ

مے پرستی و رندی و خواری
مذہبِ عشق میں روا ہیں یہ

نالۂ و گریہ، درد و سوزِ جگر　　اپنی کشتی کے ناخدا ہیں یہ

....

دردِ سر پر تو مرے صندل لگانا چھوڑ دے　　یہ دوا میری نہیں، میرا اُڑلانا چھوڑ دے
میں نہیں کہتا کہ تو سارا زمانہ چھوڑ دے　　ایک بس اغیار کے منہ کو لگانا چھوڑ دے
کس طرح کوئی ترے کوچے کا جانا چھوڑ دے　　بلبلِ مشتاق کیوں کر آشیانا چھوڑ دے
بات تو سچی کہا کر مل نہ مل مختار ہے　　میرا کہنا مان اے بدخو بہانا چھوڑ دے

....

واں تو سو طرح کی آرائش و زیبائی ہے　　یاں پریشانی ہے اور جان پہ بن آئی ہے
عشق کرنا تو عجب دانش و دانائی ہے　　اپنا جی جاتا ہے اور خلق تماشائی ہے
قاتل آیا جو مرے سر پہ تو میں بول اٹھا　　مار مت اس کو یہ تیرا ہی تماشائی ہے

....

بت پرستی کفر ہے ہر چند پر　　تجھ سے بت کا پوجنا ایمان ہے
تاب بوئے گل تجھے اے بت نہیں　　یہ نزاکت بھی خدا کی شان ہے
دے وہ ساغر جس میں ہوں دونوں جہاں　　یہ ترا ساقی بڑا احسان ہے

....

نشاں اپنا نشانِ بے نشاں ہے　　کوئی بتلائے اب ہستی کہاں ہے

....

عارض کو تم نہ سمجھو نہاں زلفِ یار میں　　بے شبہ اتفاق ہے لیل و نہار میں
روتے نہیں تصورِ دنداں کی یاد میں　　موتی پرو رہے ہیں گریباں کے تار میں
دل تو کبھی کا دے چکے اب ہجر میں ترے　　باقی تھی ایک جاں سو چلی انتظار میں
تھا عہد دل نہ دیں گے کسی بت کو ہم نشیں　　پر اس کو دیکھ کر نہ رہا اختیار میں

....

ہرن کی آنکھ کو نسبت ہے چشمِ لیلےٰ سے　　وگرنہ قیس کی تھی کیا مراد صحرا میں

یہ میں نے ہے کیا آ اجتہاد صحرا میں
کہ قیس لایا مرا اعتقاد صحرا میں

تمام صید ہیں مشتاق سر بکف یکجا
یہ کون آتا ہے آفت نہاد صحرا میں

ہمارا سکہ شوریدگی جنوں نے پڑھا
ہم اس زمانے کے ہیں کیقباد صحرا میں

....

سب تجھے او بتِ بے پیر لیے پھرتے ہیں
ہم بغل میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

جس نے دیکھا ہے ترے نور کا جلوہ اے شوخ
سورۂ نور کی تفسیر لیے پھرتے ہیں

ہم نے بوسہ کہیں مانگا تھا گنہگاری میں
دربدر وہ پئے تشہیر لیے پھرتے ہیں

آپ ہم زلفِ گرہ گیر صنم کے ہیں اسیر
وہ عبث حلقۂ زنجیر لیے پھرتے ہیں

اب بہار آئی ہے اور جوشِ جنوں ہے ناصح
آپ کیوں دفترِ تقریر لیے پھرتے ہیں

وحشتِ عشق ہے ہم دشتِ جنوں میں دن رات
لشکرِ نالۂ شب گیر لیے پھرتے ہیں

....

نکہتِ زلفِ صنم لا کے سنگھادے مجھ کو
ہم خوشامد تری اے بادِ صبا کرتے ہیں

زاہدا یہ نہ سمجھنا کہ فقط رند ہیں ہم
گو ہیں بُت خانے میں پر یادِ خدا کرتے ہیں

....

بھولتے ہم کو نہیں صاحب تمھارے ہاتھ پاؤں
چھوٹے چھوٹے، گورے گورے، پیارے پیارے ہاتھ پاؤں

اب نہ مسجد جائیں، نے پائے برہمن کو چھوئیں
آج کل ہیں سب طرف سے اپنے ہارے ہاتھ پاؤں

تیغ ابرو سے تری ہم ہو رہے ہیں نیم جاں
باندھتا ہے کیوں عبث ظالم ہمارے ہاتھ پاؤں

....

نسبت اُن آنکھوں کی کیا آنکھوں سے آہو کی کریں

وہ کٹیلا پن کہیں آہو کی چتون میں نہیں

قدرتِ حق سے نکل جاتی ہے اونٹوں کی قطار
گرچہ گنجائش یہ چشمِ تنگ سوزن میں نہیں

کھلائیں گے اسے دعوت میں ہم کبابِ جگر
ہوئی سینے میں آ کر جو میہماں فریاد
ہر ایک عضوِ بدن اب تو جل کے خاک ہوا
رکھوں کہاں تلک اب اس دل میں مَیں نہاں فریاد
ملے ہیں شہرِ جنوں میں نئے نئے غمخوار
جو آہ و نالہ ہے مشفق، تو مہرباں فریاد
کبھی ہوں کوچۂ جاناں میں گہہ بیاباں میں
کروں اکیلا الٰہی کہاں کہاں فریاد

صفائی قلب کی چاہے تو ہے ترکِ ہوس بہتر
ہتھیلی پر اگر ہو شمع تو ضبطِ نفس بہتر
یہی کہتی تھی ہنگامِ خزاں صیاد سے بلبل
نہ ہو گلزار میں گر گل تو پھر کنج قفس بہتر
کہا بدلی سے حیرانی میں میرے دیدۂ تر نے
اگر ہم ہوش میں آئے سمجھ لیں گے برس بہتر

رکھتا ہے کیوں تو دام میں اپنے نہاں قفس
صیاد عندلیب کہاں اور کہاں قفس
ہوں میں وہ عندلیب مجھے ہے جہاں قفس
ہے قید آب و گل کی مجھے باغباں قفس
رہتا ہے ہم کو یاں تو ہر اک بات کا قلق
اور روز حشر ہوگا فقط ذات کا قلق
عصیاں سے میرا نامۂ اعمال ہے سیاہ
رہتا ہے رات دن مجھے اس بات کا قلق
کر بیٹھے ہیں پہلے بدی جو کہ بے سبب
ہوتا ہے پھر انہی کو مکافات کا قلق
گو مجھ کو یاں نہیں ہے کسی بات کا قلق
پر ہوگا ایک دن ہمیں مافات کا قلق

پہلے تو دے دیا اسے بے آزمائے دل
جاری ہے اب زبان پر افسوس ہائے دل
اب کے بلائے عشق سے خالق بچائے دل
کافر ہو پھر کبھی جو کسی سے لگائے دل
تکیے سے گرچہ سر بھی اٹھانا محال ہے
لیکن ابھی تلک تو وہی ہے ہوائے دل

اب ترے بغیر آنے کے بس مر جائیں گے ہم — پہلے سے کہے دیتے ہیں یہ تجھ کو خبر ہم
بے رحم واں شوق تجھے رنگِ حنا کا — کھاتے ہیں غمِ ہجر میں یاں خونِ جگر ہم

شاید کبھی بھولے سے ادھر آئے وہ جویا
رہتے ہیں پڑے اس سے سرِ راہ گزر ہم

....

ساقیا آئے تھے سن کر تیرے میخانے کو ہم — لے چلے خالی یہاں سے دل کے پیمانے کو ہم
فصلِ گل ہے اور جنوں کا جوش ہے بستی کو چھوڑ — مثلِ مجنوں جا کریں آباد ویرانے کو ہم
کعبہ و مسجد میں اُس بت کا پتہ پایا نہیں — زاہدا ناچار اب جاتے ہیں بت خانے کو ہم

....

دیکھا نہیں کسی نے کبھی وصلِ یار میں — پایا جو لطف ہم نے شبِ انتظار میں
جانا سمجھ کے دل خمِ گیسو کے پاس ہے — ہے فرق اس کے زہر میں اور زہر مار میں

....

جو پڑھا تھا سو فراموش ہوا وحشت میں — سبقِ عشق مگر دل سے بھلایا نہ گیا
نام کو وصل ہوا، دم میں گئی رات گذر — آسماں تجھ سے بھی خورشید چھپایا نہ گیا
کیوں خفا مجھ سے ہے کیا جرم و خطا میری ہے — کون سا ناز ترا مجھ سے اٹھایا نہ گیا
گل کے جانے کا تو افسوس نہ کر اے بلبل — کون گل ہے کہ وہ گلزار میں آیا نہ گیا

عشقِ با ہم نے نہاں سب سے کیا ہے جویا
پر رفیقِ دلِ پر سوز چھپایا نہ گیا

....

میں شہر سے جو دشت میں جا نالہ زن ہوا — ہمسائے بولے نیند کا اپنی خلل گیا
پہنچا وہی مقام کو راحت سے راہ رو — پہلے جو آفتاب سے دو کوس چل گیا

....

ہنس کے بولے مری گردن پہ وہ تلوار لگا — لے نہ خوش ہو گا کہ بیڑا ترا اب پار لگا
ہوں میں اک سبزۂ نورستہ کا زخمی جراح — زخم بڑھ جائے گا گر مرہم زنگار لگا
میں جو صحرا کو تری زلف کے سودے میں گیا — تکنے بانبی سے نکل کر مجھے ہر مار لگا
ہو کسی وقت تو رندوں کا کلیجہ ٹھنڈا — بطِ مے برف میں اے ساقی سرشار لگا

....

کس لیے مجھ سے ہیں خفا سے آپ — گھورتے ہیں جو اس ادا سے آپ
شیخ صاحب معاف کیجیے، ہم — مانگ لیں گے دعا خدا سے آپ
چشمِ بد دور، بے حجابانہ — ہم عناں اب تو ہیں ہوا سے آپ

....

صبح پوچھی جو اس سے شب کی بات — ہنس کے بولے کہ ہے یہ کب کی بات
جو کہ ہمسر بنے مسیحا کا — پائے وہ اس کے زیر لب کی بات
سنے انسان چاہیے سب کی — پر کرے اپنے جی کے ڈھب کی بات
آج غصہ ہے کیجیے ارشاد — تم نے خوش ہو کے مجھ سے کب کی بات

....

سنتا ہوں میں بہار کا ہے گلستاں سے کوچ
اے عندلیب تو بھی کر اب آشیاں سے کوچ

بد صورت اور حسین، فقیر اور بادشاہ
ایک روز سب کریں گے سرائے جہاں سے کوچ

....

کروں جو سوزِ جگر سے میں بے زباں فریاد
یہ آگ برسے کہ کرتا پھرے جہاں فریاد

یہ طرفہ ماجرا یہ کون کہے — کہ ہم مرتے ہیں اور بے خبر ہے
خدا جانے ہمارا حال کیا ہو — یہی احوال اُس بت کا اگر ہے

بے گنہ سیکڑوں دل زلف میں پابند کیے
یہ تو اندھیر بڑا آپ کی سرکار میں ہے
جھوٹے جھگڑوں کے سوا آپ ہی کیجئے انصاف
ذکر حق کا بھی کبھی آپ کی سرکار میں ہے

(دیکھیے تذکرہ جوہر فرد صفحہ ۵۱-۶۰)

نواب فقیر محمد خاں

فقیر محمد خاں تہور جنگ حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں بہادر المتخلص گویاؔ۔ گویا کے دادا یار بیگ خاں درۂ خیبر کے سرداروں میں تھے۔ یار بیگ خاں کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام محمد نامدار خاں تھا چھوٹے بیٹے کا نام محمد بلند خاں۔ محمد بلند خاں اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد کو اپنے قبیلے کے چند ہمراہیوں کے ساتھ درہ خیبر سے نکل کر قائم گنج ضلع فرخ آباد میں آباد ہو گئے تھے۔ وہاں سے غازی الدین حیدر کے زمانہ میں بلند خاں اودھ کی ریاست لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ شہر کے قلب سٹی اسٹیشن کے پاس ان کی یادگار بلند باغ اب بھی موجود ہے۔ اسی سے ملحق کچا حاطہ یا احاطۂ فقیر محمد خاں بھی موجود ہے۔ پٹھان شروع میں کچے مکان بناتے تھے اس لیے کہ حاکم کی نظر بدلی اور وہ گھوڑے کی پیٹھ پر۔ فقیر محمد خاں اور محمد عوض خاں کے کنولہار (ملیح آباد) میں بھی کچے مکان تھے۔ یہ محلہ لبِ دریا (جس کا نام بیتا ہے) آباد ہے۔ محمد عوض خاں

لکھنؤ سے اندور کی ریاست چلے گئے اور مہاراجہ ہولکر کی فوج کے رسالدار ہو گئے۔ فقیر محمد خاں کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال تھی وہ اپنی تعلیم میں مشغول رہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ بھی بڑے بھائی کے پاس چلے گئے اور ان کو بھی رسالداری کا منصب مل گیا۔ اسی بیچ مہاراجہ ہولکر کو اطلاع ملی کہ اندور پر حملہ ہونے والا ہے۔ حملہ آور کی فوج اندور شہر سے تھوڑے فاصلہ پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے، صبح ہوتے ہی وہ حملہ کر دے گی۔ صبح کو جنگ کا بگل بجا۔ دشمن کی فوجی طاقت زیادہ تھی۔ معرکہ سخت تھا، ہولکر کے فوجی ہچکچا رہے تھے، مگر فقیر محمد خاں دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور شمشیر زنی اور نیزہ بازی کے جوہر دکھانا شروع کیا تو ہولکر کی فوج کے حوصلے بلند ہو گئے، بڑے بھائی کا دِل بلّیوں اُچھلنے لگا اور پھر ایسا زبردست حملہ کیا کہ دشمن کی فوج کے پیر اُکھڑ گئے۔ حملہ آور راجہ سر پر پیر رکھ کر بھاگا مگر فقیر محمد خاں نے اس کا تعاقب کیا اور کئی میل کے فاصلے پر گرفتار کر کے راجہ ہولکر کے قدموں میں ڈال دیا۔

بخشا ہے مجھ فقیر کو رتبہ امیر کا — کیا کیا کروں میں شکر خدائے قدیر کا
جب ہو خیال پہلے تولد سے شیر کا — اس بندہ پروری کا بھلا کس سے شکر ہو

فلک ہے زیر فرمانِ محمدؐ
بڑھی ہے عرش سے شانِ محمدؐ

ان دونوں بھائیوں کی بہادری کی داستانیں راجپوتانہ میں پھیلنے لگیں تو ٹونک کے نواب امیر خاں تک یہ خبر پہنچی، والیٔ ٹونک نے راجہ ہولکر کو ایک خط روانہ کیا جس میں دونوں بھائیوں کو ان کے یہاں بھیجنے کی گزارش تھی۔ مہاراجہ ہولکر نواب ٹونک کا دوست بھی تھا اور ان سے بگاڑ لینا خطرہ سے خالی نہیں جانتا تھا لہٰذا اس نے انھیں لکھا کہ آپ کے اور میرے درمیان برادرانہ تعلقات ہیں۔ اگر آپ میری اس گزارش کو مان لیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اور وہ یہ کہ ایک بھائی آپ کے پاس رہے اور ایک میرے پاس رہے۔ امیر خاں نے اس درخواست کو قبول کر لیا اور

فقیر محمد خاں ٹونک چلے گئے۔امیر خاں نے ان کی بڑی عزت کی، برادرانہ تعلقات قائم کیے اور اپنی فوج کا رسالدار بنا دیا۔ٹونک اس زمانہ میں بڑا علمی مرکز تھا۔فقیر محمد خاں وقت نکال کر اکتساب علم بھی کرتے رہے۔باقاعدہ نواب بن جانے پر امیر خان نے فقیر محمد خاں کو قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز کر دیا۔پھر اودھ کی حکومت سے بعض معاملات پر بات کرنے کے لیے امیر خاں نے فقیر محمد خاں کو سفیر بنا کر اودھ بھیجا۔وہ سفیر کی حیثیت سے اودھ کے نواب غازی الدین حیدر سے ملے۔ان کی شجاعت اور سپہ گری کے قصے وہ سن چکے تھے مگر جب نواب سے بات ہوئی تو نواب نے کہا۔"خان صاحب آپ خالی سپہ گری کے ہی ماہر نہیں ہیں بلکہ عالمانہ بصیرت کے بھی مالک ہیں۔"

فقیر محمد خاں نے عرض کیا۔"میرے والد محمد بلند خاں آپ ہی کی ریاست میں رہتے ہیں اور آپ ہی کے نمک خوار رہے ہیں۔

غازی الدین حیدر نے پھر کہا۔"تب تو آپ اپنے وطن آجائیں۔"

فقیر محمد خاں نے جواب دیا۔"حضور یہ بات آئین وفاداری کے خلاف ہے اور افغانی شرافت کے منافی ہے کہ نواب ٹونک کی سفارت کو ترک کر کے یہیں ٹھہر جاؤں۔"

غازی الدین حیدر نے حکم دیا کہ نواب معتمد الدولہ آغا میر وزیر اودھ کو حاضر کیا جائے۔آغا میر کے آتے ہی انھوں نے فرمایا کہ ایں جانب کی طرف سے نواب امیر خاں کو خط روانہ کرو۔امیر خاں نے غازی الدین حیدر کی بات مان لی اور فقیر محمد خاں کو ان کے پاس رہنے کی اجازت دے دی۔اس خبر سے فقیر محمد کو مطلع کر دیا گیا۔

مگر انھوں نے کہا۔"جب تک نواب امیر خاں مجھ کو براہ راست خط لکھ کر اجازت نامہ نہیں روانہ کرتے میں ایسا نہیں کر سکتا۔کچھ دنوں کے بعد والی ٹونک کا خط فقیر محمد خاں کے نام آ گیا اور اودھ میں قیام کی اجازت مل گئی۔اس منظوری کے بعد فقیر محمد خاں نے غازی الدین

حیدر سے عرض کیا کہ خداوند نعمت کی ملازمت سے پہلے میری دلی تمنا ہے کہ ملیح آباد جا کر اپنے والد محترم کی قدم بوسی کر کے ان کی دعائیں لے لوں۔ غازی الدین نے آغا میر کو حکم دیا کہ فقیر محمد خاں کو ہاتھی پر ملیح آباد روانہ کیا جائے۔ تین سو سوار اور نقیبوں کی ایک ٹولی بھی ان کے ساتھ کر دی جائے۔ اس شان وشوکت سے جب وہ ملیح آباد پہنچے اور نقیبوں کی صدائیں بلند ہوئیں کہ فقیر محمد خاں بہادر کی سواری آتی ہے تو سب پٹھان گھروں سے نکل کر باہر آ گئے، فقیر محمد خاں نے آبادی کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہاتھی سے کود کر سڑک پر کھڑے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو گلے لگایا اور آگے بڑھے تو سب نے عرض کیا آپ ہاتھی پر سوار ہو جائیں۔

فقیر محمد خاں نے کہا۔ ''میں پٹھان روایات بھولا نہیں ہوں، بستی میں ہاتھی پر سوار ہو کر جانے میں میری ماں بہنوں کی بے پردگی ہوگی، لہٰذا وہ پیدل اپنے باپ کے گھر کی طرف چلے۔ سامنے دروازہ پر بلند خاں کھڑے دکھائی دیئے تو دوڑ کر فقیر محمد خاں ان کے قدموں سے لپٹ گئے۔ باپ نے ارے میرا فقیرا! کہہ کر سینے سے لگا لیا۔ باپ کی قدم بوسی اور دعاؤں کے بعد جب وہ لکھنؤ واپس آئے تو غازی الدین حیدر نے ان کو پچیس ہزار سواروں کا رسالدار بنا دیا۔ فقیر محمد خاں کے آنے سے پہلے عبدالرحمٰن خاں قندھاری کے بیٹے عبدالہادی خاں اہم فوجی عہدہ پر موجود تھے۔ انھوں نے فقیر محمد خاں کی آمد کو نیک فال جانا۔

فقیر محمد خاں صاحب سیف وقلم ہی نہیں سیاسی تدابیر کے بھی بڑے ماہر تھے اور اگر انگریزوں کا اقتدار اودھ پر نہ قائم ہو چکا ہوتا تو نوابین اودھ کے زوال کے بعد اودھ کے مالک وہی ہوتے۔ غازی الدین حیدر نے فقیر محمد خاں کو جلد ہی وزیر مال بھی بنا دیا اور ساتھ ہی سرکار خیر آباد کا گورنر بھی مقرر کر دیا۔ (راجہ محمود آباد نے اپنے دیوان (دیوان سحر) میں بطور مبارکباد ایک قطعہ بھی کہا ہے۔)

غازی الدین حیدر نے گولہ گنج میں فقیر محمد خاں کو زمین کا ایک بڑا ٹکڑا عطا کیا جس پر

انھوں نے اپنے والد کے نام پر بلند باغ لگوایا۔ باقی احاطہ فقیر محمد خاں گویا خام و پختہ میں مکانات بنوائے۔

فقیر محمد خاں کو ان کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ آغا میر کے قتل کی سازش ہو چکی ہے۔ میرن حاجی نے دو راجپوت سپاہیوں کو دس دس ہزار روپیہ دیے ہیں کہ آغا میر جب شاہی طبیب حکیم واجد علی خاں کے بیٹے کی شادی میں جائیں تو قتل کر دیا جائے۔ ان کو حکیم صاحب کے مکان کے پھاٹک کے پٹوں کے پیچھے چھپا دیا گیا تھا۔ فقیر محمد خاں فوراً ہی آغا میر کے محل میں گئے اور حکیم صاحب کے بیٹے کی شادی میں آغا میر کے ساتھ خود بھی چل دیے۔

جب حکیم صاحب کا مکان آ گیا تو فقیر محمد خاں نے آغا میر کو روک کر کہا۔ اب یہاں سے آگے میں چلوں گا آپ میرے پیچھے چلیں۔ آغا میر کے سارے ہمراہی دنگ رہ گئے۔ آغا میر سمجھ دار آدمی تھا، فوراً ہی بھانپ گئے کہ فقیر محمد کے پاس کوئی خطرناک خبر ہے۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ جیسے ہی فقیر محمد خاں نے پھاٹک کے اندر قدم رکھا ان پر حملہ ہو گیا۔ انھوں نے تلوار نکال کر حملہ آوروں کو للکارا پھر دونوں کا کام تمام کر دیا۔ اگر چہ ان کا ایک بازو بھی زخمی ہو گیا۔ آغا میر نے جھپٹ کر فقیر محمد خاں کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔ زخمی ہاتھ کو بوسہ دیا۔ پھر آنکھوں سے لگایا۔ شاہ اودھ نے ان کے اس کارنامہ پر تعریف و توصیف کی، ساتھ ہی سات پارچہ کی خلعت سے نوازا اور نواب حسام الدولہ، تہور جنگ کا خطاب بھی عطا فرمایا۔ اس دور کے بڑے شاعر شیخ ناسخ نے اس پر ایک قطعہ بھی کہا تھا جو ان کے دیوان تاریخ مجروح شدن دست فقیر محمد خاں کے عنوان سے موجود ہے۔

آغا میر کے بعد ہونے والے وزیر اعظم نے اپنے گھر بلا کر فقیر محمد خاں پر ایک مست بھینسا چھوڑ دیا اور خود بالا خانہ سے تماشہ دیکھتا رہا مگر انھوں نے تلوار کے دو ہی وار میں اس کا بھی کام تمام کر دیا۔ پھر وہ بالا خانہ پر چڑھ گئے اور میر مہدی کا گریبان پکڑ کر کہا۔ تو ابھی نادان ہے،

بچہ ہے، پٹھانوں کو نہ چھیڑ اور سر سے دستارِ وزارت اُتار کر اپنے قدموں تلے روند کر باہر نکل گئے۔ باہر کھڑے لوگوں نے سنا کہ وہ کہتے جارہے تھے، گدھی کا بچہ پٹھان کی شجاعت کا امتحان لے رہا تھا۔

فقیر محمد خاں کے سارے انتظامات ان کے نائب میرزا حسن علی بیگ عرف حسو کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کانپور کی ایک خاتون فقیر محمد خاں سے ملنے آئیں اور رونے لگیں کہ میرے بیٹے نے ساری جائیداد ڈیڑھ لاکھ روپیہ میں آپ کے کسی کارندے کے ہاتھ فروخت کردی، میں جس کی واپسی چاہتی ہوں۔ حسو بیگ طلب کیے گئے انھوں نے کہا۔ ڈیڑھ لاکھ میں نہیں تین لاکھ میں خریدی گئی ہے۔

بیگم صاحبہ نے عرض کیا یہ ڈیڑھ لاکھ میں لائی ہوں آپ رکھ لیں باقی کے لیے دو ماہ کی مہلت دے دیں۔

فقیر محمد خاں نے فرمایا۔ ''محترمہ آپ کا بیٹا یہ جائیداد پھر کہیں فروخت کردے گا۔''

بیگم صاحبہ یہ سن کر رونے لگیں کہ شاید ان کی نیت واپس کرنے کی نہیں ہے۔

فقیر محمد خاں نے کہا۔ ''آپ آنسو نہ بہائیں'' اور میرزا حسو بیگ کو حکم دیا کہ یہ جائیداد میری طرف سے بیگم صاحبہ کے نام ہبہ کردیں۔

اسی طرح ان کی دریا دلی کا ایک اور واقعہ ہے۔ رام پور کے کسی نواب خاندان کے فرد نے فقیر محمد خاں سے عرض کیا کہ میری جگہ پر دوسرا شخص قابض ہوگیا ہے۔ از روئے قانون نواب مجھے ہونا چاہئے۔ مجھے اپنا مقدمہ لندن پریوی کونسل میں لے جانا ہے جس کے لیے مجھے اسی ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ فقیر محمد خاں نے یہ رقم فوراً ان کو دے دی اور پھر وہ مقدمہ جیتے، نواب بنے مگر ان کے بار بار بلانے پر نہ تو رام پور گئے اور نہ رقم واپس لی۔

تاریخ اودھ کے مؤلف کا بیان ہے کہ فقیر محمد خاں ایک اولوالعزم سپہ سالار ہی نہیں بلکہ مزاج بھی شاہانہ رکھتے تھے۔ ایک بار آغا میر نے کہا کہ اس فصل میں وہ آم کھانے ملیح آباد

آئیں گے اور بادشاہ سلامت کو بھی ساتھ لائیں گے۔نواب فقیر محمد خاں نے ان مہمانوں کے لیے ایک بارہ دری تین لاکھ روپیہ خرچ کر کے بنوائی اور فرنیچر وغیرہ پر بھی تین لاکھ خرچ کیے، اس کے ساتھ ہی کئی محلات بھی تعمیر کرائے۔

صاحب صبحِ گلشن نے ملیح آباد کی رفیع الشان عمارتوں کو ان کی عظمت و ثروت کے آثار بتایا ہے۔ صفیر بلگرامی کہتے ہیں کہ انھیں (یعنی فقیر محمد خاں) کو آموں کا بہت شوق تھا اور آم (کے باغات) بڑے اہتمام سے لگائے تھے، سنا ہے کہ وہ دودھ اور شربت سے سینچے جاتے تھے (یہ مبالغہ ہے)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے لکھا کہ باوجود ہجوم دنیا، قدر دانِ اہلِ فن است، فقیر محمد خاں کا عروج نصیر الدین حیدر تک رہا۔ وہ اودھ کی فوجوں کے سپہ سالار تھے اور خود چودہ سو سپاہی اپنی ذاتِ خاص میں رکھتے تھے۔ صاحب نامۂ مظفری نے لکھا ہے کہ عربی زبان ایسی صاف بولتے گویا وہ ان کی مادری زبان ہے۔ ترکی زبان پر بھی قدرت رکھتے تھے۔

فقیر محمد خاں اپنے والد محترم کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ ایک بار ان کے والد کچھ آموں کے معاملہ میں ناراض ہو کر لکھنؤ آئے اور ان کو بھری محفل میں یہ کہہ کر مارنے لگے کہ تیری یہ مجال کہ میرے آدمیوں کو آم توڑنے سے روک دے۔ یہ کہہ کر جب وہ باہر جانے لگے تو فقیر محمد خاں نے دوڑ کر ان کے قدم پکڑ لیے اور کہا باوا مجھے معاف کر دیں۔ پھر باپ کا غصہ سرد پڑ گیا اور بیٹے کو گلے لگالیا۔ پورے اودھ میں فقیر محمد خاں کی فرمانبرداری اور بے مثال شرافت کا ذکر بلند ہو گیا۔ کئی شاعروں نے ان کی اس سعادت مندی پر ان کی شان میں قصیدے بھی کہے اور انھوں نے شاعروں کی جھولیاں بھر دیں۔

فقیر محمد خاں علم و ادب کے دلدادہ تھے۔ اگر چہ ان کی مادری زبان پشتو تھی مگر انھوں نے خود کو اردو شعر و ادب کے سانچے میں ایسا ڈھالا کہ آتش و ناسخ کی محفلوں میں بھی اجنبی نہیں

لگتے تھے بلکہ ناسخ کی تحریک صفائی زبان کے اہم رکن تھے۔ فارسی زبان پر بھی ان کو قدرت حاصل تھی۔ پنچ تنتر، پھر کلیلہ دمنہ اور انوار سہیلی کا ترجمہ بستان حکمت کے نام سے کیا جو زبان و بیان کے اعتبار سے اہم ادبی کتاب ہے۔ ایک دیوان بنام دیوانِ گویا بھی یادگار چھوڑا۔ فقیر محمد خاں کا قلمی دیوان ٹونک کے کتب خانہ میں موجود ہے جس پر انھوں نے اپنے قلم سے اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔

اس دور کی ادبی محفلوں کی وہ بھی جان تھے۔ چنانچہ شاہجہاں پور کے ایک بے مثال شاعر جو آتش و ناسخ و گویا کی ادبی محفلوں میں دادِ سخن پاتے تھے، شاہجہاں پور سے دہلی پہنچے مگر وہاں بھی دل نہ لگا تو لکھنؤ کا رُخ کیا۔ دہلی سے چلتے چلتے کہہ اٹھے

مجھ کو غربت میں نہ صحرا، نہ چمن یاد آیا ہاں مگر جلسہ یاران وطن یاد آیا

لکھنؤ آئے تو یارانِ طریقت نہ ملے تو کہا ۔

بعد مصحفی اس میں نہیں شک حسین آتش و ناسخ بھی، گویا لکھنؤ کی جان تھے

اور پھر ایک موقع پر فرماتے ہیں ۔

زندہ در گور ہوا فرقتِ گویا میں حسین
لکھنؤ کو وہ مگر شہرِ خموشاں سمجھا

نواب غلام حسین خاں حسین آتش و ناسخ کے بعض اشعار تک پر اصلاح فرما دیتے تھے۔ آخر عمر میں روزہ نماز کی طرف واپس آ گئے تھے، کسی دوست نے کہا خاں صاحب یہ کیا؟ اس کے جواب میں انھوں نے ایک شعر کہا ۔

حسین سادہ دل نے وقت پیری وائے نادانی
لگایا دامنِ عصیاں میں دھبہ پارسائی کا

اور یہ بھی کہا ؎

عبادت سے مجھے اتنی غرض ہے عہد پیری میں
کہ وقت واپسیں رہ جائے پردہ میرے ایماں کا

غدر میں اہلِ شاہجہاں پور نے نواب صاحب کو شاہجہاں پور کا نائب ناظم اعلیٰ بنا دیا، جبکہ یہ فیصلہ باغی پلٹن یا آزادی چاہنے والوں کا تھا۔ نواب صاحب غیرت منداور شجاع تھے، عالی ہمتی، شریفانہ غیرت وحمیت، آزادی کی تڑپ دل میں موجود تھی اس لیے اس پیش کش کو قبول کرلیا۔ جب دوبارہ انگریزوں کا تسلط ہوگیا۔ شاہجہاں پور کے مجسٹریٹ نے جو پہلے بھی رہ چکا تھا اور نواب صاحب سے دوستانہ تعلقات تھے۔ اب نواب صاحب کی بینائی تقریباً نہ کے برابر تھی اور کمزوری بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ عدالت میں مجسٹریٹ نے کہا آپ کے بڑھاپے پر ترس کھا کر آپ کو بری کیا جاتا ہے۔ نواب صاحب نے کہا۔ آپ جانتے ہیں شاعر ہوں، حکم سن کر ایک شعر ذہن میں آ گیا ہے، اجازت ہو تو عرض کردوں۔

مجسٹریٹ نے کہا۔۔۔ضرور عرض کریں۔

انھوں نے شعر سنایا ؎

جنبشِ لب بھی ہوئی جنبشِ ابرو ہوکر
کام عیسیٰ کا کیا تونے ہلاکو ہوکر

نمونۂ کلام فقیر محمد گویا

تصور تھا جو وقتِ مرگ اِک لیلیٰ شمائل کا
مرے تابوت پر دھوکا ہوا مجنوں کو محمل کا

تعلق ہوں جو دامن گیر سائل کا یہ ممکن ہے
نہیں آبِ رواں کو خوف موجوں کی سلاسل کا

نہیں ہے علم جانبازی میں کچھ حاجت معلم کی
تڑپنا آپ ہی استاد ہے تعلیمِ بسمل کا

خدا کی یاد سے غافل نہ کر اس قلبِ خالی کو
کہ نورِ ذکر رونق بخش ہے اس مہرۂ گل کا

بھرا ہے جام مہر وماہ میں شربت شہادت کا　　یہ مینائے فلک شیشہ ہے اک زہر ہلاہل کا

....

ہے مضمون فتنہ انگیز اس میں تیری چال کا　　اب زمینِ شعر میں بھی خوف ہے بھونچال کا

ہے، دم گریہ جو دھیان اس نرگسِ مخمور کا　　آنسوؤں میں بھی ہے عالم خوشۂ انگور کا

موزیوں کی خانہ بربادی میں اکثر ہے بھلا　　شہد ہاتھ آیا جو گھر ویراں ہوا زنبور کا

شمع ساں سو بار کٹ کر سر مرا پیدا ہوا

بوجھ اترے پر نہ چھٹکارا ہوا مزدور کا

....

ہر رگ کو شوق تھا نشتر کا، مشتاق گلا تھا خنجر کا　　ناکام وہ ہوں مجھ سے گویا یہ بھی نہ ہوا، وہ بھی نہ ہوا

....

تھا جو افتادگی شعار اپنا　　نہ زمیں سے اُٹھا غبار اپنا

نہیں معلوم کیا صبا نے کہا　　کہ ہوا ہوگیا غبار اپنا

....

ہما کے سایہ سے بھی مرغ خائف ساں گریزاں ہوں

اندھیرا میں نے دیکھا ہے جو اکثر شامِ ہجراں کا

....

ہے زمیں پاؤں کے نیچے آسماں بالائے سر

مہرباں ہے زیرِ پا نامہرباں بالائے سر

....

زبان یار کو سمجھا تھا کیا تو موجِ مے گویا

لب ساغر لگا کہنے جو اِن لب ہائے میگوں کو

....

اشکِ خوں سے اے جنوں نسبت ہے کیا اکسیر کو

کر دیا دم میں طلائی آہنی زنجیر کو

....

اچھی نہیں شرح عاشقی کی　　　پوچھ نہ اجی کسی کے جی کی

....

تم کو خدا دکھائے بتو انقلابِ عشق　　　اپنا بھی درد کہتے پھرو دردمند سے
تو دیکھتا ہے آئینہ اور تیرے منہ کو میں　　　بہتر مری پسند ہے تیری پسند سے

....

درد، غم، اندوہ کس کس کا گزر ہوتا نہیں　　　یاالٰہی دل ہے میرا یا مسافر خانہ ہے
کیا نگاہِ مست سے ساقی نے نظارہ کیا　　　محتسب سرشار ہے، زاہد جو ہے مستانہ ہے

....

ہے وضو بہنا لہو کا، قتل ہونا ہے نماز　　　سر جھکانا زیرِ خنجر سجدۂ شکرانہ ہے

....

بھلا اے عشق یہ بھی کوئی اپنی زندگانی ہے
فغاں ہے، درد ہے، غم ہے، الم ہے، ناتوانی ہے

....

ڈھونڈتا ہوں اور نہیں ملتا ہے اپنا گھر مجھے　　　ایک دو کی یاد نے گویا کیا ششدر مجھے

....

کیوں بہنے لگی آٹھ پہر چشمِ تر ایسی　　　کیوں رہنے لگی شدتِ دردِ جگر ایسی
کیا وصف لکھوں کاکلِ رخسارِ صنم کا　　　دیکھی نہیں ہم نے کبھی شام و سحر ایسی
اس واسطے ہے ضبط کہ تا عرش نہ جل جائے　　　آجائے کہیں لب پہ نہ آہِ جگر ایسی
سن سن کے مرا حال وہ کہنے لگا گویا
دل نرم ہوا جاتا ہے باتیں نہ کر ایسی

نواب محمد احمد خاں احمدؔ

نواب محمد احمد خاں احمدؔ تعلقہ دار۔ جسمانی اعتبار سے مضبوط و خوبصورت ان کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ کلائیاں غیر معمولی چوڑی تھیں۔ آواز بھاری جس سے رعب و داب ٹپکتا تھا۔

آنکھیں بڑی خوبصورت اور چمکدار، منہ پر داڑھی، سر پر پگڑی باندھتے تھے جو پٹھان سرداروں کی علامت تھی۔ انگرکھا پہنتے تھے جو لکھنؤ کے شرفاء و امراء کا چلن تھا۔ انگرکھے کے اوپر مخملی رومال لپیٹے تھے۔ چال نپی تلی تھی، نہ بہت تیز نہ بہت دھیمی۔ بہت تیز رفتاری کو آداب شرافت کے خلاف جانتے تھے۔ وہ صرف ایک وقت دوپہر میں کھانا کھاتے تھے۔ بزرگوں سے سنا ہے جب کھاتے کھاتے کنپٹیاں درد کرنے لگتیں تو کھانا چھوڑ کر چالیس پچاس قلفے کھا لیتے تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں اطباء کے مشورہ پر ان کی شادی کردی گئی۔ مختلف عورتوں سے ان کے ایک سو تیرہ اولادیں ہوئیں۔ ان کے آخری فرزند کو میں نے بھی لڑکپن میں دیکھا تھا۔ اٹھاسی سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنے سب بیٹوں کو گاؤں اور باغات الگ الگ دیے۔ محمد اسحاق خاں اور بشیر احمد خاں سگے بھائی تھے۔ تعلقداری بڑے ہونے کے ناطے اسحاق خاں صاحب بہادر کو ملی۔ بشیر احمد خاں کو بھی باغات اور گاؤں عطا فرمائے۔ جب وہ محل سے باہر نکلتے تو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے لیے پہلے سے کرسیاں اور دوسرے لوگوں یعنی کسانوں اور رعایا کے لیے بنچیں لگوادی جاتی تھیں، کسی کو زمین پر نہیں بٹھاتے، پھر کھڑے ہو کر پہلے کسانوں اور رعایا کے پاس جاتے، اُن کی دشواریاں سنتے اور اُن کا حل نکالنے کا حکم دیتے۔ پھر عزیز رشتوں کے پاس فرداً فرداً کھڑے ہو کر ان کی خیریت اور ان کے اہل خانہ کے بارے میں دریافت کرتے، پھر دیر تک بیٹھ کر عزیز رشتہ داروں سے باتیں کرتے رہتے جو علمی و ادبی بھی ہوتیں اور گھریلو بھی۔ جب ان کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ پھر اہلِ خانہ سے

کہا۔میری طاقت جواب دے چکی ہے۔سب کو گواہ بنا کر کلمہ پڑھا اور روح پرواز کر گئی۔

ان کے دیوان کا نام "مخزن آلام" ہے جو اپنے جوان بیٹے کی موت سے غمزدہ ہو کر رکھا تھا۔انھوں نے مرزا گنج ملیح آباد میں ایک مطبع قائم کیا۔دیوان اسی میں چھپا پھر خاندان کے افراد میں تقسیم کروادیا۔

منتخب کلام

ہوا جو حمدِ الٰہی سے فیض یاب قلم
تو عرش پر بھی ہوا اس سے انتخاب قلم

سرِ دیواں بندھا سہرا جو بسم اللہ کی مد کا — ہو انجمع عروسانِ مضامین مجدّد کا
ازل سے ولولہ ہے دل میں نورِ پاک احمد کا — خدا شاہد ہے اے زاہد مرے عشقِ مخلّد کا
خدا کی ذات سے بس فرق اتنا ہے محمد کا — احد رہ جائے گر لکھا نہ جائے میم احمد کا
کر دیا کام اک نگہ میں عاشق دلگیر کا — واہ کس دھج سے اڑایا ہے نشانہ تیر کا
جس کو کہتے ہیں ہلانا عرش کی زنجیر کا — کام ہے ادنیٰ یہ اپنی آہِ پُر تاثیر کا
محتسب اچھا نہ ہوگا نسبتِ پیرِ مغاں — کوئی کلمہ بھی نکالا منہ سے گر تحقیر کا
حل نہ بے تقدیر ہوگا عقدۂ مشکل مرا — کام یہ ہرگز نہیں ہے ناخنِ تدبیر کا
آسماں پر جانتے ہیں جس کو سب تیرِ شہاب — اک شرارہ ہے یہ اپنے نالۂ شب گیر کا
دامِ خطِ سبزہ میں ہیں مرغِ دل لاکھوں اسیر — آج طوطی بولتا ہے اس بتِ بے پیر کا
تیرے رعبِ حسن سے خود عالمِ تصویر ہوں — زمزمہ کس نے سنا ہے بلبلِ تصویر کا
صبر کر بے مانگے بوسہ خال کا مل جائے گا — دانہ منہ تک اڑ کے پہنچے گا جو ہے تقدیر کا

....

مرغِ دل کے واسطے ہر بال پھندا ہو گیا — جب سے اے کافر تری زلفوں کا سودا ہو گیا

شہر پر بھی فوق اب تو لوگ اسے دینے لگے
تیرے دیوانوں سے یہ آباد صحرا ہو گیا
جوشِ وحشت میں بسر ہوتی ہے بس آرام سے
دامنِ مادر مجھے دامانِ صحرا ہو گیا

....

ہمارے بادشہِ حسن کا جو آنا ہوا
تو رشکِ قصرِ سلاطیں غریب خانہ ہوا
یہاں سے قافلۂ زیرِ زمیں روانہ ہوا
فلک کو جب کوئی بستی نئی بسانا ہوا
مقامِ خوف ہے اے دل سمجھ کے آہیں بھر
کہ بامِ چرخ نہایت ہی اب پرانا ہوا
نہ جانا کوچۂ دلدار کا مرا چھوٹا
میں اک طرف ہوا اور ایک سُو زمانہ ہوا

یقین ہے کہ بدل ڈالے گی قضا آ کر
کہ اپنا جامۂ ہستی بہت پرانا ہوا

....

دیوانہ ہوں، وحشی ہوں، کچھ ہوش نہیں تن کا
ہے نظم سے بھی اپنے اظہار سڑی پن کا
ابرو بھی چڑھائے ہوئے، مژگاں بھی صف آرا ہیں
ہم ایسے ضعیفوں پر دھاوا ہے یہ پلٹن کا
اُس قاتلِ عالم کو ہے عادتِ سفاکی
جو رو ستم و بدعت ہیں کھیل لڑکپن کا
قاتل کی طبیعت سے آگاہ ہے دل میرا
تیوری میں جو بل آیا، ماتھا مرا بس ٹھنکا

جو پوچھتا ہے مجھ سے کیا حال ہے کہتا ہوں
چھوٹا ہے امیر احمد اک شور ہے شیون کا

....

معجزہ قاتل یہ تیری ہم نے دیکھا تیغ کا
ٹانکتا ہے میرے زخمِ دل سے ڈورا تیغ کا
تیر جب تو نے لگایا اے کماں ابرو مجھے
زخم نے بوسہ لیا تیرے لبِ سوفار کا
قد کو ہے سروِ صنوبر سے ترے تشبیہہ تام
زلف پر سنبل کا عالم رخ پہ ہے گلزار کا
فشار سے جو کیا اس نے حال زار مرا
زمیں اکھاڑ کے پھینکے گی کیا مزار مرا
جو ان سے تشنگیِ وصل کی شکایت کی
تو بولے لیجئے خنجر ہے آبدار مرا

حیات میں تو رہی شکل سے مری نفرت
مرے پہ دیکھتے منہ وہ بار بار مرا

گلا وہ کاٹتے ہیں، میں گلے لگاتا ہوں
وہ ظلم ان کا، ذرا دیکھئے یہ پیار مرا

ہے عالمِ فراق سے عالم سپند کا
کیا کیجئے علاج دلِ دردمند کا

ورق پر گل کے لکھنا چاہئے احوال بلبل کا
بیاضِ دیدۂ بلبل پہ نقشہ کھینچئے گل کا

الٰہی میرے گھر کس فتنۂ محشر کی آمد ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے، عالم ہے تزلزل کا

الٰہی مجھ کو کر دے دولتِ عقبیٰ سے مستغنی
نہ میں حشمت کا جویا ہوں، نہ طالب ہوں تجمل کا

نکل آیا خط اُن کے عارض شفاف پر احمدؔ
ترقی کا گیا وقت، اب تو عالم ہے تنزل کا

....

قتل کرتا ہے مجھے عالم تری رفتار کا
اے صنم چلنا ترا چلنا ہے کیا تلوار کا

نام یوسف کا کوئی بھولے سے لیتا ہی نہیں
کیا ہی شہرہ ہے تمھاری گرمیٔ رفتار کا

یادِ میخانہ نہ مسجد میں رہے کیونکر مجھے
کب مری تسبیح میں رشتہ نہیں زنار کا

....

گلشن میں لڑائی تھیں جو اس مہر سے آنکھیں
نرگس یہی باعث ہے تری کم نظری کا

ماتھے پہ لگایا نہیں یاقوت کا ٹیکہ
سایہ تری آنکھوں پہ ہوا لال پری کا

یادِ گیسو میں اک عالم ہے پریشانی کا
جام کیا پی کے کروں بادۂ ریحانی کا

تیوریاں ان کی چڑھیں، ناز سے ہم قتل ہوئے
کاٹ ابرو میں ہے شمشیر خراسانی کا

....

اٹھائے رنج والم زیرِ آسماں کیا کیا
نہاں ہوئے مری نظروں سے نوجواں کیا کیا

ملائے خاک میں ظالم نے پہلواں کیا کیا
مٹا دیئے فلکِ پیر نے جواں کیا کیا

خزاں نے کر دیئے برباد بوستاں کیا کیا
اُجڑ گئے چمنستاں سے آشیاں کیا کیا

میں صاف طینت و ثابت قدم ہوں الفت میں
گمانِ بد ہیں تجھے مجھ سے میری جاں کیا کیا

تمھارے عشق نے رسوائے خلق ہم کو کیا　　اُٹھی ہیں ہم پہ خلائق کی اُنگلیاں کیا کیا
میں زیرِ بام کھڑا رو رہا ہوں حسرت سے　　گرا رہے ہیں وہ ہنس ہنس کے بجلیاں کیا کیا
نہ ایک قول پہ ثابت رہے کبھی صاحب　　ہمارے آپ کے پیماں تھے درمیاں کیا کیا
یہ عشقِ گیسوئے جاناں کی دیکھنا تاثیر　　اُگی ہیں قبر پہ عاشق کی کنگھیاں کیا کیا

فراق یار میں پرزے دل و جگر کے ہوئے
چلی ہیں جامۂ ہستی پہ قینچیاں کیا کیا

....

عارضِ روشن بنا ہے آستانہ زلف کا　　دیکھنا کیسا موافق ہے زمانہ زلف کا
پھیر کر منہ گیسوؤں میں رخ پہ آنا زلف کا　　کوئی کیا سمجھے یہ رمزِ عاشقانہ زلف کا

....

بگاڑا آ کے نقشہ خط نے اُن کے گورے گالوں کا　　ہوا دھاوا حلب پر دفعتاً زنگی رسالوں کا
تڑپتے ہیں، پھڑکتے ہیں، بلکتے ہیں، کسکتے ہیں　　کبھی تو حال پوچھو اپنے تم آشفتہ حالوں کا

....

میں جنوں کس دن نہ ترے ہاتھ سے نالاں رہا
آستیں پرزے رہی، ٹکڑے مرا داماں رہا

....

آمدِ فصلِ بہاری میں خزاں کا سامنا　　موت کا اور حیف میرے نوجواں کا سامنا
اے مؤذن مر گئے صبحِ شبِ وصل آج ہم　　رخصتِ دلدار اور تیری اذاں کا سامنا
موذیوں کی اور ضعیفوں کی ہے یکجائی غضب　　رات دن دانتوں سے رہتا ہے زباں کا سامنا

قدر سب کھل جائے خوبانِ جہاں کی خلق پر
ہو جو اس جانِ جہاں کا اور جہاں کا سامنا

....

اتر جائے ترا یہ خرقۂ سالوس اے زاہد
جو سایہ تجھ پہ پڑ جائے کہیں اللہ والوں کا

....

جب سے گلشن میں گزر ہونے لگا صیاد کا
آشیاں لٹنے لگا ہر بلبلِ ناشاد کا

اختلافِ عشق پر یہ دونوں باتیں ہیں دلیل
قیس کی کم ہمتی اور حوصلہ فرہاد کا

جب میں وحشی طرف کشورِ آباد آیا
سنگساری کو ہر اک طفل پری زاد آیا

ایسے ظالم پہ تو کیوں اے دل ناشاد آیا
وہ مجھے یاد رہا جس کو نہ میں یاد آیا

آیتیں دو ہوئیں اب مصحفِ رخ پر تیرے
خط ترا آیا تھا اس پر دلِ ناشاد آیا

....

جلدی سے دے مجھے کوئی پیمانہ ساقیا
لایا ہے شوق تا درِ میخانہ ساقیا

مشہور ہے ترا جو یہ میخانہ ساقیا
مستوں کے واسطے ہے شفا خانہ ساقیا

شیشوں پہ کیا بہار ہے، کیا بوتلوں پہ حسن
ہے تیری بزم یا ہے پری خانہ ساقیا

اب تو پلا کے جلد مئے معرفت کا جام
اپنا بنا لے مجھ کو بھی دیوانہ ساقیا

اک جام ہم فقیروں کو دے تیرے خم کی خیر
آباد حشر تک رہے میخانہ ساقیا

دے جام یا نہ دے یہ تجھے اختیار ہے
لیکن ہماری بزم سے تو جانہ ساقیا

....

بخت ناساز نے ہستی کے اڑائے پرزے
دل بھی اک پاس جو رکھتا ہوں تو سو قاشوں کا

....

گلگوں رخت (سے) عطر لگا ہے بدن میں آج
پھولا نہیں سماتا ہوں میں پیرہن میں آج

بوسے میں لے رہا ہوں تصور میں یار کے
سوجھی ہے دور کی مجھے دیوانہ پن میں آج

رخصت جو ہو کے ہم سے گیا ہے وہ جانِ جاں
گویا نہیں ہے روح ہمارے بدن میں آج

....

کبھی گر سامنا ہوگا رخ گل گونِ جاناں کا
توفق ہو جائے گا منہ دیکھنا صبحِ بدخشاں کا

وہ ہوں میں رندا ے واعظ، نہیں کچھ مذہب وملت
نہ قائل کفر کا سمجھو، نہ تابع مجھ کو ایماں کا

نہ ہوا تو مری خاطر سے فراموش کبھی
میں تو بھولے سے بھی تجھ کو نہ کبھی یاد آیا

شہر میں آئے تو جنگل کی ہوا سر میں بھری
لائی صحرا میں جو وحشت تو وطن یاد آیا

ثمر باغ جہاں میں یہ ملا نخلِ جوانی کا
کہ وصلِ یار حاصل ہے مزا ہے زندگانی کا

عدم سے جانبِ ہستی جو بوتراب آیا
ہوا یہ شور جہاں میں کہ آفتاب آیا

وصل کی شب وہ مجھ سے کہتے ہیں
آج تم جیتے اور ہارے ہم

ان کے دیوان کے ڈسٹ کور پر لکھا تھا جس کو ایک حلقہ بنا کر نمایاں کیا گیا تھا۔

''سخن نتائج افکار، سخن سنج، معجز بیان وعالی خاندان الادودمان
جناب محمد احمد خان صاحب بہادر تعلقہ دار وآنزیری مجسٹریٹ خلف
الرشید دستگیر افتادگان جنت مکان حضرت فقیر محمد خاں صاحب بہادر گویا
مرحوم ومغفور''

نواب محمد اسحٰق خاں

نواب محمد اسحٰق خاں بہادر تعلقہ دار تھے۔ بڑے حوصلہ منداور اپنے عزیزوں ورشتہ داروں کے ہمدرد وغم گسار تھے۔ انھوں نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں زیادہ تر اپنے غریب رشتہ داروں سے کیں اوران کو زمین وجائیداد سے نوازا۔

جوشؔ صاحب بڑے شاعر تھے۔ مگر انسانی فطرت اور کمزوریوں کا حد سے زیادہ شکار

تھے، انھوں نے اپنے والد محترم کی ادب نوازی کے لیے اور چچا کو تعلقہ ملنے کی کسک میں اپنے چچا کو جن خطابات سے نوازا ہے وہ خلاف واقعہ ہیں۔ وہ صفحہ ۳۲۳ پر یادوں کی برات میں لکھتے ہیں۔۔۔۔ ''علم وادب اور تہذیب سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔''

انھوں نے یہ بھی جھوٹ لکھا کہ وہ بے تحاشا گالیاں بکنے لگتے تھے۔ وہ غیرت مند پٹھان تھے۔ ان کے طریقے الگ تھے۔ غصہ ہونا اور غصہ کہاں کرنا اور کتنی زبان کہاں اور کب کھولنا اس دور کی تہذیبی وراثت تھی جس کے وہ بھی مالک تھے۔

ملیح آباد کے دس میل کے فاصلہ پر مال نام کا علاقہ ہے جو راجپوتوں کا گڑھ ہے، وہاں کے ٹھاکروں سے پٹھانوں کے برادرانہ تعلقات تھے، مگر بشیر احمد خاں جوان کے چھوٹے بھائی تھے ایک ٹھاکر صاحب ان کے گروہ میں رہتے ہوئے کچھ حدوں کے باہر چلے گئے، یہ بات اسحٰق خاں صاحب کو ناگوار ہوئی اور حکم دیا کہ بشیر سے کہہ دو یہ شخص ملیح آباد میں داخل نہیں ہوگا۔ حکم پر عمل ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد ان ہی ٹھاکر صاحب کی بیٹی کی بارات تھی، لڑکے والوں کو واپسی میں ملیح آباد سے گزرنا تھا۔ کسی نے اسحٰق خاں کو اطلاع دی کہ آپ کے حریف ٹھاکر کی لڑکی رُخصت ہو کر آپ کے علاقہ سے جارہی ہے۔

سپاہیوں کو حکم دیا۔۔۔ جاؤ بارات روک لو!

بارات روک لی گئی۔ دولھا کے باپ کو طلب کیا گیا اور کہا کہ آپ ہمارے تین دن مہمان رہیں گے۔ میری بیٹی کو خالی ہاتھ میری بستی سے لے کر نہیں جاسکتے۔ ادھر ایک باراتی بھاگ کر مال پہنچا اور اس نے ٹھاکر سے کہا۔ اسحٰق خاں کے سپاہیوں نے بارات روک لی ہے۔ ٹھاکر نے کہا۔۔۔ جاؤ اسحٰق خاں مرد انسان ہے اور شریف پٹھان۔

اسحٰق خاں نے بازار کے سب حلوائی بلوائے اور حکم دیا یہ پوری بارات تین دن کھانا

کھائے گی، کوئی کمی نہ رہے اور میرے سمدھیانے والوں کو شکایت نہ ہو۔ تیسرے دن بیٹی کے پاس گئے، سر پر ہاتھ رکھا اور کہا تیرے باپ سے میری ناراضگی ہے مگر تو اور تیری سسرال والے کیا کہتے کہ چچا کی زمین سے خالی ہاتھ چلی گئی اور زیورات کا ایک صندوقچہ دیا اور بارات کو رُخصت کر دیا۔ جب بارات رُخصت ہو گئی تو ٹھاکر صاحب شرمسار ہو کر آئے اور اسحٰق خاں کے پیروں کی طرف جھکے مگر انھوں نے گرجدار آواز میں کہا۔ خبردار۔ ٹھکرائی کو بٹہ نہ لگانا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ ٹھاکر نے رو کر کہا۔ خان صاحب ایسا شریفانہ انتقام آپ نے لے کر ہمیشہ کے لیے میرا سر جھکا دیا۔ اسحٰق خاں نے جواب دیا۔ ٹھاکر وہ میری بھتیجی تھی۔ کیا بشیر سے میری ناراضگی کا عتاب اس کے بچوں پر نازل ہوگا؟ کبھی نہیں! کبھی نہیں!

دوسرا واقعہ۔ ہر عید کے موقع پر اسحٰق خاں بشیر احمد خاں کی بیوی یعنی اپنی بھاوج کو ایک خوان میں عیدی رکھ کر بھیجتے تھے۔ لیکن عید سے چند روز پہلے دونوں کے سپاہیوں میں زوردار لٹھ بازی ہو چکی تھی مگر عید کے دن جب عیدی کا خوان پہنچا تو بھاوج نے واپس کر دیا اور عید کا سلام کرنے بھی نہیں گئیں۔

جب بشیر احمد خاں آئے تو بیوی نے کہا۔ باوا جان نے عیدی بھیجی تھی، میں نے واپس کر دی اور میں عید کا سلام کرنے بھی نہیں گئی۔

بشیر احمد خاں نے بگڑ کر کہا۔ اچھا تو ہم بھائیوں کے معاملات میں آپ بھی فریق بنیں گی۔ فوراً جائیے، سلام کیجیے اور وہ خوان اپنے سر پر رکھ کر لائیے۔

وہ گئیں۔ باوا جان کی خدمت میں سلام پیش کیا اور انھوں نے دُعائیں دیں اور کہا۔ شاید تم موجود نہیں تھیں اسی لیے عیدی کا خوان واپس آ گیا۔ پھر ملازمہ کو آواز دی کہ جاؤ یہ خوان پہنچا کر آؤ۔ بھاوج نے کہا۔ یہ تو سزا کے طور پر اپنے سر پر رکھ کر لے جاؤں گی۔ انھوں نے کہا۔ ہماری تہذیب میں بہو کی غلطی پر اُسے ذلیل نہیں کیا جاتا۔

جوشؔ صاحب اور اُن کے اوسان پر ہمیشہ دو چیزیں سوار رہیں۔ ایک عورت، دوسرے قندھاری۔ حالانکہ اُن کی دو سگی بہنوں کے شوہر قندھاری تھے۔ اُن کے چچا محمد اسحٰق کے داماد عبدالمجید خاں قندھاری رئیس علو پور چھ گاؤں کے زمیندار تھے۔ اسحٰق خاں نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی ان سے کی۔ پہلی بیٹی جلد ہی بیمار ہو کر لاولد مرگئی تو دوسری بیٹی کا نکاح ان سے کر دیا۔ اس لیے کہ اس دور کی تہذیب و شرافت کے وہ اعلیٰ نمونہ تھے۔

محمد اسحٰق خاں کے نواسہ عبدالحمید خاں کے بیٹے نے ہی اپنے اخبار ہند میں جوشؔ کو ''شاعرِ انقلاب'' کے لقب سے نوازا۔ میرے بڑے بھائی مائلؔ ملیح آبادی کا ایک ناول پڑھ کر اور ان کی ایک نظم سن کر بھی انھوں نے میرے بھائی سے تعجب سے پوچھا۔ کیا قندھاریوں میں بھی شعر و ادب کا ذوق ہوتا ہے۔''

یہ خاندانی کثافت وہ بلا ہے جس کو علم کا شفاف پانی بھی دھو نہیں سکا۔ یادوں کی برات صفحہ ۳۱۶ پر لکھتے ہیں کہ آفریدیوں اور قندھاریوں میں شاہی دور میں ہمیشہ تلوار چلتی رہی۔ فقیر محمد خاں جب اودھ آئے تو قندھاری بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ انھوں نے ان کی آمد کو اپنی قوت بازو جانا مگر جوشؔ صاحب آگے جو بیان فرماتے ہیں وہ بالکل جھوٹ، وقت اور زمانہ کے لحاظ سے بھی خلاف واقعہ ہے۔ ایک صاحب عبدالرحمٰن خاں تھے جو میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ انھیں آتے جاتے دیکھ کر مجھ کو اس بات پر تعجب ہوا کرتا تھا کہ قندھاریوں اور آفریدیوں کے درمیان تو ایک مدت سے عداوت چلی آرہی ہے پھر وہ میرے باپ سے ملنے کیوں آتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ تعجب اور پشیمانی آمیز افسوس اس بات پر ہوتا تھا کہ عبدالرحمٰن خاں آتے ہیں تو میرے باپ کی آنکھیں کیوں جھک جاتی ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھا کرتا تھا کہ میرے باپ شاید عبدالرحمٰن خاں سے ڈرتے ہیں جب ہی تو ان کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا۔ میاں آپ

عبدالرحمٰن خاں سے آنکھیں کیوں نہیں ملاتے۔ انھوں نے میرا یہ سوال سن کر پہلے تو ادھر ادھر دیکھا اور مجھ کو اپنے قریب بٹھا کر فرمایا۔ بیٹا عبدالرحمٰن خاں ایک زمانہ میں رئیس تھے۔ اب ان کے پاس کچھ نہیں رہا ہے۔ اس لیے میں ان کو وظیفہ دیتا ہوں اور بیٹا شریفوں کی یہ آن ہے کہ جس کو وظیفہ دیتے ہیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ کہیں شرمندہ نہ ہو جائے۔ پھر انھوں نے فرمایا۔ دیکھو بیٹا میرے سر کی قسم یہ بات کبھی زبان پر نہ لانا مگر جوشؔ صاحب نے قندھاریوں کے اوسان پر سوار ترنگ میں باپ کے سر کی قسم توڑ کر اسے ضبط تحریر میں لا کر تاریخ بنادیا، وہ یہ بھول گئے کہ تاریخ اودھ کا علم رکھنے والے اسے جھوٹ اور زیب داستان سے زیادہ وقعت نہ دیں گے۔ اسی طرح زیب داستاں کے بہت سے واقعات اس کتاب میں ملیں گے جن کی حیثیت چٹکلے سے زیادہ نہیں۔

عبدالرحمٰن خاں قندھاری ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ کے افغانستان پر حملہ کے وقت اپنے قبیلہ کے ساتھ نکلے جو قندھار وقلات پر حکمراں تھا اور شجاع الدولہ کے زمانہ میں فیض آباد آئے۔ شجاع الدولہ نے ان کی پذیرائی کی اور فیض آباد کے جس علاقہ میں وہ رہے وہ جگہ قندھاری بازار کہلانے لگی۔ ۱۷۶۴ء کی بکسر کی لڑائی میں وہ شجاع الدولہ کے ساتھ تھے۔

آصف الدولہ نے لکھنؤ کو راجدھانی بنایا تو لکھنؤ آگئے اور لکھنؤ میں لال باغ سے پان دریبہ، منصور نگر اور آسیہ مئو تک کے علاقہ میں آباد ہو گئے یہاں بھی یہ جگہ قندھاری بازار کہلائی۔ آسیہ مئو میں عبدالرحمٰن خاں کی قبر ہے۔

چچا کے بارے میں تو انھوں نے لکھا ہی کہ علم وتہذیب سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا مگر اپنے باپ کو بھی نہ چھوڑا۔ صفحہ ۳۱۵ یادوں کی برات میں ہی فرماتے ہیں کہ ایک روز میں اور میرے بڑے بھائی دونوں احسن مارہروی کے لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہل رہے تھے۔ یہ خبر کسی نے میرے باپ کو پہنچادی تو انھوں نے بلا کر پوچھا کہ کیا تم دونوں احسن صاحب کے لڑکے کے

ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہل رہے تھے۔ ہم نے اقرار کرلیا تو ہم دونوں کے ہاتھوں پر اپنے حقہ کی چلم کی دہکتی آگ انڈیل دی۔ ہمارے ہاتھوں میں بڑے بڑے آبلے پڑ گئے۔ یہ سب باتیں چٹکلے اور زیب داستاں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ پٹھان باپ ایسے شقی القلب کبھی نہ تھے۔

اسی طرح اسحٰق خاں کے بارے میں اپنی ماں کا ذکر کر کے اپنی ملازماؤں اور شریک حیات کے سینہ پر گھٹنا رکھ کر ان کی گردن کاٹنا اور ان کی ماں کا اسحٰق خاں کی پیٹھ پر چھری مار کر بہو کو بچانا سب جھوٹے قصے اور خاندانی کدورت کے اعلیٰ مظاہر ہیں۔

جوشؔ صاحب نے ایک شعر نقل کیا ہے کہ انھوں نے سنایا (یعنی اسحٰق خاں نے) اور پوچھا کیسا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شعر ان ہی کا ہے۔

سب کے سرتاج بعد پیغمبر　　　یعنی ابو بکر، افضل و برتر

ایک شعر اور ان کے نام سے منسوب ہے۔

مسیحائی کرے گا کون اب اسحٰق عالم میں　　　درِ جاناں پہ سنتے ہیں کہ عیسیٰ خود سسکتے ہیں

اسحٰق خاں پر تفصیلی بیان کا سبب یہ ہے کہ جائیداد اور تعلقہ داری کی رقابت کے سبب جوشؔ صاحب نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ وہ افغانی غیرت وحمیت کے تاجدار تھے۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی دلداری کا ان میں جو ملکہ تھا اگر وہ صوبۂ سرحد یا افغانستان میں ہوتے تو علاقہ کے تمام قبائل ان کو اپنا سردار بنا لیتے۔ انھیں اپنی بیٹیوں اور ان کی اولاد سے بے پناہ محبت تھی۔ بیٹیاں بیٹوں سے بڑی تھیں لہٰذا ناتی اور نواسیں سب رات کے کھانے پر اُن کے ساتھ بیٹھتے، پہلے اُن کے پیالے بھرے جاتے۔ ایک بار خاں صاحب کے پیالہ میں کچھ نہیں آیا تو بیوی نے کہا اور آپ؟ انھوں نے مسکرا کر یہ سب میرے ہی پیٹ میں جائے گا۔ تم پریشان کیوں ہو۔ سب بیٹیوں کے گھر قریب ہی تھے لہٰذا جب کوئی خاص چیز پکتی تو حکم تھا کہ اتنی مقدار

میں پکائی جائے کہ ہر بیٹی کے گھر ایک بڑا پیالہ پہنچ جائے۔ جب سب کے یہاں پیالے پہنچ جاتے تب نوالہ توڑتے تھے۔

ان کی پیٹھ میں کاربنکل یا سرطان کا پھوڑا نکل آیا جس کا آپریشن ہونا تھا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر انصاری کوئی مشہور سرجن تھے۔ انھوں نے کہا کہ خاں صاحب آپ کو بے ہوشی لینا ہوگی۔

انھوں نے کہا۔ پٹھان مرتا ہے بے ہوش نہیں ہوتا۔ آپ اپنا کام کریں اور بتائیں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ آپریشن کے وقت ہلکی سی بھی جنبش نہ ہو۔

خان صاحب نے حکم دیا۔ حقہ لاؤ۔ حقہ آ گیا۔ وہ آگے ایک کرسی لگا کر تخت پر ذرا سا آگے کو جھک گئے اور حقہ پیتے رہے اس دوران دو تین چلم بدلی گئیں جب ڈاکٹر نے پٹی باندھ دی اور کہا خاں صاحب اب آپ لیٹ جائیں تو وہ کھڑے ہو گئے۔

ڈاکٹر انصاری نے کہا۔ خدا کے واسطے مجھ پر رحم کریں اور لیٹ جائیں ورنہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ واقعی آپ کی قوت برداشت کا کوئی جواب نہیں ہے۔

ان کی بہادری، دلیری، غیرت مندی، عزیزوں و رشتہ داروں کی دلدہی کے پچاسوں واقعات آج بھی ملیح آباد کے عمر رسیدہ ان رشتہ داروں اور دوسروں کی زبانوں پر ہیں جنھوں نے اپنے بزرگوں سے سنے ہیں۔

نثار احمد خاں ولد محمد احمد خاں بہادر تعلقدار مرزا گنج، ملیح آباد

نہ تھی یہ تجھ سے توقع کہ یار تو ہو کر	مرے ہی دل میں رہے گا مرا عدو ہو کر
کسی کی دید کی حسرت نہ دل سے نکلی ہائے	جو نکلی بھی تو مری آنکھ سے لہو ہو کر

---

[۱] تذکرہ جوہر فرد

جنوں کی دست درازی کی بھی کوئی حد ہے — ہزار بار گریباں پھٹا رفو ہو کر

حیا سے ان کی شب وصل ہم کو حیرت ہے — کہ شکل آئینہ بیٹھے ہیں روبرو ہو کر

شب وصال لڑائی بڑے مزے کی رہی — ہمارے یار کے کچھ اور گفتگو ہو کر

ہماری آنکھوں میں پتلی کی طرح پھرتے ہیں — ہمارے دل میں وہ رہتے ہیں آرزو ہو کر

وہاں ہر بن مو دا ہے وصف میں تیرے — سما گیا مرے قالب میں روح تو ہو کر

مزے کی باتیں کرو میٹھی وصل کی شب — جواب تلخ نہ دو ہم کو ترش رو ہو کر

ترے فراق میں ساقی اگر کبھی پی ہو — حرام مجھ پہ مئے سُرخ ہو لہو ہو کر

مشتاق سخن ہے اک سخن داں — اے جودت طبع دے اتنی

قابل ہے سخن شناس و شاعر — مل جائے گی داد شاعری کی

بستانِ سخن کی سیر کر کے — دامن میں بھرو گل معانی

وہ مدح کرو کہ محو ہو جائے — تصویر کی طرح روح سعدی

لاریب کہ موجدِ سخن ہے — ہے عہد کا اپنے وہ نظامی

آخر ہے وہ کون نہ کچھ بیاں کر — معلوم ہو اس کا نامِ نامی

حرف سرِ شعر غور کر لو — ہو جائے عیاں یہ راز مخفی

مداح ہیں سب نثار تیرے — کیا خوب لکھے سنین ہجری

دیوان جو محو کا ہے بے مثل[۱]

تاریخ بھی لاجواب لکھ دی

بشیر احمد خاں بشیرؔ

بشیر احمد خاں بشیر حسین وجمیل آدمی تھے۔ وہ اپنی اولاد سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تربیت کے معاملہ میں سخت تھے۔ اپنی ماں کی اس نصیحت پر سختی سے عمل کرتے تھے کہ بیٹا بچوں کو کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ سے۔ علم وادبیات کے شائق تھے۔ ان کے یہاں شاعروں کی محفلیں جمتی تھیں، لکھنؤ کے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ تاریخ اسلام سے گہری واقفیت تھی۔ فردوسی، سعدی، حافظ، نظیری اور قاآنی کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور ان کے بے شمار اشعار زبان پر تھے۔ شاعری میں مرزا داغؔ سے پہلے اصلاح لی اس کے بعد امیر مینائی اور جلالؔ لکھنوی کو کلام دکھایا اور استفادہ کیا۔ وہ لکھنؤ کی غالبؔ پرست معیار پارٹی کے ممبر تھے مگر میرؔ کو غالبؔ سے بڑا شاعر جانتے تھے۔

مسلک کے اعتبار سے اپنے بڑے بھائی اسحٰق خاں ہی کی طرح کٹر سنی حنفی تھے لیکن اہلِ بیت کی محبت کو ایمان کا جزو جانتے تھے۔ یہ بھی پٹھانوں کی خصوصیت تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جہاں جہاں پٹھانوں کی بستیاں ملیں گی وہ بارہ بستی کے نام سے موسوم ہیں۔ بارہ اماموں کی مناسبت کے ساتھ ہی سادات سے محبت وعقیدت بھی ان کی فطرت ثانیہ رہی ہے۔ وہ لکھنؤ کی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ علم وفضل سے وابستگی، شاعری سے لگاؤ اور رقتِ قلب کے باوجود اپنی پٹھان روایات کی غیرت مندی اور بقا وتحفظ کا پورا خیال رکھتے تھے۔ وہ سیکڑوں بیواؤں، یتیموں، ضعیفوں اور بے سہارا لوگوں کو باقاعدہ وظیفہ دیا کرتے تھے۔ اسلامی تہذیب کا اس معاملہ میں اتنا اثر تھا کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ ان میں وہ لوگ بھی ہوتے تھے جو کبھی مخالف تھے مگر حالات نے ان کی کمر جھکا دی تھی اور اب حاجت مند تھے۔

بشیر احمد خاں بشیر کبھی کبھی غزل کہہ لیتے تھے مگر باقاعدہ دیوان کی شکل نہ دی۔ غزلیں

بس کاغذ پر لکھ کر کسی بزمِ مشاعرہ میں پڑھ کر اِدھر اُدھر ڈال دی جاتی تھیں، باقاعدہ بیاض بھی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا زیادہ تر کلام اِدھر اُدھر تلف ہوگیا۔ ان کو زبان کی صحت، لہجے کی نجابت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ گھر میں کوئی غلط تلفظ کرتا تو وہ ٹوک دیا کرتے تھے، ان کے بڑے بیٹے شفیع احمد خاں ولؔی نے کچھ غزلیں جمع کر کے کلام بشؔیر کے نام سے چھپوادی تھیں۔ چند اشعار ان کے بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ۔

کوئی گریاں قریب تربت ہے
زندگی پھر تری ضرورت ہے

آمادہ ہو جو سوزِ نہاں کے بیان پر
انگارہ خود اٹھا کے میں رکھ لوں زبان پر

چھوڑو خدا ہی پر کہ وہاں ہوگا فیصلہ
میرے بیان پر، نہ تمھارے بیان پر

اب تم بھی مہرباں ہو تو جی خوش نہ ہو سکے
دل مر گیا، کچھ ایسی بلا آئی جان پر

جگنوؤں کا وہ چمکنا کبھی ویرانوں میں
وہ غریبوں کے مزاروں پہ چراغاں ہونا

دل ہی دل میں مرے رونے پہ وہ ہنسنا ان کا
اثرِ ضبط وہ چہرہ سے نمایاں ہونا

یہ رشک کے صدمے کبھی کہہ نہیں سکتا
جنت بھی ترا گھر ہو تو میں رہ نہیں سکتا

سمجھو تو اسی پردہ میں کہہ جاتا ہے سب کچھ
جو تم سے یہ کہتا ہے، میں کچھ کہہ نہیں سکتا

دم ان کے سامنے نکلے دعا یہ مانگوں گا
ذرا مجھے مرے احباب قبلہ رو کرتے

برا ہو دل کا یہ کمبخت آہ کر بیٹھا
قریب تھا کہ وہ کچھ مجھ سے گفتگو کرتے

محمد مرتضٰی خاں وصؔل

محمد مرتضٰی خاں وصؔل ولد محمد عباس خاں، افغان علی خیؔل رمضان المبارک ۱۲۴۱ھ میں پیدا ہوئے۔ پرانے طریقہ پر عربی و فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔

حسام الدولہ نواب فقیر مخدوم خاں گؔویا کے حقیقی بھانجے۔ ۱۲۶۱ھ میں والد کا انتقال ہوا

تو لکھنؤ میں شاہی فوج کے کمانڈار مقرر ہوئے۔ گیارہ سو جوان اُن کی ماتحتی میں تھے۔ انگریزی حکمرانی کے ابتدائی عہد میں قصبہ کاکوری کی تحصیلداری کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۲۰ر شعبان بروز چہار شنبہ ۱۳۲۱ھ کو انتقال ہوا۔ اپنے پائیں باغ میں دفن ہوئے۔ وہ نہایت خلیق، باوضع، بامروت، سنجیدہ اور متین شخصیت کے مالک تھے۔ ہر شخص سے شفقت اور پیار سے ملتے۔ قصبہ میں اُن کی ذات غنیمت تھی۔ خانگی جھگڑوں میں اکثر وہی حکم کے فرائض انجام دیتے۔ نہایت عمدگی، انصاف اور خوش اسلوبی سے سب کو مطمئن کر دیتے تھے۔

محمد مرتضٰی خاں وصلؔ مولوی عبدالولی فرنگی محلی کے مرید تھے۔ شاعری میں آفتاب الدولہ قلقؔ لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ اُن کا دیوان ۱۳۱۳ھ میں مطبع مظہر العلوم لکھنؤ سے چھپا جس کا تاریخی نام ''ساغر مے'' ہے۔ وصلؔ تخلص ہے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ وصلؔ نے اپنا دیوان دوستوں اور شائقین میں بلا قیمت تقسیم کروادیا۔ خاندانی املاک اور جائیداد سے اچھی آمدنی تھی۔ جس وضع اور طریقہ پر انھوں نے زندگی بسر کی وہ واقعی قابلِ تقلید ہے۔ نمونۂ کلام:

ایک لفظ کن کے فرماتے ہی سب کچھ ہوگیا ۔۔۔ ماجرا یہ ہے سرائے دہر کی تعمیر کا

....

دیکھ کر عکسِ رخِ پر نور، حسنِ بے مثال
آئینہ تو اک طرف وہ خود ہی حیراں ہوگیا

....

عرضِ مطلب جو کیا میں نے مکرر تو کہا ۔۔۔ کہہ چکے تم کو جو کہنا تھا اب اصرار یہ کیا
خالی چمن گلوں سے عنادل خموش ہیں ۔۔۔ رنگِ بہار بادِ خزاں سے ہوا ہوا

....

جانے سے اپنے ہم کو نہ ہر دم ڈرائیں آپ
ہوگا قلق تو ہونے دو بہتر ہے جائیں آپ
جن سے ہمارے کان کبھی آشنا نہ تھے
قدرت خدا کی وہ ہمیں باتیں سنائیں آپ

کہتی ہے خلق دیکھ کے اُس شوخ کا مزاج
صورت میں مثلِ حور ہے لیکن برا مزاج
کھویا اگر شباب تو پیری میں اب سنبھل
سویا بہت جو رات تو ہوشیار صبح کو

....

گر خاک بھی چھانی تو ترے کوچے کی ہم نے
کچھ صورتِ مجنوں پھرے بن بن تو نہیں ہم

....

وعدہ ہم سے کرو اور غیر سے ایفا اس کا
روحِ انساں کو یہی صدمے گھٹا دیتے ہیں
نہیں جانتے وہ محبت کی قدر
یہ نادانی ان کی لڑکپن سے ہے
نہیں جانتے وصلؔ اس بت کی خو
محبت کی امید رہزن سے ہے

....

مشغلہ وحشت میں تھا جب تک کہ فن میں تھا لباس
میری عریانی سے اب دستِ جنوں بیکار ہے

....

درکار گر تجھے ہے حاضر ہے جان اے بت
ایماں تو نہ دیں گے گو دل ہزار آئے
غضب ہیں رنج رساں لوگ اس زمانے میں
یہ غول بن کے ستائیں جو کوئی بن میں رہے

....

یہ دابِ صحبت اربابِ وضع ہے اے وصلؔ
لحاظِ خاطرِ احباب ہر سخن میں رہے
ہوتے مرے غیروں پر بیداد گری کیوں ہے
یہ تازہ ستم مجھ پر اے رشکِ پری کیوں ہے
اے وصل محبت میں اپنے کو مٹایا تو
عنقا کی طرح لیکن یہ ناموری کیوں ہے

....

غلام مصطفیٰ خاں ولد عبدالجبار خاں

غلام مصطفیٰ خاں ولد عبدالجبار خاں۔محمد احمد خاں کے پوتے۔ابتدائی تعلیم قدیم طریقہ پر ہوئی۔عربی بقدر ضرورت اور فارسی کی اچھی لیاقت تھی۔اپنی ذکاوت اور معاملہ فہمی سے بالیاقت اور قابلِ قدر رئیس تسلیم کر لیے گئے۔دادی کی بہن فاطمہ بیگم جن کو اپنے بھائی محمد خاں سے جاگیر و علاقہ ملا تھا اسی پر وہ اور چھوٹے بھائی نذر محمد خاں قابض تھے اس لیے کہ بیگم مرحومہ لاولد تھیں۔

جائیداد کے مقدمات اور قانونی معاملہ کو غلام مصطفیٰ خاں دیکھتے تھے۔مالی انتظام اور تحصیل وصول وغیرہ کا کام اپنے چھوٹے بھائی نذر محمد خاں کے سپرد کر رکھا تھا۔اس تقسیم کار سے دونوں میں محبت و یکجہتی اور خاندانی وجاہت و ذاتی لیاقت کا ذکر ہر طرف رہتا تھا۔اُن کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا اور جودت طبع کا کوئی جواب نہ تھا۔عمر نے وفا نہ کی۔بتیس سال کی عمر میں رمضان المبارک کی ۱۴ تاریخ ۱۳۲۴ھ ہجری کو مالک حقیقی سے جا ملے۔اعلیٰ اخلاق اور ملنساری کے لیے قصبہ میں بھی شہرت تھی۔روزہ نماز کے پابند اور ہزاروں کی حاجت روائی کرتے رہتے تھے۔نہایت ذی فہم اور جائیداد و تعلقہ کے معاملات میں بڑے مدبر تھے۔شاعری سے خاصا لگاؤ تھا جو وصفِ خاندانی تھا۔فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔پیارے صاحب رشید لکھنوی کے شاگرد تھے۔یہ میر انیسؔ کے نواسہ تھے۔اس وقت کے رسائل میں کلام چھپتا تھا۔ جیسے پیامِ یار لکھنؤ۔ارمغانِ شاہجہاں پور حدیقہ حامدی رام پور، نسیم دکن حیدرآباد، معیار لکھنؤ۔ دیوان میں مختلف اصناف شاعری کے نمونے ہیں۔۱۳۲۵ھ میں سید محمد علی عرش ملیح آبادی نے اسے ترتیب دیا تھا، استاد شاعروں کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔

انتخاب کلام ؎

ہر سمت تو ہی تو ہے ہر جا ظہور تیرا　　آنکھوں میں نور تیرا، دل میں سرور تیرا

ہم کو تو کوئے دلبر جنت سے بھی ہے بڑھ کر
واعظ سنا بیانِ حور و قصور تیرا

دل مبتلا ہے آپ کی چشمِ سیاہ کا
مشتاق میں ہوں لطف بھری اک نگاہ کا

جائیں گے صبح ہوتے ہی یہ کیا سنا دیا
تم نے تو وصل میں بھی مرا دل ہلا دیا

کھینچی جو ہم نے آہِ شرر بار ہجر میں
آئی ندا فلک سے کہ مجھ کو جلا دیا

تو بہ کیا عہد وفا سے میں نکل جاؤں گا
میں بھی کیا تیری نظر ہوں کہ بدل جاؤں گا

ستم سیکھے ہیں تم نے کس لیے آرامِ جاں ہو کر
تماشا ہے کہ ظالم بن گئے ہو مہرباں ہو کر

بیکار کا یہ قصہ اے رشک پری کیوں ہے
یہ ظلم و جفا کیونکر، بیداد گری کیوں ہے

اب خوں نہیں اصلاً دل خشک ہوا کب کا
پھر مضطر و حیراں ہوں، آنکھوں میں تری کیوں ہے

جب شرم سوا بھی ہے اس شوخ پری وش کو
پھر ترچھی نگاہوں سے جادو نظری کیوں ہے

نہ توڑو شیشۂ دل اے بتو اللہ کا گھر ہے
یہ آئینہ نہیں جس کو بنایا ہے سکندر نے

جو آئے وہ، کہا میں نے کدھر آئے تو یوں بولے
جفا جو ہیں، ستم گر ہیں، ہم آئے ہیں ستم کرنے

کیوں میرے دل بڑھانے کی کرتے ہیں فکر آپ
میں دیکھ لوں گا آیئے خنجر نکال کر

انکار ہے جو وصل سے تو دو مجھے چھری
ارماں تمھارے پھینک دوں دل سے نکال کر

لڑکپن ان کا جاتا ہے، جوانی آئی جاتی ہے
نگاہِ ناز کی بانکی ادا سکھلائی جاتی ہے

مولوی محمد ابراہیم خاں

مولوی محمد ابراہیم ملیح آباد میں پیدا ہوئے اور عربی و فارسی کی تعلیم پائی۔ ملیح آباد کے قصباتی مدرسے میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے جہاں نہایت ہی نیک نامی سے انھوں نے ملازمت کی، اب ۱۵ روپے ماہانہ وظیفہ پاتے ہیں۔ صوفیانہ طرز و روش ہے، اور درویش صفت ہیں، مگر

دعا، تعویذ اور گنڈے وغیرہ سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں جس کی وجہ سے قصبے میں شہرت خاص ہے اور اکثر حضرات معتقد ہیں۔ مؤلف کتاب ھٰذا کو بھی خصوصیت ہے۔

کبھی کبھی شعر کہتے ہیں، اور عاجزؔ تخلص ہے۔ باوجود تلاش نظم کا حصہ دستیاب نہ ہوسکا۔ ہم نے مولوی صاحب موصوف سے باصرار لینا چاہا مگر انھوں نے بوجہ انکسار نظم کے دینے سے انکار کیا اور فرمایا کہ میرا نام ہرگز تاریخ میں نہ لکھنا، علاوہ اس کے اس تاریخ کو بھی ایک فعل عبث اور لغو قرار دیا جس کی وجہ سے ہمارے شوق اور استقلال میں گونہ فرق پڑا۔ ہم کو اس علمی بخل کا از حد رنج ہے اور یہ وہی اسباب تباہی کے ہیں، جن کی بنیاد پر اس تاریخ کے لکھنے پر قلم اٹھایا گیا۔ اور ہمدرد قوم رو رہے ہیں۔

محوؔ کاکوروی کے دیوان میں اور وصلؔ بلیح آبادی کے دیوان میں اُن کی تاریخیں لکھی ہوئی تھیں، ہم نے ان کو ہی غنیمت سمجھا اور بطور یادگار درج کرتے ہیں۔

اے محوؔ ترے سخن کی کیا بات	ہے بات میں بات ہی کرامات
پڑھئے تو یہ نور کے مضامیں	کردیں وہیں دن اگرچہ ہو رات
آئے مرے پاس صبح ہوتے	جبریل امیں پئے ملاقات
میں محوؔ کا دیکھتا تھا دیواں	چھپ کر جو ملا تھا مجھ کو سوغات
لے کر عاجزؔ سے پڑھ کے بولے	جادو ہے یہ نسخہ یا طلسمات (۱۳۱۰)

دیکھا تو یہ لاجواب مصرع
تاریخ کا کر رہا ہے اثبات

حضرت محوؔ کی ہے سب سے نرالی ایجاد	ہے نیا آپ کا انداز سخن صلِّ علیٰ
وہ غزل کون سی ہے جس میں نہیں پاتا ہوں	شوخی یار کا بیساختہ پن صلِّ علیٰ
نورِ مضمون سے ہر اک نقطہ ہے ایسا روشن	جو ستاروں میں لگاتا ہے گہن صلِّ علیٰ

صورتِ فاختہ شیدا ہوں نہ کیونکر شاعر
مصرعِ تر ہے ہر اک سروِ چمن صلِّ علیٰ

رشتہ نظم میں کیا خوب پروئے موتی
جس سے بے آب ہوئے دُرِّ عدن صلِّ علیٰ

دائرہ دائرہ خورشید کا ہمتاب ہوا
کششیں ہوگئیں سورج کی کرن صلِّ علیٰ

نافۂ آہوئے تاتار ہے قربان دوات
ہے سیاہی پہ فدا مشکِ ختن صلِّ علیٰ

ہر الف نورِ مضامین سے ہے شمع روشن
اور ہر دائرہ ہے رشکِ لگن صلِّ علیٰ

نفسِ پاک نے اردو میں نئی پھونکی روح
ہاں اسے کہتے ہیں اعجازِ سخن صلِّ علیٰ

لکھے یوں مصرعِ تاریخ مسیحی عاجزؔ
حضرتِ محوؔ کا دیواں ہے چمن صلِّ علیٰ

دیگر

کیا لکھا رشکِ چمن دیواں جنابِ وصلؔ نے
ہر زمیں میں گل کھلے ہیں اے خوشا بستانِ وصلؔ
مصرعِ تاریخ بھی عاجزؔ نے کیا رنگیں لکھا
گلشنِ تازہ بہارِ کامِ دل دیوانِ وصل

امیرؔ ملیح آبادی ولد محمد احمد خاں

(پیدائش ۱۲۷۵ھ ملیح آباد)

عربی، فارسی، اُردو اور مروجہ علوم کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ اس زمانہ میں زمینداری کا کام ملازم کرتے تھے جن میں ضلع دار اور اس کی مدد کے لیے گرُیتے ہوتے تھے۔ زمین دار رعایا کا درد دُکھ سنتا تھا۔ باپ کی زندگی میں ہی انتیس سال کی عمر میں امیرؔ کا انتقال ہوگیا۔ ۱۳۰۷ھ میں طاعون کا مرض حملہ آور ہوا اور امیر کی زندگی اور اہلِ خانہ کا چراغ گل کر گیا۔ امیر کے والد محمد

احمد خاں برسوں ان کے غم میں روتے اور راتوں میں آہ وزاری کرتے رہے۔ شاعری میں امیر باپ ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ یہ ملکہ خداداد اور وصفِ خاندانی تھا۔ باپ کے استاذ ہونے کا اقرار اور یکتائے زمانہ اور استادوں کے استاد ہونے کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

ہیں فن شعر میں یکتائے زمانہ یہ امیر
شیخ ناسخ ہوئے احمد مرے استاد ہوئے

غزل کی عمر تھی اور زمانہ کی تہذیب بھی غزل کی تھی۔ غزل کے علاوہ تضمین بھی ہیں۔ یہ اس زمانہ کا رواج اور یکتائی کا معیار تھا۔ کلام میں پختگی ہے۔ برجستگی اور سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ دیوان کا نام "گلشن خزاں" رکھا گیا۔ باپ نے اپنی نگرانی میں ۱۸۹۰ء میں مرتب کروا کر زیر اہتمام مصاحب علی مطبع نامی گلشنِ محمدی واقع مرزا گنج (ملیح آباد) میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔

دیوان کا سائز $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$ ہے۔ ۳۳۲ صفحات ہیں اور ۳۹۷ غزلیات ہیں۔

چار نعت شریف۔ ایک اپنے بیٹے کا سہرا، ناسخ، اسیر، احمد، منیر، اور بشیر کی غزلوں پر تضمین ہیں، دو خمسے حضرت علیؓ کی شان میں ہیں۔ قدسی اور خسرو کی نعت پر بھی خمسے کہے ہیں۔ حضرت غوث پاکؒ پر بھی ایک نظم ہے۔ تقریظ کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ بوجہ الم مفارقت امیر احمد خاں مرحوم کے نام اس دیوان کا گلشنِ خزاں رکھا اور خان صاحب مرحوم یہ دیوان اپنی حیات میں تصنیف فرما گئے تھے۔ تقریظ کے بعد قطعات تاریخ دیئے گئے ہیں۔ باپ نے قطعہ تاریخ کہا۔

ہائے با چشم خوں فشاں افسوس
اے وبا تجھ پہ آسماں ٹوٹے
تونے میٹا مرا نشاں افسوس

مجھ پہ کیا عشرۂ محرم تھا
چھوٹے دس دن میں دس جواں افسوس
کیا ہوا وہ امیر باتوقیر
میرا عاشق ، مزاج داں افسوس
بیست و نہ سال رہ کے میرے پاس
چھٹ گیا میرا نوجواں افسوس
بوستانِ امیر اے احمد
ہوگیا گلشنِ خزاں افسوس

۱۳۰۷ھ

قطعات وصلؔ

ہزار حیف عزیزی امیر احمد خاں
بہشت دار فنارا بہ قبر کرد آرام
نظیر خویش تھی داشت درہمہ اوصاف
بہ حلم و دانش و مہرو وفا و لطفِ عام
چہ خواست وصل حزیں بہر یادگارن خلق
کہ سال فوت نماند دعائیہ ارقام
نمود از سرِ دانش و حسن فکر رقم
بہشت باد نصیب امیر نیک انجام

۱۳۰۴ھ

امیؔر شاعر نادر بیاں کا
چھپا دیواں کہ میر اس کی دوا دیں
سواد خط ہے اشکِ زلفِ خوباں
بیاضِ سطر جوئے شیر شیریں
یہ مجموعہ ہے وہ گلدستہ کہ جس سے
دماغ نکتہ سنجاں عطر آگیں
سنینِ ختم دیواں وصل لکھو
ہوا ہے طبع گل زار مضامیں

نثار احمد خاں نثار ولد محمد احمد برادر خورد امیر احمد خاں امیؔر کا قطعۂ تاریخ ملاحظہ کریں۔

ہائے چن چن کے نوجوانوں کو
مارتا ہے یہ چرخ سفلہ و پیر
تھے اخئِ معظم ایک مرے
شاعری میں نہ کوئی جن کا نظیر
نام ان کا امیر احمد خاں
وہ گئے خلد میں ہوا دل گیر
حضرت والا مقدس کو
رنج ان کے فراق کا ہے کثیر
سر بد خواہ قطع کرکے تو لکھ
چھپ گیا گلشنِ خزانِ امیر
۱۳۰۷ھ

منقبت میں بھی ایک حادثۂ امیر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بوعلی صاحب دہائی ہے، دہائی آپ کی
میں وبا کے ہاتھ سے مولا مرے لوٹا گیا

اسی طرح اپنا دیوان چھپوانے کے بارے میں محمد احمد خاں احمد نے جو وجہ بیان کی وہ یہ ہے۔

تھا مجھے منظور چھپواؤں میں دیوانِ امیر
ساتھ اس کے یہ بھی چھپ جانے میں شامل ہوگیا
مجھ کو اس دیواں کے چھپنے کی ضرورت تھی نہ کچھ
اس کے صدقے میں اسے بھی رتبہ حاصل ہوگیا

احمد کے دیوان کا نام مخزن آلام بھی اسی وجہ سے پڑا کہ امیر کے دیوان کے صدقے میں چھپنے والے دیوان کو رتبہ مخزنِ آلام سے ہی حاصل ہوگا۔

عبدالحمید خاں قندھاری

ولی کمال خاں عارف ادیب، لکھنؤ یونیورسٹی کے گولڈ میڈلسٹ تھے۔ انتھراپالوجی میں بھی ایم اے کیا تھا۔ عارف ادیب تخلص کرتے تھے۔ ناسخ پر اردو میں پی ایچ ڈی ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا تھا لیکن بعض اُلجھنوں کی وجہ سے جمع نہ کر سکے۔ عبدالحمید خاں فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں ایک ''مثنوی شمع معرفت'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ انھوں نے آموں پر تحقیق میں اپنا زیادہ وقت صرف کیا اور نئی نئی آموں کی قسمیں پیدا کیں۔ انھوں نے یہ معلوم کرلیا تھا کہ آم کی گٹھلی سے جو کلا پیدا ہوگا اور چاندنی رات میں پھوٹے گا اس درخت کے آم شیریں، خوش رنگ، خوش ذائقہ اور قدآور ہوں گے۔ چنانچہ راتوں کو گیس جلوا کر گٹھلیوں پر نشانات لگا کر

ان پودوں کو الگ لگا کر سیکڑوں اقسام پیدا کیے اور ان کے نام بھی رکھے۔ ایک آم کا نام اپنے نام پر حمید یہ رکھا، لاہوتیہ، الماس اور زمرد یہ چار چاند کے نام سے مشہور تھے۔ دوسرے مشہور آم جن کے انھوں نے نام رکھے۔ شہیدِ ناز، شیرِ حیات، شمس الاثمار، ثمر بہشت، الم عباس، دُر بہشت عسل المکرّ، مفرح القلوب، پرنس، شربتی رحمٰن نگر وغیرہ۔ آم کو انھوں نے کاروبار بھی بنایا۔ ۱۹۰۲ء میں انھوں نے قلم انبہ کی نرسری رحمٰن کھیڑا میں قائم کی۔ اس جگہ کا نام انھوں نے اپنے پیر شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے نام پر رحمٰن نگر رکھا تھا جو بگڑ کر رحمٰن کھیڑا ہو گیا، اس وقت مرکزی اور صوبائی سرکاروں کا پھلوں اور مٹی کی تحقیق کا بڑا مرکز ہے۔

ولی خاں عارف کہتے ہیں: عبدالحمید خان صاحب آف رحمٰن کھیڑا کو میں نے دیکھا ہے۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۱ء تک۔ میری پیدائش ۱۹۱۸ء کی ہے۔ یعنی ۸ برس کی عمر سے میں ان کو جانتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ میرے والد قبلہ مکرم کے چبوترے پر آ جایا کرتے تھے، ہمیشہ اس وقت جب وہ رحمٰن کھیڑا سے چلتے تھے میرزا گنج کے لیے۔ ایک پالکی پر آتے تھے۔ دو کہاروں پر ان کی پالکی گردش کرتی تھی۔ دو کہار، ان کہاروں کے علاوہ چلتے تھے۔ ساتھ ساتھ آتے ہی وہ کہتے تھے، کہ جاؤ! اپنی ماں کو میری دُعا کہو، میں جاتا، اُن کی دُعا پہنچاتا تھا۔ وہ فوراً سلام کہلواتی تھیں۔ جھٹ سے اٹھ کر بہت بڑا خاص دان نکالتی تھیں، اس میں چار پان روانہ کرتی تھیں۔ وہ خاص دان بہت سی چیزوں سے بھرا ہوا چاندی کا ہوتا تھا، خاص طور سے اُن کے لیے نکالا جاتا تھا، میں خاصدان کے ساتھ گلاس میں پانی بھی لاتا تھا، وہ پانی بہت ہی کم پیتے تھے۔ خان صاحب مکرم کی حقیقی دو بیویوں کے سلسلے سے، وہ حقیقی بھانجی تھیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں جو اخلاق رائج تھا قدیم سرداروں کے وارثوں کے درمیان اس کا ایک زندہ نمونہ تھے، عبدالحمید خان صاحب قندھاری، فرزند نسل، شاہ عالم خیل، ان کے اجداد آئے تھے قندھار سے اور ان کے بزرگوں نے اقامت اختیار کر لی تھی ۱۷۶۳ء کے بعد خالص پور، ملیح آباد

میں۔ خالص پور سے اس نسل کا ایک آدمی علو پور آ گیا تھا اور پھر حبیب پور میں پھیل گیا تھا، پھر بیسویں صدی میں عبدالحمید خاں صاحب نے رحمٰن کھیڑا کو آباد کیا تھا، وہ بڑھتا رہا، یہاں تک کہ وہ بہت ہی نمایاں طور پر ترقی کرتا ہوا ایک ترقی پذیر گاؤں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ شاید اس ترقی میں ان کی روحانی برکت کو دخل ہے، جو ان کو مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے ملی تھی کیونکہ وہ ان کے مرید تھے۔

ان کے لباس میں سادگی تھی اور تمکنت بھی۔ وہ جب آتے تھے تو زیادہ تر کوئی حدیث کا ذکر کرتے تھے، اور پھر اس حدیث پر وقار کے ساتھ بولنے لگتے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ رسول کے منبر سے اترے ہیں اور اب اہلِ محفل کے پاس بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ باتیں اس طرح کرتے تھے، گویا دین کی خدمت کرنے چلے ہیں۔ ان کے اندر دین کی خدمت کا نیم فوجی طریقہ پوشیدہ تھا، لہٰذا انھوں نے خاکسار جماعت کے سردار کی خدمت کی تھی، برادرانہ وقار کے ساتھ، عنایت اللہ خان مشرقی، اُن کے یہاں ٹھہرتے تھے، یہ ثبوت ہے کہ وہ اسلام کی نیم فوجی خدمت کے تصور کو قبول کرتے تھے، (ایک حد تک) ۱۹۴۰ء کے بعد ہی ان کا انتقال ہوا۔ ماضی کی روایات کا ایک زندہ نمونہ، اس دور میں تھے۔ فقط ولی کمال عارف ادیب، دسمبر ۱۹۹۱ء ملیح آباد۔

کلیدِ جنت یا قلبی واردات

ایک دن مجھ سے کہا دل نے مرے	دیکھ غافل یہ نہ تھا لازم تجھے
چھوڑ کر حق کی رضا کے جملہ کام	بن گیا تو نفسِ سرکش کا غلام
اس سے تو بہتر جوانی تھی تری	کیا بلا پیری میں تجھ پر آ پڑی

کیسے کیسے نوجواں سن چل بسے
زیست کی امید کوئی کیا کرے

ایک آتا ہے یہاں، جاتے ہیں چار
غور کرکے دیکھ او غفلت شعار

یہ بڑھاپا اور جوانی کی امنگ
اس قدر غفلت ارے او پائے لنگ

سن کہ دل کا پند اے صاحب یقیں
میں نے دیکھیں غور سے حسنِ حسیں

اس میں دیکھیں یہ حدیثِ معتبر
یعنی یوں فرماتے ہیں خیر البشر

نام ہیں اللہ کے ننانوے
جو مسلماں حفظ اب سب کو کرے

جنتی ہونے میں اس کے شک نہیں
بخش دے گا اُس کو رب العالمیں

اور فرماتے ہیں یوں علمائے دیں
ہے مرا ایمان اس پر بالیقیں

پہلے سمجھے معنی اسمائے حق
بعد تو حاصل عمل کا کر سبق

اس کے راوی معتبر ہیں نیک خو
متقی پرہیز گار و راست گو

ترمذی، مسلم، بخاری، اے جواں
نسائی و ابن ماجہ خوش بیاں

متفق جمہور ہے جب ان پہ یار
ہے انہی کے قول پر دارومدار

پھر کہا دل نے مرے تو عزم کر
اے حمید اسمائے حق کو نظم کر

اور تو کر ورد اس کو صبح و شام
تا بنے یہ نفسِ سرکش کی لگام

ہاں مگر ہے شرط عامل کے لیے
جان کر معنی عمل اس پر کرے

ورنہ طوطے کی طرح رٹنا فضول
یاد رکھ اے مردِ حق اس کو نہ بھول

سن کے یہ دل میں مرے آیا خیال
اس پہ عامل ہو سکوں، یہ ہے محال

پر کہا ہمت نے اے مردِ خدا
ہے یہ مومن کے لیے غیرت کی جا

پست ہمت تو نہ ہو اے میرے یار
عاقبت جویند یا بندہ شمار

مشورہ یہ دل نے جو مجھ کو دیا — بڑھ گئی ہمت، ہوا فضلِ خدا
میں جو کہتا ہوں تو کر اس کو یقیں — گو کہ اس کہنے کے میں قابل نہیں
روسیہ ہوں اور بد کردار ہوں — ہاں مگر اس کے لیے تیار ہوں
نظم کرکے شوق سے اسماء حق — پیش کرتا ہوں مبارک ہے سبق
مولوی نے مثنوی میں ہے لکھا — کر یقیں تو اس کو اے مردِ خدا
نام حق چو می رود اندر دہاں — نے پلیدی ماندوئے آں وہاں
جب ہوا زائل پلیدی کا اثر — پھر رہی پاکی یقیں تو اس کو کر
اللہ اللہ جس کے دل میں بس گیا — وہ دلِ مردہ وہیں زندہ ہوا
اللہ اللہ کی شرابِ ناب سے — ساغرِ دل جو کوئی اپنا ہے بھرے
اور پی جائے اسے بے وخوف بیم — مست ہوجائے گا وہ مردِ سلیم
اللہ اللہ کیا ہی میٹھا نام ہے — جس زباں پر ہو وہ شیریں کام ہے
اللہ اللہ نے کیا جس دل میں گھر — وہ خذف ریزہ ہوا دم میں گہر
اللہ اللہ کا ہوا جس دل پہ داغ — اس اندھیرے گھر میں ہے روشن چراغ
اے میرے اللہ ارماں ہے مجھے — دل میں تو رحمٰن میرے بس رہے
یا رحیم وملک و قدوس تو — تیری پاکی مشتہر ہے چار سو
تو سلام اور تیرا مومن نام ہے — تو مہیمن، صاحب اکرام ہے
یا عزیز و تیری عزت کے نثار — لے خبر ذلت میں ہوں زار و نزار
نام ہے جرار و متکبر تیرا — خالق و باری، مصور خلق کا
تو تو ہے غفار و قہار و وہاب — تیرا ہمسر ہو سکے یہ کس کی تاب
ہے تو ہی رزاق و فتاح و علیم — قابض و باسط ہے بے مثل و سہیم

نام تیرے یا سمیع و یا بصیر
تو حکم اور عدل ہے اے دستگیر

حافظ و رافع معز و یا مذِل
ماسوا کے عشق سے تو پھیر دل

یا لطیف و یا غفور و یا شکور
بالیقیں ہر شے میں ہے تیرا ظہور

یا علی و یا علیم و یا عظیم
نیک و بد میں ہے ترا لطفِ عمیم

نام ہیں تیرے غنی و یا کبیر
شاہ تو سب ہیں ترے در کے فقیر

یا حسیب و یا جلیلِ دو جہاں
یا حفیظ و یا مقیط و قوت جاں

یا کریما تیری بخشش عام ہے
کب مطیع و منحرف ناکام ہے

یا حکیم و یا ودود و یا مجید
ہے تو ہی یا باعث و تو ہی شہید

ہے نگہباں خلق کا تو یارقیب
ہر مرض کا ہے تو ہی شافی طبیب

ہے تو ہی حق یا وکیل و یا قوی
نام تیرے یا متین و یا ولی

یا حمید و محصی و مبدی ہے تو
زرد رو دنیا میں ہوکر سرخ رو

تو معید اور تو ہی محی و روح کا
تو ہی میّت و حی و قیوم اے خدا

واجد و ماجد ہے، واحد اور احد
ہے صمد قادر ازل سے تا ابد

مقتدر ہے تو مقدم سب سے ہے
اور موخر ہے تو ہی ہر چیز سے

اوّل و آخر تو ہی ہے اے خدا
ظاہر و باطن میں ہے جلوہ ترا

نام ہے والی و متعالی تیرا
ہے تو ہی یا برّ و تواب اے خدا

منتقم ہے تو عوض مجھ سے نہ لے
یا عفو تو کل خطائیں بخش دے

یا رؤف و مہربان دو جہاں
چھوڑ کر در کو ترے جاؤں کہاں

تو ہی مالک اور تو ہی ذوالجلال
اے مع الاکرام گرتا ہوں سنبھال

مقسط و جامع، غنی تو ہے ضرور
مغنی و مانع نہ ہو تو دل سے دور

یا قہار و نافع و یا نور جاں ہے تو ہی ہادی بدیع دو جہاں

باقع و معانی رشید و یا صبور تیرا بندہ ہے حمید پر قصور

اے رحیم وائے کریم ذالنوال رحم کی امید پر یہ خستہ حال

ہاتھ اٹھاتا ہے دعا کے واسطے جو سبق تو نے دیا اے رب مرے

اے دعا آموز صدقے تیرے جاؤں درد دکھ تیرے سوا کس کو سناؤں

حق نہ تھا میرا کوئی رتی متیں نعمتیں کیا کیا عنایت تو نے کیں

میں رہا کفر و خطا میں مبتلا اور تو کرتا رہا رحم و عطا

فسق کے دریا میں ڈوبا ہائے ہائے جز ترے ہے کون جو مجھ کو بچائے

آگ ایسی حرص کی روشن ہوئی جس سے کھیتی عقل کی سب جل گئی

نفس کی ہے اب چڑھائی اے خدا تو بچا، تیری دہائی اے خدا

باؤلا مجھ کو بنایا نفس نے روزِ بد کیسا دکھایا نفس نے

تھے جوارح جس قدر وہ سب کے سب نفس کے قابو میں ہیں اے میرے رب

ہاں فقط اک دل ہے جس میں گاہ گاہ یاد آجاتی ہے تیری اے اللہ

ہائے دھوکے میں کٹی عمرِ عزیز نیک و بد کی کچھ نہ کی میں نے تمیز

مخلصی کی فکر اب میں کیا کروں در پئے آزار ہے یہ نفسِ دوں

اس کے شر سے تو بچا پروردگار تیری رحمت اور عنایت کے نثار

نیک ہوں یا بد، ترا بندہ ہوں میں عاجز و مسکین پر گندہ ہوں میں

نیک لائیں گے وسیلہ زہد کا میں رہا کفر و خطا میں مبتلا

گمرہی پر کر نہ تو میری نظر رحم کر، رحم اے خدائے داد گر

ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی

بڑے خوبرو، خوش اخلاق، حاضر جواب، جادو بیان، داستان گو، لطیفہ باز، عاشق مزاج، شوخی وطراری اور خوش دماغی میں اپنا آپ جواب۔ نہایت ذہین، شعروادب کے دلدادہ، جوش ملیح آبادی کے بہنوئی، یادوں کی برات میں ابرار حسن خاں کے ذکر میں جوش نے یہ رباعی تحریر کی ہے۔

یاں چھپی دھوپ ہے گلابی سایا　　　رہتا ہے، سحاب ابدیت چھایا
جوش آؤ منتظر ہے بزم ارواح　　　آیا، یاراں رفتہ، آیا آیا

ابرار حسن خاں کے والد کا انتقال بچپن میں ہو گیا لہٰذا قرابت داری بسبب بشیر احمد خاں نے اپنے بیٹوں کی طرح پرورش کی۔ جوش صاحب نے اپنی بے راہ روی کی ساری ذمہ داری اثر ملیح آبادی کے سر تھوپ دی ہے۔ لکھنؤ میں جب ابرار حسن خاں رہتے تھے تو اکثر سویرے غزلیں کہا کرتے تھے اکثر بہ آواز بلند صبح کو یہ غزلیں گاتے تھے مثال کے طور پر......ع

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد

یا

محبت میں تری ہم سے ہر آں اہلِ وطن بگڑا

ابرار حسن خاں کو سنی ہوئی کہانیاں اور خود ساختہ کہانیاں سنانے میں بڑا ملکہ تھا۔ وہ جادو بیانی اور ڈرامائی انداز میں جب کہانیاں سناتے تو سننے والے محو ہو جاتے اور وقت کا بھی اندازہ نہ کر پاتے، یہاں تک کہ پانچ چھ گھنٹے تک لوگ عالم محویت میں سنتے رہتے۔ جب بھی مسائل پر گفتگو شروع کرتے تو سننے والوں پر سناٹا چھا جاتا اور بڑے بڑے صاحبان علم وخطابت منہ دیکھتے رہ جاتے۔ کچھ دن کے لیے راجہ صاحب تانپارہ کے یہاں چلے گئے اور وہاں نوکری کر لی مگر جلد ہی مے نوشی نے وہاں سے بھی رخصت ہونے پر مجبور کر دیا۔

بلا کے ذہین تھے، بڑے شاعر تھے۔ حیدرآباد کی محفلوں میں جوش ملیح آبادی کے مقابلہ میں اپنا رنگ جما لیتے تھے۔ ان کا سارا کلام تلف ہوگیا۔ یہ چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔ ان کے بیٹے اظہار خود اچھے شاعر تھے مگر باپ کے کلام کو سنبھال کر نہ رکھ سکے۔ ان کی دو نظموں کی حیدرآباد میں بڑی دھوم تھی۔ ۔

لو آ ہی گئی لاڈلے بیٹے پہ جوانی

جو شاید جوش ملیح آبادی کے بیٹے سجاد کے لیے کہی تھی اور دوسری نظم ۔۔۔۔ ع

سیندھی نے تو اے یار عجب دھوم مچادی

ان کا ایک شعر لاجواب ہے ۔

زوالِ ہوش کے عالم میں بھی ہم نے یہ دیکھا ہے
خرد کے چند فتنے ذہن میں بیدار رہتے ہیں

ان کے کلام میں نظیر اکبرآبادی جیسی روانی تھی، ان کے چند اشعار جوان کے بیٹے خورشید حسن خاں نے کبھی سنائے تھے میرے حافظہ میں پڑے ہیں۔

گل آخر، گلستاں آخر، یقین و اعتبار آخر
اب عہدِ زندگی آخر، بہارِ آخر، خمار آخر
وہاں اب ہوں جہاں ہر شے سے یہ آواز آتی ہے
جفائے ناتواں آخر، وفائے شرمسار آخر
کہاں تک ہمدمی کرتے، کہاں تک دل کو بہلاتے
یہ حالت ہے کہ گھبرانے لگے ہیں غم گسار آخر
مجھے عمرِ گریزاں اب پلٹ کر دیکھتی کیا ہے
شباب و شیب آخر گرمی برق و شررِ آخر

اثر ان کشتگانِ عشق کا اللہ والی ہے
کہاں تک ساتھ دیتی، بجھ گئی شمعِ مزار آخر

....

گلدستہ مناجات عرف وسیلۂ نجات

منشی عبدالرؤف خاں لطف ملیح آبادی

بڑی گڑھی کے رہنے والے تھے۔ بطور نمونہ ان کے یہ اشعار لکھے گئے۔

جو مانگنے کا طریقہ ہے اس طرح مانگو در کریم سے بندہ کو کیا نہیں ملتا

مولانا روم کی مناجات کا منظوم اقتباس

دن کو روشن نور سے اپنے کیا شام کو دی عنبریں زلفِ دوتا
نافِ آہو میں وہ خوں دوڑا دیا مشک جو حکمت سے تیری بن گیا
ہم کو لازم ہے کہ ہر ہر سانس پر شکر احساں میں کریں آنکھوں کو تر
بھیج کر اس کو عدم سے اے خدا اشرف المخلوق انساں کو کیا

میں ہمیشہ خوابِ غفلت میں رہا
تو نے پر میری حفاظت کی سدا

مفلسی

بتائیں ہم کہ اس دنیا میں ہم نے آ کے کیا دیکھا
قحط انسانیت کا اور محبت کا سدا دیکھا

جنازہ دردِ دل کا اور دیوالہ خُلق کا دیکھا
امیری اور غریبی کا تماشا خوب سا دیکھا

وبا افلاس کی ہوتی ہے اتنی خوفناک اے دل
کہ کوسوں بھاگتے پیاروں کو ہم نے جابجا دیکھا

تہی دستی پہ اک طرہ زمانہ کی نزاکت ہے
زمیں کو بھاگتے جس سے، اجل کو بھی خفا دیکھا

نہ وقعت ہے غریبوں کی، نہ عزت ہے غریبوں کی
نہ ان میں جان سمجھی جائے یہ کیا کبریا دیکھا

غریبوں کا خدا فریاد رس ہے، یہ سُنا تو ہے
مگر آہوں کو اپنی آج تک تو نارسا دیکھا

اُلٹ دیویں اگر شب گیر نالے تختِ کسریٰ کو
نہ حیرت کیجئے ایسا تو ہم نے بارہا دیکھا

متاعِ ظلم پر ڈاکہ پڑے جب دستِ قدرت کا
تو ہم سمجھیں کہ ہم نے آج حق کو حق نما دیکھا

یہ شانِ امتیازی نسلِ انساں میں پسِ دولت
مٹے گی پھر مٹے گی اس کا بیجا اور جا دیکھا

خدا کی مصلحت ہے، دیر میں لبریز ہوتا ہے
یہ ساغر ایسا چھلکے گا کہیں گے ہائے کیا دیکھا
ابھی بیخود ہیں ہاں رد عمل میں لطف آئے گا
کہیں گے چونک کر یہ خواب کیسا بد نما دیکھا

جلیل احمد خاں جلیل

گڑھی سنجر خاں کے رہنے والے تھے۔ کچھ دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ اپنے کو بادشاہ کہنے لگے تھے۔ بطور تاج شاہی مور کا پر اپنی ٹوپی پر لگاتے تھے۔ ان کے نمونہ کے یہ دو اشعار ملے ہیں۔۔

پی ہی لیتے ہیں کبھی جا کے جلیل احمد خاں
کیونکہ کچھ تاڑ کے ہیں پیڑ کیولہار کے پاس
نہیں ڈرنے کے کسی سے بھی جلیل احمد خاں
ان کے خود کے سے جو تلوار ہے تلوار کے پاس

مائل ملیح آبادی (شاعر ادیب، مورخ اور مجاہد آزادی)

مائل ملیح آبادی کے اجداد ۱۷۳۷ء میں افغانستان میں قندھار کے علاقہ سے ہندوستان آئے۔ دہلی، آگرہ اور وہاں سے اودھ کی راجدھانی فیض آباد میں اودھ سرکار کے مہمان کے طور پر رہنے لگے، اس لیے کہ ان کا خاندان وہاں کا حکمراں خاندان تھا۔ فیض آباد میں جس علاقہ میں رہے وہ علاقہ قندھاری بازار کہا جانے لگا، بعد کو لکھنؤ میں قندھاری بازار

کہلایا، اودھ میں ان کے اجداد میں نامور اور تاریخ ساز شخصیت عبدالرحمٰن خاں قندھاری کی ہے جنھوں نے شجاع الدولہ کی درخواست پر بکسر کی جنگ میں شرکت کی اور فاتح بکسر کے نام سے مشہور ہوئے، اس کے عوض شجاع الدولہ نے چودہ گاؤں قندھاریوں کو معافی میں دیئے جن میں کچھ گاؤں ملیح آباد میں تھے جس کا ہیڈکوارٹر خالص پور تھا۔

خالص پور ہی سے ملحق بختیار نگر میں ان کے پردادا جمیل خاں قیام پذیر ہو گئے۔ بختیار نگر میں ہی ۱۹۱۷ میں جمیل خاں کے پوتے عبدالقدیر خاں کے یہاں یہ فرزند جلیل عبدالواحد خاں پیدا ہوا۔ انھوں نے پہلے اپنا قلمی نام سوز رکھا۔ بعد کو مائل ملیح آبادی کے نام سے دنیائے علم وادب میں مشہور ہوئے۔

مائل ملیح آبادی شاعر، ادیب، مورخ، سیاسی مفکر اور مجاہد آزادی تھے، انھوں نے اسلام کی تاریخ اور قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور شہد کی مکھی کی طرح ان پھولوں سے نکلنے والے رس کو صفحات پر بکھیر کر اپنے قاری کے لیے فیض رساں بنانے کا کام کیا تھا۔ مائل ملیح آبادی نے ہندوستان کی قدیم تاریخ کے مختلف گوشوں پر بحث بھی کی، واقعات کو مورخانہ انداز سے لکھا اور آخر میں ہر دور کا جائزہ بھی لیا۔

تحریک آزادی سے متعلق چند باتیں جو کتابوں میں نہیں ملتیں۔ ان کی وفات سے تین سال پہلے کی بات ہے۔ میں لکھنؤ میں رہتا ہوں، لیکن ملیح آباد تو آنا جانا رہتا ہے۔ جولائی کی ۵؍ تاریخ ۲۰۰۰ء کو مرحوم سے ملنے گیا تو ان سے کچھ پرانی باتیں پوچھنے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ آپ حیدرآباد بھی ایک زمانہ میں گئے تھے۔ تو بتانے لگے ۱۹۳۴ء کے آس پاس کا واقعہ ہے کہ امین آباد کے جھنڈے والے پارک میں ترنگا جھنڈا لگانے کی دوڑ ہوتی تھی۔ پانچ بجے شام سے نوجوان جمع ہونے لگتے تھے۔ انگریز سپاہی گھوڑوں پر ٹہلا کرتے تھے کہ جھنڈا نہ لگنے پائے۔

اچانک ایک نوجوان پارک کی ریلنگ سے چھلانگ لگا کر اندر داخل ہوا اور جھنڈا اونچا رہے ہمارا کا نعرہ لگایا۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند ہوا اور پولیس کی دوڑ اور مار دھاڑ شروع ہوگئی۔ جس دن کی یہ بات ہے میں اور عبدالرشید مرحوم پارک کے ارد گرد ٹہل رہے تھے۔ بھگدڑ میں عبدالرشید نے ایک دیمار سارجنٹ کے گھوڑے کے سموں پر مارا۔ اس کی آواز سے گھوڑا بدکا تو سارجنٹ زمین پر گر پڑا۔ ہم لوگ ممتاز کالج والی گلی میں بھاگے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ ایک زینہ کا دروازہ کھلا دیکھ کر اس پر چڑھے تو ایک خاتون نے کہا۔ کہاں گھسے چلے آرہے ہو۔

میں نے کہا۔۔ بہن پولیس پیچھا کر رہی ہے، ہم لوگوں کو مار ڈالے گی، اندر آجانے دیں۔ نیک دل خاتون نے اندر بلا کر ایک طرف اشارہ کیا جہاں بہت سی لکڑیاں لگی تھیں، ان لکڑیوں کے بیچ کچھ جگہ تھی وہیں ہم دونوں بیٹھ گئے۔ گیارہ بجے رات کو گھر والوں نے کہا۔ اب سناٹا ہے تم لوگ نکل جاؤ۔ ہم لوگ شکریہ ادا کر کے نیچے اترے اور رستی بٹان والی گلیوں اور مولوی گنج سے نکل کر رکاب گنج جا پہنچے۔ عبدالرشید اپنے گھر نہرو کراس کی طرف چلے گئے۔ میں ماموں بھانجے کی قبر کے پاس اپنے ماموں ابو سعید خاں ایڈوکیٹ کے یہاں چلا گیا۔ دیر سے آنے پر پوچھ گچھ شروع کی اور صبح تڑکے ملیح آباد روانہ کر دیا۔ چار دن بعد عبدالرشید پکڑ گئے اور ان کے دونوں ہاتھ توڑ دیئے گئے۔ میرے والد نے مجھے حیدر آباد بھیج دیا۔ جہاں میرے چچا فوج میں اعلیٰ عہدہ پر تھے۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۶ء تک وہاں رہا۔ پولیس میں ملازمت مل گئی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں چھٹی لے کر آیا۔ شمشاد حسین صاحب جو سندیلہ کے رہنے والے تھے، پولیس کے بڑے افسر تھے انھوں نے روکا اور ان سے بڑے افسر ایک کشمیری تھے جن کا نام یاد نہیں رہا، وہ بھی منع کرتے رہے اور کہنے لگے وزیر صاحب نے جو شاہجہاں پور کے ہیں، کہا ہے کہ ملیح آباد کے کسی آدمی کو مئی اور جون میں چھٹی نہ دینا، ورنہ کوئل کی کو اور آم کی لذّت اسے واپس نہ آنے دے گی۔ خود مائل ہی صاحب کا کہنا ہے۔

چھوڑ کر باغِ جناں وادی کشمیر نہ جا　　　آم کے باغ میں آ، آم کے باغ میں آ

۱۹۳۷ء میں میرے ماموں مولانا ملیح آبادی کلکتہ سے ملیح آباد آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ کلکتہ چلا گیا۔

کلکتہ کی فضا سیاسی طور پر گرم اور ادبی طور پر بڑی سازگار تھی۔ مولانا ملیح آبادی نے مصر میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ اس زمانہ کے عظیم اسلامی اسکالر، صحافی اور استاد علامہ رشید رضا مصری ایڈیٹر المنار ان کے استاد تھے۔ مصر سے واپسی ۱۹۱۹ء میں ہوئی کلکتہ میں مولانا آزاد سے رشتہ رُفاقت وصحافت جڑا تو ۳۸ سال بعد موت نے الگ کیا۔ مولانا آزاد کی اڑتیس سالہ رفاقت پر ''ذکر آزاد'' نام کی ان کی کتاب حیرت انگیز انکشافات کی حامل ہے۔ مولانا ملیح آبادی نے الہلال والبلاغ میں قلمی تعاون کے ساتھ اپنا ''اخبار ہند'' کے نام سے نکالا اور اُردو صحافت کو نیا موڑ دیا، عوام کی بات عوام کی زبان میں لکھنا شروع کیا، اس طرح جدید اُردو صحافت کی بنیاد رکھ دی۔

ہند کا دفتر ساگر دت لین کلکتہ میں تھا جہاں انقلاب پسندوں کا جمگھٹا رہتا تھا، جہاں مائل ملیح آبادی کو کمیونسٹ رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ رات کو کمیونسٹ رہنما یہاں جمع ہوتے جن میں مظفر احمد بنگال میں کمیونسٹ پارٹی کے بانی، سومناتھ لہری بنکم بابو کسان سبھا کے رہنما، محمد اسماعیل ٹرام وے مزدوروں کے لیڈر عبدالرزاق خاں بنگالی کے نام بتا کر مائل ملیح آبادی نے کہا اور لوگوں کے نام یاد نہیں رہے پھر تھوڑی دیر فضا میں کچھ دیکھنے کے بعد بولے۔ سومناتھ لہری پڑھے لکھے آدمی تھے۔ بڑے محنتی اور بنگلہ شرافت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ پارٹی کے لیے بڑے مخلص تھے۔

مولانا ملیح آبادی جو ترجمہ کے فن کے ماہر تھے کمیونسٹ پارٹی کے مینی فیسٹو کا اُردو ترجمہ شائع کر چکے تھے جو اوّلین اُردو ترجمہ تھا تو مائل ملیح آبادی نے ''ہمارا لینن'' نام کی کتاب یہیں لکھ کر شائع کرادی تھی۔

مائل ملیح آبادی نے نیا انکشاف کیا کہ مصطفیٰ کمال کی موت کے بعد مولانا ملیح آبادی

نے ''کمالی فوج'' بنائی تھی جو چار سال تک چلی پھر ختم ہوگئی، اس لیے کہ وہ سڑک کے آدمی نہیں تھے۔ عوامی تحریکوں سے دور رہتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۳۹ء کا شاید آخری زمانہ تھا کہ ماموں نے پشاور جانے کی تیاری کا حکم دیا اور کہا کہ یہ مصر کے میرے ایک دوست العمری ہیں، انھیں پشاور پہنچا کر چلے آؤ اور یہ خط میرے دوست عبدالقیوم خاں کو دینا۔ میں تاریخ مقررہ پر مولانا العمری کے ساتھ پشاور گیا بھی اور لوٹ بھی آیا۔ واپسی پر کلکتہ میں سبھاش چندر بوس کے غائب ہونے کی خبر عام ہوچکی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ناول لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ شرت چندر چٹرجی کا ایک ناول ''پتھر داوی'' یعنی ''راستہ کے دعویدار'' کے نام سے چھپا جو انگریز سرکار نے ضبط کرلیا۔ کلکتہ کے کالج اسکوائر کے میدان میں چار بجے شام کو ایک بنگالی نوجوان سائیکل پر آتا اور آواز نکالتا۔ پتھر داوی۔ لوگ کاغذ کی پڑیوں میں اس کی قیمت لیے کھڑے رہتے، کتاب لیتے اور جھولے میں پڑیاں ڈالتے، پولیس بھی آجاتی اور بھیڑ کو مارتی پیٹتی۔ آگرہ کے دو نوجوان ساتھی تھے جو بنگالی جانتے تھے ان سے کہا۔ پتھر داوی کے کچھ حصے ہندی میں کرکے سناؤ۔ انھیں سن کر شوق ہوا کہ مجھے بھی لکھنا چاہیے۔ لہٰذا اسی کو سامنے رکھ کر پہلا ناول کلکتہ میں ''آبرو'' نام کا لکھا۔ پھر دیوداس کو دیکھ کر ''نیا آدمی'' لکھا۔ پھر برہمن کی بیٹی۔ بڑی دیدی، ادھوری بات۔

مولانا ملیح آبادی اور مائل ملیح آبادی دونوں کا خیال تھا کہ کمیونزم اقتصادی اصلاحات کرسکتا ہے اسی لیے اس کے ہمنوا ہوگئے تھے۔ سوشلزم کا خیال تھا کہ کانگریس عوام کو بے وقوف بنا کر انگریز سے مصالحت کرنا چاہتی ہے۔ سوشلزم پچھلے قرضوں کی معافی، لگان کا فوری خاتمہ۔ گاؤں والے خود اپنی پنچایت بنا کر ریکارڈ کرا دیں تاکہ گاؤں کے لوگ فتنہ و فساد سے محفوظ رہیں۔ بڑے کسانوں پر ٹیکس کی رقم بڑھا دی جائے، چھوٹے کسانوں کو معاف کرا دی جائے، جیسے اصول نافذ کرنا چاہتا تھا۔ سوشلزم ان دونوں کا عقیدہ نہیں فوری ضرورت تھی۔

میں نے پوچھا۔ آزادی کے بعد آپ گھر کیوں بیٹھ رہے۔ کرب ناک لہجے میں بولے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے ہمسفر اتنا بدل جائیں گے اور تعصب، تنگ دلی کی دنیا میں کھو جائیں گے۔ اسی لیے میرا خیال ہے کہ کچھ دنوں تک مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی اقتصادی اور تعلیمی حالت بہتر بنانے پر توجہ دینا چاہیے، کمزور قوم کو طاقتور قوم کے ساتھ سیاست کے کھیل میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کانگریس کو چاپلوسی کرنے والے مسلم لیگ کے مسلمان مل گئے ہیں جو ملّت کی فلاح و بہبود سے غافل ہو کر اپنی دنیا بنانے میں لگے ہیں۔ برابری کا دم بھرنے والے ان کے کام کے نہیں رہے۔

کلکتہ کی ادبی فضا میں ٹیگور کے نغمات اور نذرالاسلام کی آگ لگانے والی نظمیں انقلاب کے متوالوں کے سینوں کو گرما رہی تھیں۔ ایسے ماحول میں ہمارا شاعر خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ مائل ملیح آبادی کی شاعری سے پہلے مولانا العمری کے اندر سبھاش چندر بوس کو تلاش کرتے چلیں۔ مائل ملیح آبادی نے بتایا کہ ۱۹۵۱ء میں دلّی میں انھوں نے مولانا ملیح آبادی سے پوچھا۔ ماموں وہ مولانا العمری زندہ ہیں یا مر گئے؟ ماموں نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔ وہ تو نام رکھ لیا تھا۔ اس مولوی کے اندر سبھاش چندر بوس تھے۔ آج فارورڈ بلاک کے لوگ اسے قبول نہ کریں تو انھیں بتانا ہوگا کہ پشاور سے افغانستان تک انھیں پہچاننے والا کون تھا؟ پھر ان مخلصین آزادی جنھوں نے اس واقعہ سے کوئی سیاسی فائدہ بھی نہیں اٹھایا اور نہ اس کی تشہیر کی، اپنے گھر کے اندر جھوٹ کیوں بولیں گے؟

علاّمہ مشرقی کے سبھاش بابو سے روابط کے بھی فارورڈ بلاک والے منکر ہوں گے لیکن ان تین لاکھ خاکساروں کی کلکتہ میں موجودگی اور نیتاجی کے جہاز کے حادثہ کے بعد ان کی روانگی کو کیا جھٹلا دیں گے۔ یہ خاکسار اس لیے وہاں پہنچے تھے تاکہ جب سبھاش بابو کلکتہ میں لینڈ کریں تو وہاں کا انتظام سنبھال لیں۔ آزاد ہند فوج کے کئی جنرل اس کے گواہ تھے۔

یہ بات بھی شاید کسی کو نا معلوم ہو کہ مائل سے پہلے وہ ''سوزؔ'' تخلص کرتے تھے۔ اپنے والد کے تیار کیے ہوئے ایک درخت کے تنے پر چاقو سے بڑے بڑے حروف میں انھوں نے ''سوزؔ'' گود دیا تھا جو بہت دنوں تک پڑھا جاتا رہا۔ یہ بات میرے بڑے بھائی موجؔ ملیح آبادی نے بتائی جو مرحوم سے چند سال چھوٹے ہیں۔ بنکم بابو جو کسان سبھا کے بانی تھے، ان کی فرمائش پر ''کسان سبھا کا نعرہ'' نام کی نظم جو شاید پچیس سال پہلے میں نے ان سے سنی تھی جس کے دو بند حافظہ میں رہ گئے ہیں ۔

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں ۔۔۔ اندھیرے کے سینے کو دہلا رہی ہوں

لیے لال جھنڈا چلی آرہی ہوں

تلنگانہ و آندھرا میں پلی ہوں ۔۔۔ میں بنگال کی وادیوں سے چلی ہوں

میں یوپی کے باغوں کی ننھی کلی ہوں ۔۔۔ میں یوپی کو خوشبو سے مہکا رہی ہوں

میری راہ میں آئی تھی زار شاہی ۔۔۔ سنی ہوگی ہٹلر کی تم نے تباہی

مرے ہاتھ میں چیانگ کی کجکلاہی ۔۔۔ میں ظالم کو ہر سمت ٹھکرا رہی ہوں

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

وہ فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور اس میں مسلمانوں کی بے راہ روی سے غافل نہ تھے ۔

جو غلبۂ اسلام سے بیزار ملیں گے ۔۔۔ دشمن کی وزارت میں وہ غدار ملیں گے

میں آج نہتا ہوں تو للکار لو مجھ کو ۔۔۔ بچے مرے ہتھیاروں سے تیار ملیں گے

وطن کو خون کے دریا میں مت نہلاؤ جلاؤ دو ۔۔۔ مسلماں ہوگیا تم سے جو بیگانہ تو کیا ہوگا

حکمرانی کی لذت، کارواں کی قیادت اور اس حق کو وہ چھوڑنے کو کسی طرح تیار نہ تھے ۔

کارواں کے دل کی دھڑکن کو جو سمجھے گا وہی
راہرو ہوگا تو میرِ کارواں ہو جائے گا
آج والے بھی سمجھ لیں ہو وہ چاہے راہبر
کارواں سے کٹ کے گردِ کارواں ہو جائے گا
کیا کروں ہاتھ میں مدت سے قلم ہے لیکن
ذہن میں لذتِ شمشیر و سپر آج بھی ہے

....

کوئی ایسی بھی تو انجمن چاہیے	جس میں سب آئیں سر سے کفن باندھ کر
اک ذرا زحمتِ جان و تن چاہیے	حکمرانی کوئی مسئلہ تو نہیں
حکمرانی مرا حق ہے اسے چھوڑوں کیسے
عظمتیں آئیں تو آئیں مرے قدموں کے تلے
آبلے پاؤں میں، چہرہ پہ لہو، دل میں اُمنگ
جس کو اس حال میں چلنا ہو مرے ساتھ چلے

ادھر کچھ دنوں سے جب ملنے جاتا تو یہ دو شعر سناتے اور کہتے اب تو یہ حالت ہے۔

حملہ، شکار، جہدِ مسلسل، لہو کا کھیل	یہ کاروبار وقت تھا سب بند ہوگیا
مژدہ ہو اے کبوترو! یعنی بقیدِ عمر	شاہین آشیانہ میں پابند ہوگیا

پھر مرضیٔ مولا سے ہوا بھی ایسا ہی، یہ شاہین صفت مردِ مجاہد ۷ار جون بروز جمعہ بوقت صبح صادق واقعی آشیانہ میں پابند ہوگیا اور فرقہ پرستوں اور حاکمانِ وقت کو خاطر میں نہ لانے والی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ خدا کی رحمت ہو اُن پر۔

محمد عثمان خاں تپش ملیح آبادی

محمد عثمان خاں تپش ولد عبدالرب خاں۔ تپش کے نانا مولوی قدرت اللہ بیگ فارسی کے عظیم المرتبت شاعر تھے جنھوں ساڑھے چار ہزار اشعار غیر منقوط فارسی میں رسول اکرم ﷺ کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر شائع کرائے۔ تپش کے دادا عبدالحمید خاں قندھاری فارسی اور اردو کے شاعر تھے جن کا اردو کلام اس تذکرہ میں شامل ہے۔

آسمانِ زندگی کی عظمتِ دیرینہ ہم
ایک دھندلائی جبیں کا ہیں وہ آئینہ ہم

شب گزیدہ صبح کی حسرت زدہ آغوش ہم
اور گرد آلود اک نظارۂ خاموش ہم

کوئی احساس خوشی اور نہ غم خاموش ہیں
اپنی ہی تصویر کے مانند ہم خاموش ہیں

زندگی جو بزم کی صورت تھی اب سنسان ہے
دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گورستان ہے

فطرتاً حساس ہوکر بے نیازِ درد ہیں
اس طرح خاموش ہیں جیسے کہ آہِ سرد ہیں

تنگ ہوتا جا رہا ہے اب حصارِ زندگی
دوش پر لادے ہوئے تھے کاروبارِ زندگی

گلشنِ ہستی میں تھے کل پاسبانِ زندگی
زندگی اک باغ تھی، ہم باغبانِ زندگی

جو مسافر سوئے منزل تھے رواں، وہ ہم ہی تھے
جو تھے وجہ انقلاب آسماں، وہ ہم ہی تھے

تھے نشانِ منزلِ مقصد ہمارے نقشِ پا
دیکھ کر جن کو چلا جاتا تھا ہر اک قافلہ

کفر و باطل اپنے آگے گرد تھے، پامال تھے
ایک جیتی جاگتی تصویرِ استقلال تھے

ہر در و دیوارِ کہنہ سے نمایاں ہیں نشاں
داستاں دہرا رہی ہے خود ہماری داستاں

روح شرمندہ ہے اب دل شاد کر سکتے نہیں
باعثِ افسردگی فریاد کر سکتے نہیں

شورشِ بزمِ طرب کیا، حسن کی تصویر کیا
آج کی یہ زیست کیا اور زیست کی تنویر کیا

پست ہمت کے لیے ہنگامہ کیا، شمشیر کیا
خون ہی جب سرد ہو پھر نعرۂ تکبیر کیا

دوسروں کو خوابِ غفلت سے جگا سکتے نہیں
خود کو جب آئینۂ ایماں دکھا سکتے نہیں

ایک عبرت ہے زوال اپنا زمانے کے لیے
جیسے آئے تھے عروجِ زیست پر ویسے گئے

گر نہ آتا ہو یقیں تاریخ اٹھا کر دیکھیے
سامنے آئینۂ ماضی کو لا کر دیکھیے

رام اور لچھمن ابھی موجود ہیں تاریخ میں
کتنے اہلِ فن ابھی موجود ہیں تاریخ میں

شیخ سعدی، میر خسرو اور جامی و ولی
میر و سودا غالب انشاء و جرأت مصحفی

داغ سیماب و انیس و حسرت چکبست و شوق
ناسخ و مومن دبیر و حالی و اقبال و ذوق

وہ نظیر اکبر آبادی و آتش لکھنوی
اپنے اپنے وقت میں اک نقشِ روشن تھے سبھی

یہ ترا کردار دیتا ہے صدائیں بار بار
ہے یہ دنیا دارِ فانی، زندگی ناپائیدار

کہہ رہی ہے آج کاشی کی ادائے دلنشیں
اور ادھر خواجہ معین الدین چشتی کی زمیں

ٹوٹ جائے گا تمھارے عہدِ ماضی کا بھرم
بھول بیٹھو گے اگر اسلاف کے نقشِ قدم

شعلہ ہائے کم نگاہی کو بھلا سکتے ہو تم
حال کے ماحول کو جنت بنا سکتے ہو تم

وقت کی تاریکیوں کو پر ضیا کرتے چلو
راہِ ہستی پر وفا کی ابتدا کرتے چلو

کشتیِ امید طوفانوں میں کھینا شرط ہے
زندگی پر زندگی کو وار دینا شرط ہے

اب بھی تیور کہہ رہے ہیں آج کے انسان کے
آخری بادل ہیں ہم گذرے ہوئے طوفان کے

اپنے دامن میں ابھی صدہا گہر پوشیدہ ہیں
سیکڑوں اوصاف ہم میں وہ ہیں جو نادیدہ ہیں

میرا افسانۂ الفت کسی دن داستاں ہوگا
یقیناً رفتہ رفتہ ذوقِ نظارہ جواں ہوگا

خلوصِ دل یہ کہتا ہے محبت رنگ لائے گی
جہاں میری نظر ہوگی ترا جلوہ وہاں ہوگا

مرے اک اک لفظ میں پنہاں ہے حق کی داستاں
مری ہستی اہلِ باطل پر رہی بارِ گراں

میں بہارِ زندگی بن کر رہا ہر دور میں　　　　پھول برسائے ہیں میں نے گلستاں در گلستاں

عزم و استقلال کی جب ہم ادا ہو جائیں گے

اے تپش پھر زندگی سے آشنا ہو جائیں گے

محمد عصمت خان، عصمتؔ ملیح آبادی

معروف ادیب و شاعر عبدالواحد خاں مائلؔ ملیح آبادی کے فرزند، عصمتؔ ملیح آبادی ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو ملیح آباد کے موضع بختیار نگر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں حاصل کی، پھر ملیح آباد کے میڈل اسکول اور مہاتما گاندھی انٹر کالج میں زیرِ تعلیم رہے، لکھنؤ کرسچین کالج سے انٹر اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۸۲ء میں ''جوشؔ کی رومانی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' عنوان کے تحت پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ملازمت کی ابتدا ٹیچر کی حیثیت سے کی لیکن جلد ہی ودیانت ہندو ڈگری کالج، لکھنؤ یونی ورسٹی میں شعبۂ اُردو میں صدر شعبہ کی حیثیت سے تقرر ہو گیا اور وہیں ریڈر اور صدر شعبہ ہیں۔

ڈاکٹر عصمتؔ ملیح آبادی کو شاعری اور نثری ذوق و شوق وراثت میں ملا ہے، والدِ محترم مائلؔ ملیح آبادی کے علاوہ حضرت جوشؔ بھی ان کی والدہ کے حقیقی ماموں تھے، اس لیے عصمت کی شاعری پر اپنے بزرگوں کے اثرات ہیں۔ ڈاکٹر عصمتؔ ایک قلم کار کی حیثیت سے متعارف ہو چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات رومانی شاعری میں جوشؔ کی خدمات، انتخاب میر عبدالحیؔ تاباں، رنگِ تنقید، کتابِ جوشؔ، کلیاتِ غزنیاتِ جوشؔ اور کلیاتِ مراثی جوشؔ شایع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مختلف اداروں سے اعزازات کے علاوہ

حکومت اتر پردیش نے انھیں اردو اکادمی کا صدر بھی نامزد کیا تھا۔ شاعری برائے نمونہ:

اشک مہماں ہیں مسکرانے تک
ٹھہر جاؤ بہار آنے تک
ہم تمھیں بھول جائیں گے لیکن
یاد آؤ گے بھول جانے تک

....

ابھی تک اپنے ماضی کی روایت لے کے چلتے ہیں
کہ ہم گھر سے بزرگوں کی اجازت لے کے چلتے ہیں

....

کیسے اچھے لوگ ہمارے گاؤں میں تھے
ہم بچپن میں ٹھنڈی چھاؤں میں تھے
کتنے خوش رہتے تھے اپنی غربت میں
ہاتھ میں بستہ، ٹوٹے چپل پاؤں میں تھے

....

اپنے گھر آنگن میں اجالے رکھتے ہیں
ٹوٹ چکے ہیں خود کو سنبھالے رکھتے ہیں
ہم کہ نئی تہذیب سے ناواقف ٹھہرے
بوڑھے باپ کے منہ میں نوالے رکھتے ہیں

....

لوٗ کی شدّت میں احساسِ سکوں رہتا ہے
گھر کے آنگن میں ابھی ایک شجر باقی ہے

حرفِ ناتمام

ابھی ملیح آباد کے سلسلے میں بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ یہ صرف وہاں کے پٹھانوں سے متعلق کچھ باتیں لکھ دی ہیں، اس کے بعد جب عمومی تاریخ شروع ہوگی تو دوسرے بے شمار جواہر پارے قارئین کے سامنے آئیں گے۔ اوپر شعر وادبیات سے ہٹ کر جہاں چند واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، ان ہی اہم واقعات میں ایک واقعہ مزید بیان کرر ہا ہوں۔

غالباً ۱۹۴۵ء میں ملیح آباد پر ایک چھوٹا پولیس آپریشن ہوا۔ چار بجے صبح کو جب سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے تو پٹھانوں کے گھروں میں پولیس یا نیم فوجی دستے داخل ہو گئے۔ سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔

آفتاب احمد خاں کو بھی سوتے میں ایک انگریز سارجنٹ نے نوچا۔ ان کی آنکھ کھلی تو سامنے ایک اجنبی چہرہ دکھائی دیا۔ انھوں نے فوراً بستر سے نکل کر اس کے دو چار تھپڑ مار دیئے۔ چھوٹے بھائی نے پکارا۔ بھائی جان پولیس کے لوگ ہیں۔ انھوں نے کہا۔ پولیس کو چوروں کی طرح گھسنے کا حق کس نے دیا۔ دوسرے سپاہی نے ان کے سنگین ماری جو پیٹ کے اوپری حصے کو کپڑے پھاڑ کر زخمی کر گئی۔ مگر انگریز سارجنٹ نے حکم دیا اسے گرفتار کرلو ہم اس کا معاملہ بعد کو دیکھے گا۔ اس نے کہا۔ خانصاحب تم نے ہمارے تھپڑ مارا۔

خان صاحب نے مختصر جواب دیا۔ہاں ضرور مارا۔
سارجنٹ نے پوچھا۔کیوں مارا؟
خان صاحب نے جواب دیا۔تم ہمارے گھر میں بلا پکارے چوروں کی طرح گھسا۔ اس لیے ہم نے مارا۔
سارجنٹ۔ول تم اچھا، خوبصورت اور سچا پٹھان ہے۔ہم تم کو سلام کرتا ہے اور تمھیں چھوڑتا ہے۔اور پھر ہاتھ ملا کر کہا۔اب تم ہمارا دوست ہے۔ بولو دوستی منظور۔خان صاحب نے کہا۔ہم ہمیشہ تمھاری دوستی کی قدر کریں گے۔
یہ تھے وہ لوگ جواب دکھائی نہیں دیتے اور ہم سب کہا کرتے ہیں۔ع
پھرتا ہے فلک برسوں تب..........

نام	:	پروفیسر خان محمد عاطف
پیدائش	:	۱۹۴۲ء
تعلیم	:	ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی (فارسی)
		۱۹۷۴ میں شعبۂ فارسی میں تقرر
		لکچرار، ریڈر، اور پروفیسر
		۱۹۷۷ء میں بہرائچ سے ممبر یوپی اسمبلی
کتابیں	:	۱۔ تعارف زبان فارسی تازہ (جدید)
		۲۔ تاریخ زبان وادبیات فارسی
		۳۔ فارسی شاعری میں طنز ومزاح
		۴۔ پٹھان شاعرات کا تذکرہ
		۵۔ مختصر تاریخ ادبیات فارسی
		(ترجمہ انگریزی لیوی)
مضامین	:	فارسی ادبیات، اردو شعر وادب، اور مذہبی وسیاسی موضوعات پر سو سے زیادہ۔
زیر نظر کتاب	:	اردو شاعری میں افغانوں کی گل کاریاں
زیر طباعت	:	مکتبہائے ادبی یعنی فارسی کے ادبی اسکول
		نظام الملک آصف جاہ بانی سلطنت نظام
		حیات اور شاعری
اوراب	:	قائد خاکسار تحریک الہندی

معصومہ اینڈ کمپنی کی مطبوعات

تذکرہ	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	350/-
حدیث القرآن	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	150/-
مولوی کا غلط مذہب	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	200/-
اشارات	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	125/-
قولِ فیصل	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	100/-
رسولِ صادقؐ	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	100/-
خطابِ مصر	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	100/-
اسلام کی عسکری زندگی	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	20/-
انسانی مسئلہ	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	50/-
دہ الباب	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	200/-
سیاہ کار لیڈر	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	200/-
Qura'n and Evolution	Allama Al-Mashriqi	100/-
God Man and Universe	Allama Al-Mashriqi	100/-
The Man's Destiny	Allama Al-Mashriqi	200/-
Basic Duas for School Children		80/-
مقالات (دوجلدیں)	علاّمہ عنایت اللہ خان المشرقی	600/-
ہندوستان کی تعمیر و ترقی	مولانا عبیداللہ کوٹی ندوی	40/-
ہادیٔ نوعِ بشر ﷺ	پروفیسر خان عاطف خان	60/-
سیاست میں رذالت: بابری مسجد کی شہادت	پروفیسر خان عاطف خان	200/-
اردو شاعری میں افغانوں کی گل کاریاں	پروفیسر خان عاطف خان	600/-
خلیفۃ الراشدین رضی اللہ عنہا	پروفیسر خان عاطف خان	100/-
کتوں کی داستانیں	اشرف سیوہاروی	50/-
بندر کی کہانی	اشرف سیوہاروی	40/-
دلّی کے ٹھگ	اشرف سیوہاروی	200/-